

# غالبیات

کے چند فراموش شدہ گوشے

ڈاکٹر اکبر حیدری

ادارۂ یادگار غالب کراچی



**PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani**

**Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081**



پی ڈی ایف (PDF) کتب حاصل کرنے اور واٹس ایپ گروپ «کتاب کارنر»  
میں شمولیت کے لیے مندرجہ بالا نمبرز کے واٹس ایپ پہ رابطہ کیجیے۔ شکریہ

# غالبیات

کے چند فراموش شدہ گوشے

ڈاکٹر اکبر حیدری

ادارۂ یادگارِ غالب  
کراچی

سلسلہ مطبوعات ادارہ یادگار غالب

شمار : ۳۳

طبع اول	:	۲۰۰۲ء
صفحات	:	۲۸۰
طالع	:	احمد برادرز، ناظم آباد، کراچی
تعداد	:	پانچ سو
قیمت	:	دو سو روپے



فنی تدوین رفیق احمد نقشب



ادارہ یادگار غالب

پوسٹ بکس نمبر: ۲۲۶۸

ناظم آباد، کراچی ۷۳۶۰۰



غالب لائبریری

دوسری چورنگی، ناظم آباد

کراچی ۷۳۶۰۰

# فہرست

۵	دیباچہ
۷	غالب اور شاہان اودھ
۳۶	غالب اور حسام الدین حیدر خان
۷۵	غالب، سالار جنگ اور ڈکا
۹۵	غالب اور مشتق میر محمد عباس
۱۳۳	دیوان غالب نسخہ حمید یہ
	مخلوط دیوان غالب سری نگر
۱۵۱	اور مطبوعہ نسخے بحیات غالب
۱۷۶	غالب کی تاریخ گوئی
۲۰۱	غالب کے آخری ایام
۲۲۱	غالب کا مزار
۲۳۵	غالب کی اولین شرح - وثوق صراحت
	ناصر علی سرہندی اور مرزا
۲۴۵	غالب کے متحد المعنائین اشعار
۲۵۱	غالب کا ایک معترض. مرزا یاس بگاندہ



## حرفِ اوّل

اردو کے کتبِ تحقیق میں ڈاکٹر اکبر حیدریؒ کا کام معیار اور مقدار کے اعتبار سے مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ گزشتہ چار دہائیوں سے جس طرح اردو زبان و ادب کے مختلف گوشوں پر دلو تحقیق دے رہے ہیں، اس کی مثالیں کم کم ملتی ہیں۔ ان کی شائع شدہ تصنیفات و مراثی کی تعداد ساٹھ سے زیادہ ہے اور علمی مقالات پانچ سو کے قریب ہیں۔ ان تصنیفات و مقالات میں جہاں ایک طرف قدیم مصنفین اور سویریں صدی کے بعض اہم کتبِ قلم کی سوانحی تفصیلات فراہم کی گئی ہیں، وہیں دوسری طرف ان کے ایسے ادبی آثار کو بھی حصارِ حرف کرایا گیا ہے جو عام نگاہوں سے ابھل جاتے ہیں۔ میرِ خمیر، میرِ ظلیق، میرِ ذوق اور میرِ انیس کا بہت سا غیر مطلوب و نکلام مکتبی مریضہ ڈاکٹر حیدریؒ کی کوششوں سے منظرِ عام پر آیا ہے۔ میر تقی میر کے دیوانِ اول کا ایک ایسا نسخہ انھوں نے دریافت کیا ہے جس کا متن حیدر اول و جان کے مقابلے پر مستند اور تعدادِ اشعار زیادہ ہے۔ اسی طرح بہت سے اہم خطوط کی دریافت اور اشاعت سے انھوں نے ہماری ادبی تاریخ کے بہت سے گوشوں کو منور کیا ہے۔

پرانے اخبارات و رسائل بھی ڈاکٹر حیدریؒ کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ ان پر انھوں نے درجنوں مقالے لکھے کہ ان کے بارے میں معلومات عام کی ہیں۔ یہی نہیں ان میں شائع شدہ ایسے

☆ سابق استادِ کلیم علی دہلوی، پروفیسر حیدر آباد (دکن) علی دہلوی، پروفیسر میر تقی میر علی دہلوی۔

بہت سے ادبی نوا اور کوہ پارہ شائع کیا ہے جن سے اعلیٰ ادب واقف نہیں تھے۔ ان نواسیہ کی اشاعت سے اردو کے علمی و ادبی سرمائے میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔

علامہ اقبال پر ڈاکٹر حیدری کا کام اس درجے کا ہے کہ ان کا شمار ماہرینِ اقبالیات میں ہوتا ہے۔ ان کی دو کتابیں ”اقبال اور صحتِ زبان“ اور ”کلامِ اقبال۔ نادر و نایاب رسالوں میں“ اب تک کے اقبالیات کے تحقیقی کاموں پر اضافے کا درجہ رکھتی ہیں۔

غالب کے حوالے سے ڈاکٹر حیدری نے درجنوں مقالات لکھے ہیں جو مختلف علمی جریدوں میں نکھرے ہوئے ہیں یا تاحال غیر مطبوعہ ہیں۔ ان کی افادیت کے پیش نظر ادارہ یادگار غالب کی طرف سے ان سے گزارش کی گئی کہ وہ ان مقالات کو کتابی صورت نکھا کریں تو ان سے استفادے کا دائرہ وسیع ہوگا۔ اس گزارش کے جواب میں انھوں نے جو مضامین ارسال فرمائے، انھیں مندرجہ ذیل مجموعوں کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے:

(۱) نوا اور غالب

(۲) غالبیات کے چند فراموش شدہ گوشے

ان دونوں مجموعوں میں حیات و آثارِ غالب اور معاصرین و متعلقینِ غالب کے بارے میں جو معلومات ملتی ہیں، وہ شاید ہی کسی دوسری جگہ دستیاب ہوں۔ امید ہے ان دونوں کتابوں کی اشاعت سے غالب پر مزید کام کرنے کی راہ ہموار ہوگی۔



## مرزا غالب اور شاہانِ اودھ

مرزا غالب کے شاہانِ اودھ کے ساتھ خاندانی تعلقات تھے۔ ان کے والد عبداللہ خان بہادر، نواب آصف اللہ دار بہادر (متوفی ۱۲۱۲ھ، مطابق ۱۷۹۷ء) کی سرکار سے وابستہ تھے۔ مرزا جب مقدمہ بخشن کے سلسلے میں دہلی سے کلکتے کے لیے روانہ ہو گئے تو راستے میں انھیں لکھنؤ میں گیارہ ماہ تک قیام کرنا پڑا۔ وہ عزم ۱۲۳۲ھ (مطابق اگست ۱۸۲۶ء) میں لکھنؤ پہنچے تھے اور یہاں سے ۲۶ ذی قعدہ سالِ مذکور کان پور کے لیے سوار ہوئے۔ بقول حالی:

جب مرزا نے دہلی سے کلکتے جانے کا ارادہ کیا تھا، اُس وقت راہ میں فیصلہ کرنے کا قصد نہ تھا، مگر چوں کہ لکھنؤ کے بعض ذی اقتدار لوگ مذمت سے چاہتے تھے کہ مرزا ایک بار لکھنؤ آئیں اس لیے کان پور پہنچ کر ان کو خیال آیا کہ لکھنؤ بھی دیکھتے چلیے۔ اس زمانے میں نصیر الدین حیدر فرماں روا اور روشن اللہ نائبِ استطاعت تھے۔ اہل لکھنؤ نے مرزا کی عمدہ طور پر عداوت کی اور روشن اللہ کے ہاں بنوادی شائستہ ان کی تقریب کی گئی۔

جائی کو یہاں تسامع ہوا ہے۔ اس زمانے میں لکھنؤ میں نصیر الدین حیدر کے والد بادشاہ غازی الدین حیدرؒ ۲۵ سر پر آراءے سلطنت تھے اور حکومت کے نظم و نسق کی ہانگ ڈور نواب آغا بہرؒ کے ہاتھ میں تھی۔ مرزا، نواب صاحب سے بہت ملنا چاہتے تھے اور انھیں اس بات کا بھی یقین تھا کہ وہ بادشاہ سے ان کی مدد کروائیں۔ جب ملنے کی نوبت آئی تو مرزا نے جلدی میں ایک مدحیہ نثر مصعب قحطیل میں لکھ کر نواب آغا میر کی خدمت میں پیش کیا۔ مرزا اس بارے میں لکھتے ہیں:

مہر پائان گرد آمدند و بزرگانِ انجمن شدند و رفت رفت و ذکر خاکساری  
ہے مرا بہ بزم آغا میر نای از ساداتِ ملتِ آں دیار کہ درآں  
روز ہا بہ آہنگِ مستحلفہ دگی بلند آوازہ بود رہ بہ ترغائی فرمانراے  
آں کشور و دارالمہای آں سلطنتِ اشتہار داشت رسانیدہ، تا  
ازاں جانب ایما، کششے رفت و ازیں نو نیز آشوب ہوں گل  
کرد۔ چوں ملازمت قرار یافت خواہم دست ما بہ مقیدتے سر  
الہام دادن و رہ آورد عالم محدودیتے عرضداشتن، شیخ از کبر قصیدہ  
ہنکی کرد و سینہ بریں آورد و غلی۔ بخون شوقم بہ پیادے کنار  
ناہیدائے نثر انداشت و سوار مہارتے ہم در مصعب قحطیل روشن  
ساخت۔ ۲۵

مرزا کی ہزار تحنناؤں کے باوجود آغا میر سے کوئی ملاقات نہ ہو سکی۔ جالی ملاقات کی ناکامی کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مرزا نے:

دو شرطیں ایسی پیش کیں جو منظور نہ ہوئیں۔ ایک یہ کہ نائب میری  
تعمیم دیں، دوسرے، خود سے مجھے معاف رکھا جائے۔ یہ شرطیں  
منظور نہ ہوئیں اور مرزا بادلِ ناخواستہ ٹکڑے روانہ ہو گئے۔ ۲۶

مرزا ملاقات نہ ہو سکے کی وجہ یہ لکھتے ہیں:

انچہ در باب ملازمت قرار یافت، خلافِ آئینِ خواہمندی و

نکب شہداء خاکساری ہو۔ تحصیلِ ایں اقبال و توحیحِ ایں ابہام جو  
چہ تقریرِ ادا اتواں کرو۔ ۶۵۰

مج کو یہ ہے کہ مرزا کو نواب آغا میر عرف مستوفی زادہ سے بڑی امیدیں  
دابت تھیں، جن پر پانی بھیر گیا۔ وہ نواب صاحب سے ہزار خواہشوں کے ساتھ ملتا  
چاہتے تھے: جیسا کہ ان اشعار سے مترشح ہوتا ہے:

اب رہتا ہے کہ بزمِ طرب آمادہ کرو  
مراقبتی ہے کہ فرست کوئی دم ہے ہم کو  
طابقہ رنجِ سفر ہی نہیں پاتے اتنی  
عمرِ یارمانِ وطن کا بھی الم ہے ہم کو  
لائی ہے مستوفی زادہ بہادر کی امید  
جادو وہ کشفِ کافِ کرم ہے ہم کو ۶۵۱

ایک اور جگہ نواب آغا میر کی سردہری کا ذکر ان اشعار میں ملتا ہے:  
لکھو آنے کا باعث نہیں کھلا بینی  
ہوں میر و کشا سو وہ کم ہے ہم کو  
مقطعِ سلسلہ شوق نہیں ہے یہ شہر  
مزم سے نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو  
لے جاتی ہے کہیں ایک توحیحِ غالب  
جادو وہ کشفِ کافِ کرم ہے ہم کو ۶۵۲

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ اڈل اڈل مرزا کو نواب مستوفی زادہ سے حوصلہ افزا  
امیدیں تھیں۔ اسی برتے پر انھوں نے لکھو میں قیام کیا تھا۔ جب دیکھا کہ وہ سخت کیر  
حاکم ہیں تو غالب کے دل میں تبدیلی آئی۔ اسے سچ مل ۶۵۳ کے خط میں ان کی سخت  
کیر اور نا انصافیوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

ہر چہ وہاں بلا از کرمِ مشکلی و فیضِ ربانی ایں گوا طبعِ سلطان

صورت یعنی مستطیلہ دل آغا میر شنیدہ کی شدہ بخدا کہ حال برعکس  
 است۔ در ابتداء دولت ہر کرا ایک حصول مذہبے خود دیہ بر  
 دے عجیب۔ لاجرم یک دو کس بہ ہر رنگ متحج کھنچو و انکوں کہ از  
 استحکام اساسی دولت خود خاطرش قبح است۔ در بند جمع زر افتادہ  
 است جملہ خاندانہائے قدیم از بیداد ایی بے رحم بہ سیلاب فنا  
 رسیدہ و باز پروردگان ایی دیار آوارہ بہات کھن گردیدہ و نو خود از  
 تر دہی و اسراف خود پشیمان شدہ و از یں شیعہ برکشت۔ بالجلہ بازار  
 بیداد گرم است۔ مہاجران و ساہوکاران و تاجران پنہاں پنہاں ز  
 دہالی خود بہ کان پورے وساحت و امن نیند۔ ہر کہ بود، گرفتار و  
 ہر کہ بہت دیو گر بختن است۔ چوں حالی ایی دیار بر یں رنگ  
 است آں غرض کہ خن از خود نہ گویم۔ تاریخ بہت و عظیم دی  
 قصہ روز بعد از آں ستم آباد برآمد و تاریخ بہت و نیم در  
 دارالسرور کان پور رسیدم۔ ایی جا در سر مقام گزیدہ ماہرے  
 ہندہ کی شوم۔ ۱۰۵

مرزا کی تقریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوہاب آغا میر کی عدم توفیق کی وجہ سے  
 انھیں بادشاہ غازی الدین حیدر کی حکومت سے کچھ نہیں ملا۔ ۱۰۵ اگر لوہاب کو مرزا سے  
 دلچسپی ہوتی اور وہ انھیں بادشاہ سے ملاحت کر مرزا خلیل باقہ لکھنؤ سے نہ نکلتے۔

غازی الدین حیدر کے انتقال کے بعد ان کے صاحب زادے نصیر الدین  
 حیدر ۱۰۵۵ بادشاہ جمشید سلطنت پر جلوہ افروز ہوئے۔ مرزا نے ان کے ساتھ رابطہ قائم  
 کرنے کے لیے سلسلہ جہانی شروع کی۔ اور ۱۲۳۳ ہجری میں ان کی شادی کی تقریب  
 پر ایک قطعہ جنینیت ”در تاریخ طوے کھدائی بادشاہ اور“ کے عنوان سے ۲۵ شعر میں  
 لکھا۔ ”آء تاریخ“ ”نیم عشرت پرور“ ہے جس سے ۱۲۳۳ ہجری کے احوال نکلتے ہیں۔

قلعے کے چند شعر یہ ہیں:

لوح فلذ ز جوش گل کہ وہ  
 عرض گنجینہ سبا و شال  
 دہر گوئی شدت سر تا سر  
 بزم طوسے جو ستودہ خصال  
 شاہ عالم نصیر دیں کہ یور  
 دولتش ایمن از گنہ زوال  
 یہ طراز رقم سلیمان چاہ  
 یہ نکتہ اثر ہمایوں قال  
 باد اسے ادب پیر شکوہ  
 یہ صلائے کرم سحاب نوال  
 اسد فلذ خاں کہ خواندش  
 در حق غالب الفیض کمال  
 یہ اوائے گزارش تاریخ  
 رنعت پر گوشے بساط آل  
 جو ترجمہ ای ہمایوں جشن  
 کہ یہ خسرو بخت باد بقال  
 رد رقم "بزم عشرہ پدیجہ"  
 دیکھ کلقم یور ز نوے دھال  
 در تو خواسی کہ آفتاب سود  
 قتل اعداء مسکی سال  
 شہو خطب پادشاہ لوہس  
 دیکھش پر فزا ، جشن کمال

مرزا نے ایک قصیدہ غرا بادشاہ نصیر الدین حیدر کی مدح میں ۱۰۳ شعرا دہلی سے نفی محمد حسن کے ذریعے بادشاہ موصوف کی خدمت میں لکھو بھیجا۔ غالب مرزا نے یہ قصیدہ قیام کلکتہ میں کہا تھا۔ اس وقت نواب روشن الدولہ نائب تھے۔ چند شعر یہ ہیں:

گر بہ سبیل کدۂ روضۂ رضواں رستم  
 ہوئی زلیخا ترا سلسلہ جنباں رستم  
 ذوقِ غم حوصلہ لڑائی آزاداں رستم  
 پائے کوباں بر خارِ مقلباں رستم  
 لکھو دام نکلائے سرِ راہم مسخرو  
 بے خود از دلوئے شوق پر افشاں رستم  
 از جہانے فلک آہنگِ عظم کردم  
 بدو بارگہ خسرو گہاں رستم  
 شاو مجاہد کہ دولت بدش نامیدہ راست  
 ہم چہ دولت بدش نامیدہ سایاں رستم  
 آں فریدوں فر، جہیدِ مہابت کہ بہ نعر  
 ز آسائش بر مسیو خاقاں رستم  
 حبذا روضۂ عالی کہ ز فیض کرمش  
 ہمہ درد آمدہ بودم، ہمہ دریاں رستم  
 چوں شنیدم کہ ترا نائبِ مہدیؑ مگویند  
 بحرِ تسکین بہ طلب کاری برہاں رستم  
 ہم ز است کہ دو نصرتِ دینِ حیدر  
 صفا ذاتِ تو دانستم و نازاں رستم  
 روشن الدولہؑ بہادر کہ باچار و عطا  
 حاشش کفعم و شرمندۂ نقصاں رستم  
 تو سلیمانی و او آصف و من سرِ ضعیف

راہ نسبت طلبی میں کہ چہ شایاں رستم  
 صلہ یو یستم و شعر فردی نہ کنم  
 ماہو مدح تو بسر کرے ایماں رستم  
 آدم بر در سجود علی مدح سراے  
 نہ بدد کوئی گنجینہ خاکاں رستم  
 مدح ناب مہدی ز محبت باشد  
 شادمانم کہ چہ نہار بجاں رستم  
 از غلامانی علی ساخت دلاے تو مرا  
 تہنیت خواہ بر یوزد و سلاں رستم  
 شایگان محبت توانی ہم در نامہ شوق  
 بکہ بے غرضیہ بہ آرایش عنوان رستم  
 آب و دیک ختم نگر و مظلوم دار  
 گر چہ معنی رہ فریب چہ خدیاں رستم  
 شرف واسع من ایں بکہ کاخوان تو ام  
 عزت و فخر نسب ما نہ کاخواں رستم  
 غالب از ماہو ادب لب بدعا باز کشا  
 تا نہ دامن کہ رہ فکر پریشاں رستم

مرزا اس قصیدے کے بارے میں سبحان اللہ خان کنیوہ ۱۷۵۸ کو، جو اس زمانے میں لکھنؤ کے نہایت ہی ذی حشم و کسا میں تھے، ایک خط میں لکھتے ہیں:

ایں عرضداشت بہ فردغ نگاہ قبول آسجہ ثانی (روشن قدس)  
 مشرقیان کرد و ایں قصیدہ بہ یزیم مینو مثل سلیمانی (نصیر الدین)  
 حیدر بادشاہ غلامہ شود تا مرا کہ سخن پیو ستائش نکلام بہ جائزہ  
 خسروی زبغ امتیاز المرودش پذیرد۔ و انکاء صلہ ہاں گرامنائگی کہ

ہم یہ دہرم پلندہ نامی دہم در نظر خویش گرامی کھد۔

مرزا ایک اور خط میں سبحان اللہ خان کو لکھتے ہیں کہ معلوم ہوا ہے کہ یہ قصیدہ نواب روشن اللہ ولد کو بے حد پسند آگیا، لیکن معلوم نہیں کہ بادشاہ کی خدمت میں پیش ہوا کہ نہیں۔ ۱۸۵۷ء ایک اور خط میں مفتی محمد حسن کو لکھتے ہیں کہ قصیدے کا سلسلہ جائے تو میں دوبارہ بخشش کے مقصد سے کے سلسلے میں کلکتے جانے کا بندوبست کروں۔ ۱۸۵۷ء

بادشاہ نصیر الدین حیدر نے اس قصیدے کے صلے میں مرزا کو پانچ ہزار روپے معافیت کیے جو بیچ میں اڑا لیے گئے تھے، یعنی نواب روشن اللہ ولد نے تین ہزار اور مفتی محمد حسن نے دو ہزار ہڑپ کر لیے۔ ملک زوہ غالب کے نصیب میں ایک کوڑی بھی نہیں تھی۔ اس بات کا انکشاف شیخ تاج (موتی: ۱۸۳۸ء) نے مرزا کے نام ایک خط میں کیا تھا۔ انھوں نے اس واقعے کی زوداد روشنی ۱۹ اگست ۱۸۶۱ء کو مرزا تقی ۱۲۵۷ھ کے نام ایک خط میں یوں کیا تھا:

بڑا پرانا قصہ تم نے یاد دلایا۔ دل کا کہنہ محسوس کو چمکایا۔ یہ قصیدہ مفتی محمد حسن کی معرفت روشن اللہ ولد کے پاس اور روشن اللہ ولد کے قوت سے نصیر الدین حیدر کے پاس گزرا۔ اور جس دن گزرا، اسی دن پانچ ہزار روپے بھیجے کا حکم ہوا۔ حوتنظ یعنی مفتی محمد حسن نے مجھ کو اطلاع نہ دی۔ مظفر اللہ مرعوم ۵۵ لکھنؤ سے آئے۔ انھوں نے یہ راز مجھ پر ظاہر کیا اور کہا، خدا کے واسطے میرا نام مفتی محمد حسن کو نہ لکھنا۔ ناچار میں نے شیخ امام بخش تاج کو لکھا کہ تم دریافت کر کے لکھو کہ میرے قصیدے پر کیا گزری۔ انھوں نے جواب میں لکھا کہ پانچ ہزار ملے، تین ہزار روشن اللہ ولد نے کھائے، دو ہزار مفتی محمد حسن کو دیے اور فرمایا کہ اس میں سے جو مناسب جانو، غالب کو بھیج دو۔ کیا اس نے جنوز کچھ نہ بھیجا۔ اگر



نہ بھیجا ہو تو مجھ کو لکھو۔ میں نے لکھ بھیجا کہ مجھے پانچ روپے بھی نہیں پہنچے۔ اس کے جواب میں انھوں نے لکھا کہ اب تم مجھے خط لکھو، اس کا مضمون یہ ہو کہ میں نے بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ بھیجا ہے اور یہ مجھ کو مظلوم ہوا ہے کہ وہ قصیدہ حضور میں گزرا، مگر یہ میں نے نہیں جانا کہ اس کا صلہ کیا مرحمت ہوا۔ میں، کہ تاج ہوں، اپنے نام کا خط بادشاہ کو پڑھوا کر اُن کا کھایا ہوا روپیہ اُن کے حلق سے نکال کر تم کو بھیج دوں گا۔ بھائی، یہ خط میں نے ڈاک میں روانہ کیا۔ آج خط روانہ ہوا۔ تیسرے دن شہر میں خبر اڑی کہ نصیر الدین حیدر مر گیا۔ اب کہو، میں کیا کروں اور تاج کیا کرے۔ ۱۸۵۷ء

نصیر الدین حیدر کے انتقال کے بعد ان کے چچا محمد علی شاہ (متوفی: ۱۸۳۲ء) اودھ کے تختِ سلطنت پر رونق افروز ہوئے۔ مرزا کی کسی تحریر سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آیا انھوں نے بادشاہ کے ساتھ کوئی رابطہ کیا تھا یا ان کی تعریف میں کوئی قصیدہ کہا تھا؛ البتہ ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبِ زادے امجد علی شاہ ۱۸۵۷ء کی مدح میں انھوں نے ۶۵ شعر کا ایک قصیدہ کہا۔ چند شعر درج کیے جاتے ہیں:

شادم کہ گردشے بہ سزا کرد روزگار  
بے ہادہ کام پیش روا کرد روزگار  
تار بساط النجمن انبساط را  
چوں تار ساز نق مرزا کرد روزگار  
در مدح شاہ غالب رنگیں ترانہ را  
چوں بلبلان ترانہ سرا کرد روزگار  
تادم بنام نامی سلطان کہ از شرف  
ترکیب آں ز مجد و علا کرد روزگار

امجد علی شاہ آں کہ بندوق دھارے او  
 صدرہ نماز صبح قضا کرد روزگار  
 اے آنکہ روزنامہ حکم ترا بہ دہر  
 فہرست کار ہارے قضا کرد روزگار  
 از شکل ماو تو بہ گمانم کہ ماو را  
 بر در کبر تو تاصیر سا کرد روزگار  
 دانی کہ در سخن پہ کہ نام زمین میریں  
 ایں دھڑی محال کیا کرد روزگار  
 ہم پایہ تو عالی و ہم دستگار و علم  
 ہر طرح را دو بار ثنا کرد روزگار  
 تا بہت مہر ہستی خود با ہمارے شاہ  
 پیدا طریق شرط و جزا کرد روزگار

اس قصیدے کا صلہ بھی مرزا کو کچھ نہیں ملا۔ اس کے بارے میں وہ نواب  
 انوار اللہ ولد شفیق <sup>۱۳۵</sup> کو لکھتے ہیں کہ:

ایک حکایت سنو۔ امجد علی شاہ کی سلطنت کے آغاز میں ایک  
 صاحب میرے نیم آستانہ، یعنی خدا جانے کہاں کے رہنے والے کسی  
 زمانے میں دار و اکبر آباد ہوئے تھے۔ کبھی کہیں کے تحصیل دار بھی  
 ہو گئے تھے، زبان آود اور چالاک۔ اکبر آباد میں نوکری کی جستجو کی،  
 کہیں کچھ نہ ہوا۔ میرے ہاں دو ایک بار آئے تھے۔ پھر وہ  
 خدا جانے کہاں گئے۔ میں دلی آ رہا۔ کم و بیش میں برس ہوئے  
 ہوں گے۔ امجد علی شاہ کے عہد میں ان کا خط ناگاہ مجھ کو بسیلی  
 ڈاک آیا۔ چوں کہ ان دنوں میں دماغ دوست اور حافظہ برقرار  
 تھا، میں نے جانتا کہ یہ وہی بزرگ ہیں۔ خط میں مجھ کو پہلے یہ

مصرع لکھا:

از بخت شکر دارم و از روزگار ہم  
آپ سے جدا ہو کر میں برسِ آوارہ بگرا۔ بے پور میں لوکر ہو گیا۔  
وہاں سے دو برس کے بعد کہاں گیا اور کیا کیا۔ اب لکھنؤ آیا  
ہوں، دذیر سے ملا ہوں۔ بہت عنایت کرتے ہیں۔ بادشاہ کی  
ملازمت انھیں کے ذریعے سے حاصل ہوئی ہے۔ بادشاہ نے  
'حائی' اور 'مبادری' کا خطاب دیا۔ مصاحبوں میں نام لکھا ہے۔  
مشاہرہ ابھی قرار نہیں پایا۔ دذیر کو میں نے آپ کا بہت متاق کیا  
ہے۔ اگر آپ کوئی قصیدہ حضور کی مدح میں اور عرض یا خط، جو  
مناسب چاہے، دذیر کے نام لکھ کر میرے پاس بھیج دیجیے گا تو  
بے شک بادشاہ آپ کو بلائیں گے اور دذیر کا خط مشعر فرماں طلب  
آپ کو پہنچے گا۔ میں نے اسی عرصے میں ایک قصیدہ لکھا تھا جس  
کی تیج اسم یہ ہے:

امجد علی شہ آئندہ بہ ذوقِ دعاے او

صدورِ نمازِ صبح قضا کرد روزگار (اسلم)

مترود تھا کہ کس کی معرفت بھیجوں۔ تو کلفت علی اللہ بھیج دیا، رسید  
آگئی صرف، پھر دو ہفتے کے بعد ایک خط آیا کہ قصیدہ دذیر تک  
پہنچا۔ دذیر پڑھ کر بہت خوش ہوا۔ بائین شائستہ پیش کرنے کا  
وعدہ کیا۔ میں متوقع ہوں کہ میاں بدرالدین نرکن سے میری  
سہر خطابی کھدا کر بھیج دیجیے، چاندی کا گیند، مریخ اور قلم جلی، فقیر  
نے سرانجام کر کے بھیج دیا۔ رسید آئی اور قصیدہ کی بادشاہ تک  
گزرنے کی نوید، بس ا پھر دو مہینے تک ادھر سے کوئی خط نہ آیا۔  
میں نے جو خط بھیجا، الٹا پھر آیا۔ ڈاک کا یہ توفیق کہ مکتوب الیہ

یہاں نہیں۔ ایک مدت کے بعد حال معلوم ہوا کہ اُس بزرگ کا وزیر تک پہنچا اور حاضر رہنا چکے۔ بادشاہ کی ملازمت اور خطاب کا ملنا غلط۔ بہادری کی شہرت سے بفریب حاصل کر کے مرشدآباد کو چلا گیا۔ چلے وقت وزیر نے دو سو روپے دیے تھے۔ ۳۶۵

غالب ایک اور خط ۵ مارچ ۱۸۳۹ء میں میر احمد حسین میکیش ۳۶۵ کو جو کچھ میرے کے لیے لکھو گئے تھے، لکھتے ہیں کہ:

امجد علی شاہ مرا بہ ندی پذیرفت و فرمان داد کہ پنج ہزار بہ طرہی زار راہ، ہنگی وہ ہزار روپیہ فرستادہ شود و قلانے دریں جا ظلمیدہ شود۔ بخود ایں حکم امضا نہ پذیرفت بود کہ سرطان برآورد و دو ہفتہ صاحب فراش ماند و مرد۔ ۳۶۵

[آمد ترجمہ از وزیرالحسن عابدی]

امجد علی شاہ نے مجھے حکیم بنایا اور فرمان صادر کیا کہ پانچ ہزار روپے صلے کے طور پر اور پانچ ہزار بطور زار راہ، کھل دی ہزار روپیہ بھیجا جائے اور قلاں شخص کو یہاں طلب کیا جائے۔ ابھی دست خط نہ ہونے پائے تھے اور یہ حکم جاری نہ ہوا تھا کہ سرطان نکل آیا اور دو ہفتے صاحب فراش رہ کر مر گیا۔ ۳۶۵

امجد علی شاہ کے انتقال (۱۳ فروری ۱۸۴۷ء) کے بعد میکیش نے غالب کو مشورہ دیا تھا کہ جو قصیدہ انھوں نے امجد علی شاہ کی مدح میں لکھا تھا وہ واجد علی شاہ کے نام منسوب کیا جائے۔ غالب کو یہ مشورہ پسند نہیں آیا۔ انھوں نے اس کے جواب میں میکیش کو جو خط نومبر ۱۸۳۸ء (۱۲۶۵ ہجری) میں لکھا تھا، وہ یہ ہے:

[آمد ترجمہ از وزیرالحسن عابدی]

تم نے جو کچھ بطور ابلاغ لکھا تھا وہ دل فہم زدہ کے لیے ہامیہ شادمانی ہوا لیکن جو کچھ میرے لیے بطرہی حکم مرقوم تھا وہ میری

کچھ میں نہیں آیا اور اس سے میرے سوانحی دل کو کسی قدر پریشانی ہوئی۔ میرا دیوانہ قادی [مطبوعہ ۱۸۳۵ء] دہلی سے مدراس اور حیدرآباد تک اور لاہور سے ہرات و شیراز تک پہنچ چکا ہے۔ شاہ جنت آرام گاہ [امجد علی شاہ] کی مدح کا قصیدہ [شام کہ روشی ہوا کرد روزگار] اس میں درج ہے اور ایک دنیا اس کو دیکھ چکی ہے۔ یہ ننگ اپنے اوپر کیسے روا رکھوں کہ اسے کسی دوسرے کے نام کر دوں۔ سیم و زر و لعل و گہر نہیں کہ میری دست رس سے باہر ہو۔ کلام ہے جو مبدعِ فیاض سے [مجھے] سنج و در سنج عطا ہوا ہے اطمینان رکھیں، جیسے ہی شاہ صاحب [قلب شاہ] کی طرف سے خط کا جواب ملے گا، نیا قصیدہ اور نیا قطع آپ کے پاس پہنچ چکا ہوگا لیکن شرط یہ ہے کہ خلافِ واقعہ بات مجھے نہ لکھیں اور جیسا میں کہوں ویسا ہی کریں۔ فی الحال کام یہ ہے کہ شاہ صاحب کے نام کی مرضی شاہ صاحب کو پہنچا کر اس کی تکمیل نکالیں کہ شاہ صاحب یہ مرضی نواب صاحب [قلب اللہ و قلب علی خان] ۱۸۳۵ء کو دکھا کر اور اس کی عبارت کا مدعا ہمیں تاکر قصیدہ بھیجے کی اجازت لے لیں تاکہ یہ قصیدہ [غن ز روضہ رضوانِ نکوے یار کھدا] حصیں بھیج دوں۔ اس کا اطمینان رکھیں کہ نواب [قلب اللہ] کی مدح کا قطع بھی اس کے ساتھ ہوگا۔

یہ کوشش نہیں کرنی ہے کہ شاہ [اودھ] مجھے اپنے ہاں بلائے۔ پوری کوشش اس بات کی کرنی ہے کہ صلہ مل جائے۔ اس کے بعد اگر شاہ [اودھ] میرے طالب ہوں گے تو زاہر راہ کے لیے کچھ اور رقم بھیجیں گے ورنہ میں اس صورت میں، کہ قرض کا بھاری بوجھ مجھ پر نہ رہے، اس کوشش و قوشے پر قناعت کروں گا جو مجھے حاصل

ہے۔ ایسے موقع پر میری مختصر تحریر کو بہت سمجھیں۔ ان شاء اللہ میرا خدا سے عہد ہے کہ ہمیشہ راست گفتاری سے کام لوں گا۔ حقیقت یہی ہے جو میں نے لکھی۔ منصب و اقتدار نام و نمود اور خود آرائی مجھے مطلوب نہیں۔ ایک راحت و فراغت چاہتا ہوں اور بس! اور اس راحت و فراغت کا حصول اس بات میں ہے کہ قرض ادا ہو جائے اور قرض کا ادا ہونا اتنی رقم سے ممکن ہے جتنی کا میں شاہِ اودھ سے ہلور ملے متوقع ہوں۔ اللہ! بس۔ ماسوا ہوں! ۱۹۵۱ء

انہی دنوں واجد علی شاہ سخت بیمار ہو گئے تھے اور ان پر جزئی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ قرض داروں نے بھی پریشان کیا تھا۔ جون ۱۸۳۸ء میں واجد علی شاہ اپنے بیٹے شہزادہ مرزا محمد جاوید علی بہادر کی خبر سن کر انتہائی غم زدہ ہو گئے اور بادشاہ کی طرف سے ایسے حالات میں امداد ملنے کی امیدیں دم توڑ گئی تھیں۔ چنانچہ میکش کو لکھتے ہیں:

[اردو ترجمہ از وزیراعظم حایدی]

قصیدہ [خجن ز دوشہ رضاوں بکوسے پار کشد] دیکھانے کے سامنے کون لے جائے، اور اسے کیا بتائے کہ یہ کیا ہے۔ قرض کیا کہ یہ بھی ہوا اور قصیدہ ملا جلتے میں بھی لایا گیا اور پڑھ کر سنانا شروع کیا لیکن دیکھانے نے ہنسا اور سر ہلانا شروع کیا اور پڑھنے والے کے ہاتھ سے کاغذ لے کر دانتوں میں چبا کر زمین پر پھینک دیا، یا سنا اور کسی دوسرے معاملے کی طرف متوجہ ہو گیا اور سائل کے مقصود کے بارے میں کوئی بھی بات نہ کی [تر کیا نتیجہ ہوا]۔ بالفرض والصلحہ قصیدہ سننے کے بعد بمصدق اللجون خون خلعت پہنچنے یا ہزار اشرفیاں بخشنے کا حکم بھی دیا تو اس کے حکم کی تعمیل کون کرے۔ خلعت کون بھیجے اور نوزائے سے رقم کون دے۔ سلطنت

کے کارپرداز دیوانے کے حکم دینے پر رقم کیوں دیں اور خلعت کیوں بھیجیں۔ اگر بادشاہ بھتوں ہے تو وزیر امارتِ دولہ منظم الملک علی قلی خان بہادر سہراب جنگِ غائب بہ حضورِ عالم بہادر! تو دیوانہ نہیں۔ غرض یہ سب ہاتھ میری نظر میں ہیں اور تیرے بے تقدیر پر تحریر زدہ ہوں۔ ہر چند تم اس خیال سے کہ میں شکستہ دل اور غم کیس نہ ہوں، امید دلاتے ہو اور ہر واقعہ کو مجھ سے چھپاتے ہو، لیکن ایسے بڑے راز کب چھپتے ہیں۔ یہ بات عالم آشکارا ہے کہ شاہِ اودھ بالکل دیوانہ ہے۔ وزیر کیج وار و مرید سے کام لیتا ہے۔ اس تحریر سے مدعا یہ ہے کہ اس تعلقِ خاطر سے میں قطعِ فکر کر چکا ہوں اور کسی طرح کی توفیق کا شائبہ بھی باقی نہیں۔ تمہاری طرف سے گھر مند ہوں اور قطبِ الدولہ کے بارے میں بھی (جو زہرِ عذاب ہے) مجھے غم ہے۔...

ادھر بادشاہ کی بیماری رفع ہونے لگی اور جشنِ غسلِ صحت کا اہتمام کیا جانے لگا۔ ادھر غالب کی جان میں چاہن آگئی۔ بادشاہ کے عطیات و انعامات کی امیدیں پھر سے کوٹ لینے لگیں۔ قرض داروں کی ادائیگی کے بعد کچھ رقم بچ جاتی تو فریضہ رجب اور زیاراتِ شہادتِ عالیات سے بھی فیضِ یاب ہو جاتے۔ ۲۳ دسمبر ۱۸۳۸ء کے طویل خط میں نیکیش کو لکھتے ہیں:

[اُردو ترجمہ: از وزیرِ احسن عاہدی]

میری جان! قصیدہ پہنچتا ہے۔ طود پڑھیں اور نوب صاحب [قطب الدولہ] تک پہنچائیں اور اس کی کوشش کریں کہ بادشاہ [واجد علی شاہ] کی نظر سے گزرے اور صلہ ملے۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے حسنِ سلوک اور نوب صاحب کی حمایت سے ضرور بادشاہ تک پہنچے گا۔ پھر کیا ہوگا؟ لوگ کہتے ہیں کہ لامحالہ صلہ

دینے کا حکم صادر ہوگا تو وزیر [امینِ اقدار] M.A. کے نام صادر ہوگا اور وزیر کے [قنصل کے] بغیر کام نہ ہو سکے گا۔ ایسی صورت میں مجھے اندیشہ ہے کہ کام بگڑ جائے گا۔ چارہ کار یہی ہو سکتا ہے کہ اس بابے میں نواب صاحب پر یہ اندیشہ ظاہر کر دیا جائے اور میری طرف سے کہا جائے کہ غالب کہتا ہے کہ میں گھائے یک در ہوں اور [نواب] قطبِ اقدار کے سوا دوسرے کو نہیں چانتا۔ اس لیے قطبِ اقدار کو چاہیے کہ مجھے دوسرے کا محتاج نہ کریں اور قصیدہ خود پیش کریں اور صلہ حاصل کریں اور خود مجھ تک پہنچائیں۔ جب یہ کام بن جائے، وزیر [مجھ] میں نہ آئے اور جیسا کہ میں نے کہا کہ نواب قطبِ اقدار علی کی مہربانی سے مقصود مل (کنڈر حاصل) ہو جائے تو چوں کہ یہ مقصود رقم ہے اس لیے خود سوچیں کہ رقم کھسوا سے مجھ کو کیسے بھیجیں گے۔ ظاہر ہے، ہندوی سے بھیجیں گے۔ شہر [کھسوا] بیکانہ، شہر کے لوگ حیدرآباد سے اور تم کو شہر کے ساہوکاروں سے کوئی واقفیت نہیں۔ ایسا نہ ہو، کوئی قباحت پیدا ہو۔ اس کا ادا یہ ہے کہ جب کوئی رقم عطا ہونے کا حکم مل جائے تو نواب صاحب کی خدمت میں عرض کریں کہ میں مسافر ہوں، ہندوی حاصل کرنے کا طریقہ نہیں جانتا، حضور کسی قابلِ احماد اور اپنے محنتل ساہوکار کو بلا کر رقم اس کو دے دیں اور ہندوی اس سے کھسوا کر اپنے خط کے ساتھ ملخوف کر کے مجھے عطا فرما دیں تاکہ میں وہ خط اسد اللہ خاں کو بھیج دوں؛ لیکن یہاں ایک بات کہنی باقی ہے، یعنی میں نے جو رقم تم کو دینے کی ہے، وہ کس طرح تم کو دوں، یہ بات تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ پانچ ہزار روپے میں سے



پانچ سو روپے تم کو دوں۔ تم چاہو تو یہ رقم دوں لے لو اور اگر تم یہ چاہو کہ قلعہ لڈلہ پر یہ بات ظاہر نہ ہو تو لکھو تاکہ ہندوی کی پوری رقم بچنے کے بعد میں پانچ سو روپے تم کو بھیج دوں۔ مکمل صورت میں ایک الگ مہر شدہ خط تمہیں بھیج دوں اور تم اپنے نام کا وہ خط نواب صاحب کے ملاحقے میں لاکر پانچ سو روپے اپنے پاس رکھ لو اور چار ہزار پانچ سو روپے کی ہندوی، جیسا کہ میں نے لکھا ہے، نواب صاحب سے لے کر مجھے روانہ کر دو۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر تمہاری صلاح یہ ہوگی تو میں تمہارے خط میں یہ نہیں لکھوں گا کہ پانچ سو روپے میں نے تم کو دیا بلکہ پانچ سو روپے کی لکلاں لٹاں اجناس خرید کر تم بھیجو گے۔ میرے اس سوال کا جواب جلد لکھ بھیجو؛ لیکن دوسرا اندیشہ سب سے زیادہ روح فرسا ہے، یعنی میں شہر [دہلی] میں قرض وار ہوں اور [کئی] ڈگری وار ہیں۔ اگر انہیں پتا چل گیا تو اپنی ڈگری پیش کر کے قانوناً رقم مجھ سے لے جائیں گے اور میری اور تمہاری کوشش مانچاں جائے گی۔ اس دھم کو دھرمیوں کی احتیاج ہے۔ ایک یہ کہ ہندوی میرے نام کی نہ ہو۔ ”صرف شاہ جگ“ ہو [جو کوئی شخص بھی لے سکتا ہے]۔ دوسرے یہ کہ جس طرح پہلے قلعہ لڈلہ کے [میرے نام] خط بیچنے کی اطلاع اپنے دوستوں کو لکھ بھیجی تھی۔ [اس مرتبہ] یہ خبر کسی کو نہ لکھیں اور ایسا کریں کہ میرے اور تمہارے سوا کسی دوسرے کو پتا نہ چلے کہ کیا ہوا اور یہ معاملہ کہاں تک پہنچا۔ سبحان اللہ، سبحان اللہ۔

جہاں ہے مر دگیتی دشمن و دلدار مستحق

مرا بر آرزو ہاے شاکلی شندہ می آید

خط ختم ہوا، لیکن غمِ دل اسی طرح جوشِ زن ہے اس لیے لکھے کو  
 مکرر لکھتا ہوں۔ میرے یہ تمام تفکرات صحیح ہیں۔ ان میں سے  
 ایک بھی بے بنیاد نہیں۔ ہارے قصیدہ [خن ز روئے رضواں نکوے  
 یار سعد] چننے کے بعد مناسب فکر کرنا اور معاملے کے تمام  
 پہلوؤں اور گرد و پیش کو دیکھ کر اندازہ لگانا کہ کیا کرنا چاہیے۔ جو  
 مضمون مطلوب ہو، لکھتا تاکہ اس مضمون کا خط تمہارے نام، یا  
 اگر ضرورت ہو تو قلمبِ ہندوہ کے نام لکھ کر تمہیں بھیج دوں اور  
 قصیدہ چننے کے بعد کے حالات بھی مجھ کو لکھتا کہ جب نواب  
 صاحب نے قصیدہ دیکھا تو کیا کہا، اور جب بادشاہ کے سامنے  
 پیش کیا تو بادشاہ نے کیا کہا۔ فرض یہ تمام باتیں لکھتا اور یہ  
 چیزیں لکھنے کے بعد صلے کے بارے میں تمہاری رائے میں جو  
 بات ضروری ہو، تحریر کرنا تاکہ اس مضمون کا خط تمہارے نام یا  
 نواب صاحب کے نام لکھ کر بھیجوں۔ اس بات کا بھی خیال رکھنا  
 کہ دہلی میں کسی شخص پر یہ امر ظاہر نہ ہونے پائے بلکہ بہتر یہ  
 ہے کہ قصیدہ چننے ہی اس کے چننے کے بارے میں فورا مجھے خط  
 لکھتا، تاکہ میرے دل کو اطمینان ہو اور اس کے بعد قصیدے کا  
 بادشاہ کے حضور میں پیش ہونا اور بادشاہ کے حکم کا صادر ہونا، یہ  
 سب ٹھیک ٹھیک لکھتا اور بتانا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور یہ کہ  
 تمہارے نام خط لکھتا چاہیے کہ نواب صاحب کے نام [اور ان  
 کے نام] کس مضمون کا خط لکھا جائے۔ یہ سب لکھ کر بھیجنا اور ہر  
 بات پر، جو میں نے لکھی ہے، خوب توجہ کر کے اور پوری دقتِ فکر  
 سے کام لے کر ایسا جواب مجھے لکھتا جو سراسر صلاح ہو عین  
 صواب ہو۔ کام کا آغاز بڑی خوبی اور خوش اسلوبی سے ہوا

ہے اور فی الحقیقت تم نے ایک بڑا کام کیا ہے۔ اگر تمہارے  
 بجائے مثلاً روح الامیں کو بھی یہ کام سپرد کرتا تو اس سے بہتر طور  
 پر انجام نہ پاسکتا، لیکن ہوشیار اور خبردار رہیں کہ انجام بھی اس کام  
 کا ایسا ہی ہو جیسا آغاز اچھا رہا ہے۔ ایسا نہ ہو، آخر میں کوئی  
 لغزش ہو جائے یا غفلت واقع ہو اور بنا بنایا کام بگڑ جائے۔ خدا  
 عظیم ہے کہ یہ میری آخری عمر ہے اور میں سخت عاجز اور حیران و  
 پریشان ہوں۔ اس معاملے میں کچھ امید بندھی ہے اور تمہاری  
 توقع پر مبنی رہا ہوں۔ اولاد نے بڑے باپ کی بڑی خدمت کی  
 ہے۔ اگر تمہاری سعی و کوشش اور حسنا تدبیر سے یہ کام سرانجام پا  
 جائے گا اور باوشاہ اودھ کی طرف سے صلہ اس طرح کہ میرے  
 اور تمہارے سوا کوئی نہ جانے، مجھ کو مل جائے گا تو گویا اس کے  
 بعد میری جو زندگی باقی ہے وہ تمہارے احسان کے زبیر سایہ غرضی  
 سے گزرے گی۔ اس وقت اس قرض سے، جس کا بار میرے  
 لیے دوش فرسا ہے، میں سخت عاجز آ گیا ہوں۔ جب یہ بھاری  
 بوجھ میرے شانوں پر سے اٹھ جائے گا تو پھر آئندہ میں اس تحفہ  
 پر قاعدت کروں گا جو سرکارِ انگریزی سے مجھے ملتی ہے اور خشک  
 روٹی پر قاعدت کر کے زندگی مستعار کے ہاتھ لے کر اوروں کا اور  
 آئندہ بھی قرض نہ لوں گا، بلکہ اگر توفیقِ الٰہی شامل حال رہے  
 گی اور زاد و ماہ باقی بچے گا تو کعبہ و مدینہ و نجف کا عزم کر کے گھر  
 سے نکلوں گا۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ غالب کو اپنی ضروریات زندگی کی عدم دستیابی کی وجہ  
 سے معمولی لوگوں کی طرف جھکتا پڑ رہا تھا۔ انھیں یقین تھا کہ سلطانِ عالم و اہد علی شاہ  
 کے دربار میں رسائی حاصل کر کے انھیں خاطر خواہ امداد ملے گی۔ انھوں نے

قلبِ لہلہ کو یہ ترغیب بھی دی تھی کہ اگر بادشاہ ان پر مہربان ہوگا تو وہ زیارتِ کر بلائے معلیٰ کے لیے عراق جائیں گے۔ چنانچہ قلبِ لہلہ کے خط میں ۱۸ ذی قعدہ ۱۲۶۵ ہجری (۱۸۴۸ء) کو لکھتے ہیں:

[آرزدو ترجمہ از وزیرِ اہن مابدی]

جنابِ نواب صاحبِ جمیل المناقب، مہمِ الاحسان، امیدگارِ مخلصانِ دامِ بقا و دارِ خلافت کی خدمتِ مبارک میں بدینے سلامِ مستنون کی پیشکش اور تحائفِ ملاقات وافرِ مسرت کے اظہار کے بعد گزارشِ مذہب یہ ہے کہ ایک طویل مدت گزری، (واجد علی شاہ بادشاہِ اودھ کی عرض میں) قصیدہ [خن ز روئےِ رضاں بکوے یارِ کشد] اور ایک عرضِ داشت [بخشود شاہ] آپ کی خدمت میں بھیج کر بہ ہزارِ آرزو درخواست کی تھی کہ یہ نظم اور نثرِ حضرتِ قدسِ قدرت، ظنِ الہی، غلہ اللہ ملکہ و سلطانہ کی نظرِ ربوبیت اثر کے سامنے پیش کر دیں۔ حقیقت (یہ) ہے کہ قصد یہ تھا کہ عیضِ شاعی حاصل کر کے تنقباتِ عالیات کا رخ کروں۔ راقم کی ناسازیِ طالع پر دے ہو کہ ابھی تک [مصور کی] اس بہار کی بھلک نظر نہیں آ سکی ہے۔ شاہنشاہ کا دستِ کرم اور رحمت ہے جو خارِ دگل پر یکساں برستا ہے۔ جہاں بے مانگے لعل و گہر کی کانیں بختے ہوں۔ سوال کے بعد سائل کی بھروی کیسے ممکن ہے؟

بات یہ ہے کہ آں جناب نے اس درویشِ دل ریش کی طرف توجہ نہیں فرمائی اور قصیدے اور عرضِ داشت کو حضرتِ خدیجِ آفاق کی نگاہِ التفات کے لیے پیش نہیں کیا۔ وقت گزر رہا ہے، حافظہ روانہ ہو رہا ہے۔ میرے ہم راہی آمادۂ سفر ہیں اور جلد روانہ ہونا چاہتے ہیں، لیکن میں تمہی دستی و بے نوائی کے باعث اسی طرح

پا پہ رگل ہوں۔ خدا را اس گوشہ نشیں اعدوہ گئیں پر رحم فرمائیں اور قصیدہ اور عرض داشت بادشاہ کے حضور پیش کر دیں اور جس عطیے کا حکم ہو، اس طرح کہ تاخیر نہ ہو، اس گدائے امیدوار کو ارسال فرمادیں۔ اس سے زیادہ، دعاے دوام دولہ حضرت علی سہبائی کے سوا، جو ہر دم دردِ نہاں ہے، کیا عرض کروں۔ نامہ نگار ہوا خواہ اسد اللہ، نگاشتہ روزِ شنبہ ۱۸ ذی قعدہ ۱۲۶۵ھ۔

مرزا غالب بسیار آرزو مند تھے کہ کہیں واجد علی شاہ سے عطیے کا فرمان صادر ہو جائے کہ وہ لکھنؤ کا رخ کریں۔ اس دوران انھوں نے نواب مظفر اللہ، نواب حسین مرزا ناظمی، امیر افتاد اللہ، نوروز علی خان ۳۳۵ اور قطب اللہ وغیرہ کو خطوط کیے، لیکن کہیں سے کوئی امید افزا جواب نہیں ملا۔ چنانچہ سنی ۱۸۵۰ء والے خط میں بیکش کو لکھتے ہیں:

با آنکہ بیچ مطلب ممکن روا نہ شد  
دل خوش نمی کنیم مگر از محال ہا  
جس دن سے تم لکھنؤ میں جا کر رہے ہو اور خود تمھاری تحریروں سے ظاہر ہوتا رہا ہے کہ تمھیں قطب اللہ کے ساتھ، جو بادشاہ واجد علی شاہ کے خاص نمائندوں میں سے ہیں، قرب و انس حاصل ہے، میں دل میں سوچتا رہا ہوں اور کہتا رہا ہوں:  
باشد کہ ہمیں بیضہ برآمد پر و ہاں

فرض میرے دل میں طرح طرح کی ہوسیں تھیں اور مجھے یقین تھا کہ میرا احمد حسین، جو بہلول میرے فرزند کے ہے اور سعادت مند ہے، جب نہیں کہ قطب اللہ کو اس پر آمادہ کر لے کہ میرا ذکر شاہ اودھ واجد علی شاہ سے کریں اور دربارِ سلطانی سے میرے نام فرمان طلب بھجوائیں تاکہ میں لکھنؤ پہنچوں اور بادشاہ سے ملوں

اور اس طرح میری ناکامیوں کا دور ختم ہو۔ لیکن واہ ری خوبی قسمت کہ یہ خیالی منصوبہ ختم ہو کر رہ گیا اور تمام امیدیں مہذل بہ پاس ہو گئیں اور ایسا ہوتا ہی تھا اس لیے کہ اقبال نکاش میر مہدی بخروج نے اپنے نام کا خط، جو تمہارا لکھا ہوا تھا، مجھے دکھایا۔ خدا جانتا ہے جو اس خط کو دیکھ کر میرا حال ہوا ہے اور دور تک اپنا اہتمام نظر آنے لگا ہے۔ آخر یہ کیا ہو گا کہ تم کو لکھو سے ناکام ہو کر روانہ ہوتا پڑے۔ براے خدا میکش میرے غم زدہ دل بے قرار کی چادر مری کر۔ تجھے خداوندِ قدر اور اربابِ اجزاء اظہارِ عظیم السلام کا واسطہ اپنا حال صحیح صحیح مجھے لکھ۔ جو کچھ تم نے میر مہدی کے خط میں لکھا وہ میرے حضور اور میری توجہ کے باطل برخلاف ہے۔ تعجب ہے کہ تم نے حالات مجھ کو کبھی نہیں لکھے۔ اب تمہاری جان کی قسم جب تک تمہارا دوسرا خط میرے نام نہ آئے گا اور تمہارے حالات کی سرگزشت معلوم نہ ہوگی، میرے دل کو چین نہ آئے گا۔ خدا کے لیے جلد از جلد خط بھیجو اور اپنی کیفیت موہو لکھو۔

اے بہا آرزو کہ خاک شدہ

اظہارِ حزن و ملال اور طلبِ تحصیلِ حال کے سوا کیا لکھوں۔

اسد اللہ خان سیاح۔

آخر کار غالب کا قصیدہ (غزل ز روضۂ رضواں بکوعے یار کشف) قطبِ قدس کی وساطت سے بادشاہ کے دربار حاضر کیا گیا اور مشہور مرثیہ گو میر خیمبر ۱۲۵۵ھ نے غالب کی درخواست کے ساتھ بادشاہ کے حضور میں پڑھا۔ بادشاہ نے پسند فرمایا اس سلسلے میں مرزا حادّی الاول ۱۲۶۶ ہجری روزِ سہ شنبہ (مارچ ۱۸۵۰ء) کو نواب محمد علی خان بہادر عرف میرزا حیدر ۱۲۵۵ھ کو بھیجے ہیں:

سرآقاؤ سالِ گزشتہ در عہدِ شاہِ انجم سیاح، سپہر بارگاہ، حضرت

سلطانِ عالم قصیدہ انشا کرد و عرضداشتی در نثر نیز رقم زد و اس قصیدہ و عرضداشت بہ قلب اللہ فرستاد۔ قلب اللہ مردی کرد و قصیدہ و عرضداشت بظہر جہانیاں داراودہان درآورد۔ مولانا حمیر سلمہ اللہ تعالیٰ بفرمان کئی خدیو اس قلم و نثر را ہادے کر پنداری گھر ہے شاہدار بر بساطِ بزم افشاند بہ پیش گاو سریر سپہ نظر خواند۔ پسندیدہ طبعِ ملتِ شہریار افتاد و بہ قلب اللہ فرمان رفت کہ بہ ہنگامِ درگِ عرضداشت را دوبارہ بہ نظر گزارند تا منت بر جانِ سائل نہم و بجا نژہ فرمان دہم۔ ۳۶۵

مرزا نے ایک اور خط یاد دہانی کے طور پر نواب امداد حسین خاں امین اللہ بہادر وزیرِ اعظم و اجد علی شاہ کو لکھا جس میں قصیدے کے سلسلے کے بارے میں حقیقہ کیا تھا۔ خط میں اپنی عاجزی کا اظہار یوں کیا تھا:

غواہم کہ بد بختیِ آصف بہ سیماں رسم۔ گدا نیم نگاہ دار و مور را  
بہ آصف و گدا را بہ ارسطو و خود را بخداوند سپارد۔ نیز دولت و اقبال  
کہ سرچشمہ فروغ بے زوال است ابدی فروغ و جاودانی خیا  
پار۔ ۳۶۶

آخر کار غالب اپنے مقصد میں کامران و کامیاب ہوئے تھے اور انہیں ”دیر آید، درست آید“ کے مصداق اپنی کاوشوں کا صلہ مل گیا تھا۔ مجتہد العصر سید محمد کے دینے سے انہیں سلطانِ عالم و اجد علی شاہ کے دربار سے خلعت ملا۔ اس بارے میں ۵ نومبر ۱۸۵۹ء کے خط میں یوسف میرزا ۳۸۵ کو لکھتے ہیں:

سلو صاحب اتم جانتے ہو کہ میں ۱۳ پارچے کا خلعت ۳۶۵ ایک پار اور لمبیز خاص شال و روایل دو شالہ کس کس کے ذریعے سے پا چکا ہوں۔ مگر یہ بھی جانتے ہو کہ وہ خلعت مجھ کو دو پار کس کے ذریعے سے ملا ہے، یعنی جنابِ قبلہ و کعبہ مجتہد العصر مدظلہ العالی۔

اب آدمیت اس کی منتہی نہیں ہے کہ میں بے اُن کے قنط کے مدحِ معسری کا قصہ کروں، چنانچہ قصیدہ لکھ کر اودھ جیسا کہ میرا دستور ہے، کاغذ بٹھا کر حضرت بیروم شد کی خدمت میں بھیج دیا ہے۔ یقین ہے کہ حضرت نے وہاں بھیج دیا ہوگا اور تم کو لکھ چکا ہوں کہ میں نے قصیدہ لکھنا کو بھیج دیا ہے۔ اسی خط میں یہ بھی تم کو لکھا ہے کہ حضرت زبدۃ العلماء سید لقی صاحب اگر لکھنے بھیج گئے تو مجھ کو اطلاع دو۔ ۱۸۵۴ء

مرزا کی تحریروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لیے واجد علی شاہ نے پانچ سو روپے کا سالانہ وظیفہ منظور کیا تھا۔ چنانچہ چودھری عبدالغفور سرور کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

واجد علی شاہ بادشاہِ اودھ کی سرکار سے یہ صلۂ مدحِ معسری پانسو روپے سال مقرر ہوئے۔ وہ دو برس سے زیادہ نہ ہے، یعنی اگرچہ اب تک چھتے ہیں مگر سلطنت جاتی رہی اور چالیس دو ہی برس میں ہوئی۔ ۱۸۵۴ء

واجد علی شاہ شعبان ۱۲۷۰ ہجری (اپریل ۱۸۵۴ء) میں بیمار تھے۔ انھوں نے خراب دیکھا تھا جس کا تفصیلی ذکر انھوں نے اپنی مشہور ”حقیق نامہ“ کی ۱۸۵ ویں داستان میں اس عنوان سے کیا:

در بیانِ دیدنِ رویاے صادقہ و عتباتِ تربتِ مقبرہ از

ابا عبد اللہ المحمیں علیہ الصلوٰۃ والسلام

ذیل میں چند اشعار درج کیے جاتے ہیں:

ہزار و دو صد اور ہفتاد سال

یہ تھا اُن دنوں سالِ ہجرت کا سال



نہیں شک ورا یاد ہے مجھ کو سب  
 رہ شہنشاہ تھا اکیسویں کی تھی شب  
 ہوئی منعقد ایک ۳۳۵ ۳۳۵ عزا  
 مقام عزاے شہر کر بلا  
 اسی مجلس خاص میں ایک بار  
 عجب قدرت حق ہوئی آشکار  
 شخصیں بھی آئیں نظر دو دہاں  
 کہ تھیں وہ نہایت رنگ و کلاں  
 کہ دو تاج آئے بے پناہ تمام  
 عطاے خدا یا عطاے امام  
 خراج مبارک کا گنبد تھا جو  
 ہوا نصب اس پر وہ تاج ایک تو  
 رہا تاج پُر نور جو دوسرا  
 میرے سر پہ وہ نصب ہونے لگا  
 کبھی اہل مجلس کی حیرت ہوئی  
 کبھی دنگ مطلق دیانت ۳۳۵ ۳۳۵ ہوئی  
 ہوئی بعد اس کے جو مجلس شروع  
 ہوا ایک سالے کا پھر وقوع  
 یہ دیکھا کہ ہیں جمع میرے بزرگ  
 انھی میں ہیں مریم مکانی ۳۳۵ سڑک  
 ہوا میرے دل کو یہ اس دم گماں  
 کہ دہرا ہیں راتنی فزائے مکاں

کہیں ہیں جنابِ شیرِ مشرقین  
 شہنشاہِ دنیا و عظمیٰ حسین  
 پڑھا مرثیہ میں نے قوشِ خرم  
 ہوئی بات ثابت یہ مجھ پر صریح  
 کہ خاتونِ محشر ہیں روتی فزا  
 مری جدہ مریم مکانی کی جا  
 یہ مجلس میں رونے سے غوغا ہوا  
 کہ ہنگامہِ محشر برپا ہوا  
 فرضِ روز کتنے جو آخر ہوئے  
 تو آجارِ تعبیر ظاہر ہوئے  
 کہ آیا خطِ صاحبِ اجتہاد  
 کہیں کر بلا میں ہیں جو خوش نہاد  
 محمد تقی نام، بحرِ معلوم  
 گلِ ہارِ اسلام بحرِ معلوم  
 یہ مضمون کہ تھا میں نجف میں کہیں  
 شیرِ قہقہہ شاہِ دنیا و دیں  
 بڑا فصلِ ربِ توانا ہوا  
 مجھے خواب میں حکمِ مولا ملا  
 کہ جا کر بلا میں ہو چمکے کہیں  
 مقبرہِ مقدس ہے وہ سرزمین  
 بنا تہجِ پاک سے اک خرم  
 کرے اہلِ امراض کو جو صبح

نوسے ہند بھیج اس کو مہدی کے ساتھ  
 وہ سید ہے، لے جائے گا ہاتھوں ہاتھ  
 غرض بادشاہی تھی میرے سویم کی  
 خیردار نے یہ خبر مجھ کو دی  
 نئی ہے دیانت کی جو کر بلا  
 وہیں ہے مخرج معزز کی جا  
 دیا مہدولت نے قرباں یہ جب  
 کہ جائیں دلی مہدِ عالی نسب  
 عزیز اور کباب صاحب بھی جائیں  
 اراکین دولت مصاحب بھی جائیں  
 جلوس سواری بھی ہو بے شمار  
 علم، فیل، ڈاکا، شتر، راہدار  
 روانہ ہوں سب ڈاکرینِ امام  
 عزادار بھی سید زن ہوں تمام  
 یہ پیش ہر ایک انساں ہوا  
 محرم سے بھی بڑھ کے ساماں ہوا  
 غرض کر بلا سے در خاص تک  
 زمین پر تھے انساں، ہوا پر ملک

داہد علی شاہ کو خواب میں جناب سید الشہداء کی طرف سے بشارت ہوئی کہ ہم  
 خاک شفا تمھارے لیے بھیجتے ہیں۔ نجف اشرف کے مجتہد کو بھی بشارت ہوئی کہ خاک  
 شفا لکھو بھیجی جائے۔ کر بلا سے خاک شفا کی مخرج بڑے احترام سے روانہ ہوئی۔ لکھو  
 میں جو داغے کی تاریخ تھی اس روز داہد علی شاہ نے سلطان العلماء کو رقتہ لکھا کہ میں  
 بسبب عارضی نقصان زیادہ روپی کی طاقت نہیں رکھتا اس لیے دلی مہد اور دیگر شہزادوں کو

عکم دیا گیا کہ وہ ۲۶ شعبان ۱۲۷۰ھ (مئی ۱۸۵۳ء) یوم پنج شنبہ آدھ گھڑی دن رہے سیاہ پوش ہو کر دیانت اللہ دارہ کربلا میں حاضر ہوں۔ اس حکم کے موافق خراج خاک شفا بڑی دھوم سے لکھنؤ میں آئی۔

خریج مبارک کے درود لکھنؤ کی تانید مرزا غالب کے ایک قصیدے سے بھی ہوتی ہے جو کلیاتِ غالب میں ”قصیدۂ خریج“ کے نام سے موجود ہے۔ خریج اور قصیدے کی حریدہ تفصیلات حافظ احمد علی خاں ناظم کتب خانہ رام پور کے مضمون ”مرزا غالب کے ایک قصیدے کی شاہانِ ہند“ مطبوعہ ”معارف“ دارالمستقیمین، اعظم گڑھ ہایت مئی ۱۹۳۲ء (صفحہ ۳۶۳) میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ قصیدے کی تحصیل واقعہ کربلا کی خوں چکاں تصویر پیش کرتی ہے۔ چند شعر یہ ہیں:

عیا در کربلا تا آں ستم کش کارہاں بنی  
کہ در دے آدم آلِ عبا ما سارہاں بنی  
ناشد کارہاں را بعدِ عادتِ رخت و کالاے  
ز بارِ غم بود کہ تاقِ را محلِ گراں بنی  
نہ بنی سرخوشِ خوابِ دمِ مہاںِ عازی را  
نہ مقلش در غمِ بازو، نہ حیرش در کماں بنی  
نہ ی بنی کہ چوں جاں داد از بیدادِ بدخواہاں  
علی اکبر کو بچوںِ حقِ بدخواہش جواں بنی  
کرشم کایں ہمہ بنی دے داری و خشنے ہم  
ہنوں آغوشِ بازو حکمِ اسفر چہاں بنی  
چہ انہاں در جگرِ افروزہ باشی کاہداں داری  
صمیمِ بہنِ علی را در شہرِ کشمیں بنی  
ستے را کش رگِ گلِ خارِ بودے، بر زمیں پائی  
سرے را کش ز اسفر خارِ بودے، بر ستاں بنی

بود تا نکلیے گام تاز آفرین چوہاں را  
 خرمن سوے بند از خاک آں شہد رواں بنی  
 نیلے زان قیارت گاہ بر دوسے زمین دارد  
 کہ خاک لکھو را مردم چشم جہاں بنی  
 مگر در خواب دلند آگہی سلطانِ عالم را  
 کہ سوے شاہ از پیش شہنشاہ ارمغان بنی

غالب نے یہ قصیدہ لکھو کے مجتہد العصر سلطان العلماء سید محمد قبلہ کو ان کی امداد کے لیے بھیجا۔ انھوں نے ذیل کی سفارش کے ساتھ اسے سلطانِ عالم کی خدمت میں پیش کیا:

سلطانِ عالم علیہ السلام

ازاں جا کہ آواز واصل بشارت موصول مبارک خاک شفا  
 از کربلائے معلیٰ برائے ہنگام اقدس و اعلیٰ از ہی بیت السلطنت  
 ہمیشہ آباد تا دارالخلافہ شاہجہاں آباد رسید، اسد اللہ خاں غالب  
 دہلوی کہ در فن شعر و سخن یکنا، در فصاحتِ علم و نثر بے ہتا و مایہ  
 نظیری نظیرے ندارد۔ اگر کلامش مقبول ہارگاہ خاقانی شوق پایے  
 خاقانی باشد۔ دریں ولا قصیدہ غرا در مدح ضریح بطرہ طبع و بیان  
 فصیح انشا نموده و جادۂ مدحت گری و شاکستی ہنگام سکندر شاہ را  
 بقدم اقدام نموده بہ مقام۔

صلتہ جاہت بر بھل من بجاو

تو سلیمانی کن، اے عالی نژاد

...کہ بعد قبولِ تحفہ مؤخرہ ہی گردوں بکھڑو معلیٰ مکرمانندہ۔ لہذا داعی  
 کہ در امورِ خیر ساری می باشد، ہارگاہ فلک جاہ آں را ارسال  
 داشت: مگر قبولِ اقد نہ ہے عز و شرف۔ و چوں حتمیٰ مرثیہ و اشعار

مکیہ است۔ غالب کہ ہوا دے فقرہ شریفہ کہ در حلیہ ثواب  
 بکا و باکی دارد گشت، غفرلہ ذنوبہ دلو کانت مثل۔ باعث غزو  
 غفران لغزش قدم و لغزش قلم کہ در مثنوی ۴۶۵ سابق لائق حالش  
 شدہ بود، گردو۔ رجائے دائم کہ ہوا در بادج ممدوح مورد مرام  
 سلطانیہ و محتایست خاقانیہ از پیشکام تجاہ بودہ باشد۔ وائما خورشید  
 ممدت سمتری از مطلع عظیم خسروی طالع و لامع باد۔ ۴۷۴

سلطان احمد کی سفارش پر بادشاہ نے غالب کو خلعتِ فاخرہ عطا کی، لیکن  
 سلطان احمد کو خیال ہوا کہ دلی کے بادشاہ اور شاہی خاندان سے غالب کے تعلقات  
 ہیں۔ کہیں اس عطیے کا بھیجنا بادشاہ کے حراج کے خلاف نہ ہو اور یہ بات غالب کے  
 مقربہ و حلیفہ کی برہمی کا باعث نہ بن جائے۔ اس خیال سے انہوں نے توقف کیا اور  
 غالب کو لکھا کہ اب آپ جو مشورہ دیں، اس پر عمل کیا جائے۔ اس مضمون کا خط جو  
 سلطان احمد نے دی شدہ ۱۲۷۰ ہجری کو غالب کے نام بھیجا تھا، ذیل میں نقل کیا  
 جاتا ہے:

مشہود خاطر تو وہ کارِ باد کہ بیشتر در پارچِ حمیہ ایہ مکتوب مشر  
 بر ایصالِ سروضہ مع قصیدۂ فریدہ یہ پیشکام سلطانی نوشتہ ارسال  
 داشتہ ام۔ مقلدۂ ایست کہ بھر شریف رسیدہ باشد و دیگر پائش  
 جز نہ رسید۔ بالفعل امر تازہ کہ قابلِ اظہار است این کہ قصیدۂ  
 موصوفہ کہ حضمین دذر غرر آب دار و لالی متلائی شاہوار بود۔ غیلے  
 پسو خاطر مبارک بندگاں داراودہاں افتاد۔ تشریح قبول پہ نیج  
 معمول است۔ یا اعطائے ارسال خلعتِ فاخرہ از ہارگاؤ  
 سپہر اشتہار صادر شد۔ لقا بخیاں این، چوں کہ آن تاخوہد بوستانی  
 نضدانی با ہمہ دودمانی صاحبزادوں در صحت اورنگِ گورگانی تعلق و  
 توشلے دارد، مہادا الجارح این عطیہ شریفہ خلعتِ حراجِ آن بادشاہ

تجاء و باصیت برنگی وظیفہ مقررہ سہی شود، لہذا دریں باب توقف  
مصورہ شد۔ الحال انچہ مشورہ سہی گرای باشد، بعزل آید... بین شہر  
زیقعدہ ۱۲۷۰ ہجری۔

اس خط کے لفافے پر پتے کے طور پر حسب ذیل تحریر درج تھی:  
بعوض و صغوض تعالیٰ در شاہجہاں آباد صیت عن اقصاء، ہاتمل  
سعادت شہل، خاں صاحب والامناقب، عالی مناسب، قادس  
میاوہن سنخوری، ماسی کارنامہ خاگانی و انوری، نجم قدول،  
دیرالملک، اسداللہ خاں غالب بہادر، نظام جنگ ناز مداح  
مفتوح باد۔ ۲۸۵۶

واحد علی شاہ جب ۶ فروری ۱۸۵۶ء کو تختِ سلطنت سے معزول کر کے کلکتے  
میں نظر بند کر دیے گئے تو مرزا نے نظربندی کے زمانے میں بھی ان کے ساتھ مالی امداد  
کے لیے رابطہ قائم رکھا تھا۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ بادشاہ کی طرف سے کچھ دیا تھا کہ  
نہیں۔ انھوں نے جو قصیدہ (شادم کہ گوشے ہمزاد روزگار) بادشاہ احمد علی شاہ کے  
لیے لکھا تھا، اور جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، وہی واحد علی شاہ کی خدمت میں لکھتے بھیجا۔  
اس بارے میں یوسف میرزا کے نام ۲۸ جمادی الاول ۱۲۷۷ ہجری مطابق ۲۸ نومبر  
۱۸۵۹ء کو لکھتے کے پتے پر ایک خط میں لکھتے ہیں:

یہ قصیدہ مدوح کی نظر سے گزرا نہ تھا۔ میں نے اسی میں احمد علی  
شاہ کی جگہ واحد علی شاہ کو بٹھا دیا۔ خدا نے بھی تو یہی کیا تھا۔  
انوری نے بار بار ایسا کیا ہے کہ ایک قصیدہ دوسرے کے نام پر کر  
دیا۔ میں نے اگر باپ کا قصیدہ بیٹے کے نام کر دیا تو کیا غضب  
ہوا، اور پھر کیسی حالت اور کیسی مصیبت میں، کہ جس کا ذکر  
بہترین اختصار اوپر لکھ آیا ہوں۔ اس قصیدے سے مجھ کو عرض  
دیکھا و سخن منظور نہیں، گدائی منظور ہے۔ بہر حال، یہ تو کبر، قصیدہ

پہنچا یا نہیں پہنچا؟ پرہوں تمہارے ماموں کا خط آیا۔ وہ قصیدے کا  
پہنچنا لکھتے ہیں۔ کل تمہارا خط آیا۔ اس میں قصیدے کے پہنچنے کا  
ذکر نہیں۔ اس تفرقے کو مٹاؤ اور صاف لکھو کہ قصیدہ پہنچا یا نہیں۔  
اگر پہنچا تو حضور میں گزرا یا نہیں۔ اگر گزرا تو کس کی معرفت  
گزرا اور کیا حکم ہوا۔ یہ امور جلد لکھو۔ برقعہ علی، پہلے سے نیت  
میں یہ ہے کہ جو شاہِ اودھ سے ہاتھ آئے، حصّہ برادرانہ کروں۔

نصف حسین میرزا اور تم اور سچا۔ نصف میں مقلوں کا عار۔ ۱۹۶۵

مرزا غالب اپنی ناکامی کا ذکر ۱۳ اپریل ۱۸۶۱ء کے خط میں نواب

ملاء الدین خاں ملانی کے نام یوں کرتے ہیں:

مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ میری محسوس طالع کی تاثیر تھی۔

میرا محمود بیٹا نہیں۔ نصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ تین

قصیدوں کے منتحل ہوئے، پھر نہ سنبھل سکے۔ ۱۹۶۵

غالب کو واجد علی شاہ سے بڑی امیدیں تھیں۔ انھوں نے بادشاہ کی کتاب

”بست و ملت افسر“ پر امداد اور صلے کے ناتے سے دیباچہ بھی لکھا جو کلیاتِ غالب

ص ۱۰۸ میں ”دیباچہ نثر موسوم بہ بست و ملت افسر، تصنیف حضرت ملک رفعت شاہ

اودھ“ کے نام سے درج ہے۔ مرزا نے اس تصنیف کے یہ دو تاریخی نام تجویز کیے تھے:

”نثرِ اعظم“ (۱۴۷۱ھ) اور ”ریاضِ ملکِ معنی“ (۱۴۷۱ھ) دیباچہ حکوم مشغی میں ۳۳

شعر پر مشتمل ہے۔ چند شعر یہ ہیں:

ہام ایمن، زہے مجموعہ راز

تکلف آور تر از نیرنگ و انجار

تعالیٰ اللہ کتابے مستطابے

خطِ کفعم فرداں آفتابے

پری پروانہ شمعِ عالم افروز

سو روشن شب و لے روشن تر از روز



بیاضے کانہ راں بین المنصور است  
 تو کوئی سوچے از دریاے نور است  
 ہانا جم چشم، سلطان عالم  
 بجم آئینہ ارکان عالم  
 مزد کہ "تجر اعظم" فی تام  
 کہ از نامش بر آید سال اتمام  
 دگر بایہ ازیں خوشتر گھر سخت  
 "ریاض ملک مستی" ی توں گفت  
 کس بحر بقای مای دیں  
 دعا از غالب د از خلق آئیں  
 شہنشاہ را حیات چارواں باد  
 بہارستان چاش بے نواں باد



## حواشی اور حوالے

۱۵۶ مہاراجہ ایک خانہ دلی میں پیدا ہوئے تھے۔ بعد میں دلی چھوڑ کر اکبر آباد میں جا رہے۔ پھر مجدد آباد  
 جا کر قلوب نظام علی کے دور ہوئے۔ اور تین سو سو جمعیت کے عہدے دار رہے۔ کئی برس تک وہاں  
 قیام کیا۔ اس کے بعد احمد میں راجا بنگلہ اور سنگھ کے ملازم ہوئے اور وہیں کئی ٹرائل میں مارے گئے  
 ("مردے سٹی"، حصہ اول، مہاراجہ بنگالی، دلی، ۱۹۹۹ء، ص ۳۶)۔ اور راج گڑھ میں بہرہ خاک  
 ہوئے۔ یہ تاریخ ۱۹۰۲ء کا زمانہ تھا۔ غالب لکھتے ہیں:

دیں میں کہ محنت گھر میں د جہاں شیم  
 دیں میں کہ کچھ شہ پار میں بہ کارزار  
 د شہ ساگی شہ ام چاکر حضور  
 دگی علی طرازم د دیریں بلید غار



غزلوں کے علاوہ اہل بیت کی تحریف میں قصیدے بھی کیے ہیں۔ ڈاکٹر اظہار گرنے نے ان کے اشعار رشید کا ذکر ("اردو کیلنگ"، ص ۱۶۶) کیا ہے۔ بادشاہ نے "ملت گلزم" کے نام سے سات جلدوں میں ایک ضخیم نکت بھی مرتب کیا تھا۔ اس کی جلد اول و جلد دوم ۱۳۳۶ء میں اور باقی پانچ جلدیں ۱۳۳۷ء میں مطبع سلطانی لکھنؤ میں چھپی تھیں۔ تصنیفات کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مضمون، "ملت گلزم"، مطبوعہ "سچیفت"، لاہور، ۱۹۹۷ء۔

۱۳۵۵ء نصیر الدین حیدر، اردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے اور پادشاہ سے مجلس کرتے تھے ("ڈیرہ ناز"، میر محمد امیر علی خاں، مطبوعہ ۱۳۹۲ء، ص ۱۶۹)۔ "تذکرہ روز روشن"، ص ۱۳۶، "مستمعات جاوید"، جلد دوم، ص ۱۲) پروفیسر مسعود حسن رضوی کے کتب خانے میں پادشاہ کی حدود غزلیں ایک خطوئے "مجموعہ گلزم" میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر اظہار گرنے ("اردو کیلنگ"، ص ۱۶۰) نے ان کے قصائد کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے ان کے مصنفین کی مدح میں کیے تھے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے قصائد کا جو مجموعہ دیکھا تھا، وہ ۶۰۰ صفحات پر مشتمل تھا اور خطوئے کی صورت میں فروغ بخش کتب خانے میں موجود تھا۔ جنرل اظہار گرنے نصیر الدین حیدر مرثیہ بھی کہتے تھے اور مرثیے میں علی حیدر یا علی گھس کرتے تھے۔ ان کا مجموعہ مرثیہ توپ خانے میں موجود تھا۔ بادشاہ کا انتقال ۷ جولائی ۱۸۳۷ء کو ہوا اور اپنی عیال کو چھوٹی ہوئی بیکل کر دیا۔ کوٹلی کے پار، تحصیل شہید ڈگری کالج، دفن ہیں۔ ("نجات جبرت"، ص ۷۱؛ "روز روشن"، ص ۱۶) دکنک لکھنؤ نے تاریخ کیا:

کیا چاہ مہدی دیا باد  
کیا حشمت و جاہ اقبال آں  
شدہ مرقدش کربانے جد  
رہے عزت و جاہ اقبال آں  
وہم صبر و تاب و فت  
نہی شکستہ و حال آں

(دیوان دکنک، مطبوعہ ۱۸۴۷ء، ص ۳۶۳)

۱۳۵۷ء کلیات غالب (نظم)، ص ۳۵

۱۳۵۸ء نصیر الدین حیدر غائب الہی مٹھری میں تاریخ الامکان تھے اور تمام مہدی آثار شاہی کی حاجت سے خود کو نامہ مہدی کہتے تھے۔ ذیل کا شعر سنئے پر کھنکھاتا:

سے دو پریم وند از فصل حق علی الہ

غائب مہدی نصیر الدین مہدی بادشاہ

("مطالعہ آثار تاریخ"، از ولیم ٹیل، مطبوعہ ۱۸۶۷ء، ص ۳۸۵)

۱۵۵۵ء غائب روشن فزاں، محمد حسین خاں، ہم، معرفت مرزا تھو۔ غائب اشرف علی خاں کے بیٹے تھے۔ غائب حکیم مہدی علی خاں حکیم فزاں (موتی ۱۸۳۷ء) کی مسخروں کے بعد ۳ بجائی ۱۸۳۸ء (۱۸۳۷ء) کو نصیر الدین حیدر کے ودم ہوئے تھے ("نصیر الدین"، جلد اول، ص ۳۳۸)۔ روشن فزاں بہادر کا انتقال ۱۳۶۹ء (۱۸۵۷ء) میں ہوا۔ خیر شکوہ آبادی نے تاریخ کیا:

روشن فزاں بہادر فرد

وہر شد بزم عزاء ہے ہے حبیب

بادشاہان پہ غرض وہ شمع  
 زبانِ امرا ہے ہے چلے  
 گشتِ غرضیہ وزارت ہے اور  
 چہ شد آں جہدِ غلا، ہے ہے چلے  
 وہ علمِ حضرتِ کاتبِ بام  
 بر زبانِ دلِ ما، ہے ہے چلے  
 کسبِ اہیِ مصرعِ جہدِ حقیر  
 ہلے فر اور ما، ہے ہے چلے = ۱۳۶۹ء

(”مکتبہ الامضاء“، ص ۱۳۷)

۱۶۵۔ یہاں علی خان: ان کا اصلی وطن ہنس بریلی تھا۔ وہاں سے نکلتے آئے۔ پھر کسی سی و سٹارٹ کے اپنی ذاتی قابلیت سے قازی الدین حید بادشاہ کے انتخابی مقرر ہوئے اور جہدِ غرضیت سے بہنِ دشمنک تعلیم دی۔ ان کا نام ان سلاطینِ اودھ اور برطانوی جہد میں سوز و محاز رہا تھا۔ تفصیلی حالات ”ڈیمپسٹر“ میں درج ہیں۔ بادشاہ قازی الدین حید مصحف کا ہے جہدِ احرام کرتے تھے۔ انھوں وزارت میں کوئی جہد قبول نہیں کیا تھا۔ اسی کی سفارش سے آقا میر وزیر ہو گئے تھے۔ ان کا انتقال ۱۳۶۳ء (۱۸۴۷-۴۸ء) میں ہوا۔ حیدر شاہ آبادی نے تاریخ کیا:

صورتِ رطبِ یہاں علی خان کے سبب  
 کہے ہیں جہد کے سب اہلِ منشا ہے ہے دے  
 مطلق و علمِ کام و ادب و حق و صحت  
 کہتے ہیں جو کہے ہم ہے سر و پا، ہے ہے دے  
 مسو و ادب دی ہو گئی خالی، انھوں  
 آج ہے کہ ہیں ملک و امرا، ہے ہے دے  
 زبِ افراسے یہاں ہو کہے وہ گھٹیا نہیں  
 خاکِ اڑتی ہے یہاں باو ما، ہے ہے دے  
 مجھ سے رہیں نے کہا مصرعِ جہدِ حقیر  
 تھو دہر ملا اٹھتا، ہے ہے دے

۱۶۷۔ قنایت، عزم، ص ۱۱۱۔

۱۸۶۵۔ ایضاً، ص ۱۷۶۔

۱۹۶۵۔ تھو کے سلسلے میں ”قنوت اور اودھ اخبار“ دیکھیے۔

۲۰۶۵۔ مظفر قزول: قاتب کے بزرگ دوست قزولاب حمام الدین حید خان قاتی کے بڑے صاحبِ زادے تھے۔ ان کا نام میرزا سیف الدین خان بہادر عرف کاتب مظفر قزول سبب جنگِ بامرالکھ: قدوس کوڑا گئی میں گولی سے مارے گئے۔ مظفر قزول کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو ”قاتب“ کے ایک مکتوب علی مرتضیٰ سیف میرزا بامرالکھی ”طبیب“ ”بہری زبان“ دہلی، عازرہ تم جلدی و ۸ دسمبر ۱۹۹۷ء۔

۲۱۶۵۔ ”مردوں سے سنی“، جلد اول، سنی بھائی، دہلی، ۱۸۹۹ء، ص ۶۷

۳۵۵: امیر علی شاہ سلطان عالم واجد علی شاہ کے واقعہ گرامی ۳۳ سال کی عمر میں ۵ ربیع الاول ۱۱۵۸ھ کو قتل ہوئے ("دربارہ"، ص ۸۳)۔ "تاج دارنگ مہارک جنگ" سال بتاؤں ہے۔ انکا درجے کے پانچ سو و سترہ تھے۔ ان کا انتقال ۳۶ مئی ۱۲۶۳ھ (۳۳ فروری ۱۸۴۷ء) کو عمر ۳۹ سال پانچ ماہ اور بارہ دن ہوا۔ امیر نے تاریخ لکھی

شاہ عادل، نیک طینت، نیک سیرت، نیک نو  
 ترک دنیا کرد و در دلبا نلیاں شد حق  
 از سرش غیب پرستیم بے تاریخ و مات  
 محنت، شد امیر علی جنت مکان حاصل کن  
 (مختصر دیوان امیر)

۳۵۶: شفیق محمد سعد الدین خاں نام، چاب نگار، النور اللذیہ خطاب۔ ان کے والد افضل اللذیہ امیر علی خاں بہادر عرف میرنو تھے۔ نواب مازی الدین خاں صاحب نظام الملک آصف جاہ کی تولد میں سے کامی کے رہنے والے تھے۔ پہلے سید امیر علی خاں اور بعد میں غالب سے ملوث کیا۔ "نثر فیض" ایک تفری رسالہ اور دیوان اور ایک مثنوی یادگار ہیں۔ ان کی تصانیف بارہ و کم باب ہیں۔ مثنوی کا ایک مکتبہ لکھنؤ میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ ۱۸۸۱ء مطابق ۱۲۹۸ھ میں انتقال کیا۔ ("مطالعہ چاب"، ص ۱۷۱)

۳۵۷: "اسرارے حق"، مئی ۳۳-۳۴

۳۵۸: میر ابو حسین عیسیٰ شاگرد غالب۔ عیسیٰ نے غالب کی لودا کے لیے واجد علی شاہ کے دربار میں بڑی کوشش کی تھی۔ زیادت قدر میں لکھنؤ میں بارے لکھے تھے۔ ان کے تھمر حالات "بارہ و در" کے مضامینات میں دربار میں عابدی نے لکھے ہیں۔

۳۵۹: بارہ و در، ص ۱۷۵

۳۶۰: بارہ و در، تحقیق جلد ص ۹۲

۳۶۱: لقب اللذیہ علی خاں نام تھا، دلی کے کہتے تھے۔ خاندان اب بھی دلی میں موجود ہے ("غالب"، نظام رسالہ جلد ص ۲۱۶)۔ لکھنؤ آنے تو سلطان عالم واجد علی شاہ نے مروج لکھا اور کاب صاحب اللذیہ کے خطاب سے ترغیر کیا۔ وہ بادشاہ کے خاص صحابہ میں سے تھے۔ اس خط سے غالب کی مطلق اور مجبوری پر خاصی روشنی پڑ سکتی ہے۔

۳۶۲: بارہ و در، تحقیق جلد ص ۸۷

۳۶۳: بارہ و در، تحقیق جلد ص ۹۱-۹۲

۳۶۴: نواب امین اللذیہ وہ پہلے امیر علی شاہ بہادر کے درم تھے۔ ان کے انتقال کے بعد واجد علی شاہ کے درم ہوئے۔ موصوف بنے دیں دارہ پانچ شرح اور جاکھانی لہجہ کے مستند تھے۔ امین آباد کی بنیاد انھیں نے لکھنؤ میں ڈالی تھی۔ اس کے علاوہ کرپاے میر خاں کے حاصل مہاس حکم دار کے مرتد کی شیعہ کی بنیاد ۱۲۶۶ھ (۱۸۵۰-۵۱ء) میں میر واجد علی شاہ دلی تھی۔ نواب امین اللذیہ کا انتقال ۱۸۵۶ء میں واجد علی شاہ کے زمانے میں ہوا۔ اپنی کرپا میں دلی ہیں ("تھیرا تاریخ"، جلد دوم، ص ۱۵۵)

۳۶۵: نواب حسین میرزا نواب حسین میرزا عرف سید ذوالفقار الدین نام۔ نواب مظفر اللذیہ مرحوم کے

پورے بھائی تھے۔ ۱۸۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ خود میں انہوں نے بڑی تکفیز اٹھائی تھی۔ ۱۲۰۶ھ (۱۸۸۹ء) میں انتقال کیا۔

۳۳۵۱ اسکندریہ دار و دیگر سلطانِ عالم واد علی شاہ کے مصاحبین میں تھے۔  
 ۳۳۵۲ حیدر علی، سید مظفر حسین نام، دہلی ادب میں میر حیدر کے نام سے مشہور ہیں۔ جگر لکھنوی، میر حیدر نے مرثیہ گوئی میں نام پڑا کیا تھا۔ تصانیف کے لیے راجہ کی کتاب ”میر حیدر: تحقیقی مطالعہ“ ملاحظہ ہو۔ حیدر کا انتقال ۱۲۵۲ھ (۱۸۵۵ء) میں ہوا۔ مرزا قاجار علی بیگ مرثیہ سرکاری و خصوصی میں جاری نہیں کئے۔  
 (”ذیقات مرثیہ“، سالِ تصنیف: ۱۲۸۷ھ، ص ۴۷۹)

مرثیہ گو جناب میر حیدر  
 جن کا شہرہ یہاں میں ہے ہر نہ  
 تھا مظفر حسین نام ان کا  
 ذاکر ذکر حق تھے گھر  
 اور مدافع حیدر کرد  
 دل دلائے غلی سے قاضی  
 نوے جنت گئے جو وہ اسے سر  
 خاتہ فکر کے ہے آئسو  
 جبری و بیوی کھسی تاریخ

جا کے حیدر سے علی حیدر اب تو  
 $\frac{۱۲۵۲}{۱۸۵۵}$

۳۳۵۳ ادب میرزا محمد علی خان نام، عرف آغا حیدر، خطاب و دیگر دار و دیگر بیگ خان بہادر۔ رئیس اعظم لکھنؤ، میرزا محمد علی خان قرنی ٹپل بیگ کے بیٹے تھے۔ صاحب دیوان شاعر اور برقی کے شاعر تھے۔ ان کا مکتوب دیوان نور نام باب ہے۔ ایک نادر سلطانِ اودھ میں لکھا تھا۔ خدا جانے، وہ اب کہاں ہے۔ دیگر دار و کا انتقال ۱۲۷۰ھ (جبری میں ہوا۔ دیوان امیر لکھنوی، مکتوبہ ۱۸۷۰ء، ص ۳۸) میں تاریخ دیا ہے:

دیگرے کہ از دہلیس بود شہرت  
 تھانے کہ مشہور بہ نام حیدر  
 تاریخ دہلیس نما کرد ایک  
 کہ جا یافت حیدر قرب بخیر

۳۳۵۴ تاریخ، مرزا قاجار، ص ۳۸

۳۳۵۵ ایضاً، ص ۳۵

۳۳۵۶ پروف میرزا کے تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو راجہ حروف کا مضمون ”دہلی قزاقان“ جی دہلی ٹائمز، ۱۹۹۷ء۔

۳۳۵۷ غلط۔ پاشیدہ مہاراجہ شاہید است علی کی راکر بادشاہان و بادشاہان حمایت کی کہہ۔ روزِ ازل دستار بر سر  
 چھوڑا، چاند بر چاندے چاند پاشیدہ و کمر بند در گردان امانتِ سلیم کی کہہ و تا سرِ روز یہ ہمیں آئیں  
 بکھری آج، آج سے آج سے آج سے دیکھ کی پاشیدہ و غلط سرِ دیکھ واد۔ دیکھ ازل شخص پارچہ کی ہاشم،  
 تھا غلط حمایت است از دستار و چاند و کمر بند و پارچہ دیگر حمایت است از سرِ چاند و لایب و کمر  
 آئیں و اسی قسم غلط یہ محمد بنے سلطنت است۔ (سفرنامہ آئسو نام لکھنؤ، سالِ تصنیف ۱۱۵۶ھ

مرتبہ (ڈاکٹر سید اعظم علی، ص ۱۲۵)

۳۰۵۵ "مردوں سے" ص ۲۵۹

۳۰۵۶ "ایضاً، ص ۱۷۷

۳۰۵۷ اصل: پاکر

۳۰۵۸ دیانت سے مراد قواب دیانت اللہ اولیٰ غلام سرا تھے۔ بادشاہ دہلی شاہ کے حواج میں بڑا دخل تھا۔ پہلی نام میاں حسین تھا۔ کھنچا پہ عمر بہت ساگی بڑھاپہ دلی مہدی حضرت دہلی شاہ بخدیج شاہ ممدوح ظالم ہوئے اور تا زمانہ دلی مہدی بالصرام کار مضافہ و حلقہ خود و انگریزی رسالہ و انصرام فرانکات مستعد و سرگرم و مورد حسن و تحفظات و ترقی و درجات رہے اور پانچ اعتبار و اعتبار اس قدر بڑھا کہ محمد مستوفی خاں خطاب ظالم مدت وہ سال لام تحت بعضی سلطنت حضرت بادشاہ میں روز بروز بجلدی حسن خدمت ترقی پاتے رہے۔ عمارت قیصر بارگ و سکھر بارگ و دیگر چارے خانہ و فرانکات و بیڑ حیات و انگریزی رسالہ باڈی گارود ظالمین و قواب خانہ و دیگر کارہائے جلیلہ حلقہ رہے کہ جس کے حسن انجام و عقیدہ شیر خواہی و دیانت و امانت سے طالب پہ خطاب دیانت اللہ اولیٰ بہادر شہرین الملک ہوئے اور وہ موشع اسمی و بھواد طراح امداد موبہا معالی مضا ہوئے اور حلقہ قواج کو برواہ و قبولیاد قواعد آراستہ و جہاں کیا جس کے معائنہ قواعد سے بحث صاحبان اگرچہ خوش ہوتے رہے۔ موصوف رفاقت و وفاداری کو منظم کچھ کہ ہم کتاب حضرت بادشاہ لکھتے گئے اور نقد فوٹ و دیم میں بھی شریک جس اُس وقت ہوئے کہ جس وقت کسی اہل کار نے رجحانہ دیا اور سب نہ پوچش ہو گئے۔ چنانچہ حضرت بادشاہ اپنی تعریف میں اس امر کی تصدیق فرماتے ہیں:

جہاں تھا وہ ہے محل زکری ککو  
و گاڑی کے پیچے چڑھا خوش نہاد  
دیانت بھی اسی طرح سے تھا سہر  
کہ جس طرح پندانہ ہو شش ہے  
(ماخوذ از "مردہ اخبار")

خرید تعلیمات "مردہ اخبار" لکھنؤ، جلد ۷، نمبر ۲۵، مطبوعہ روز سہ شنبہ ۳۰ جون ۱۸۶۵ء، صفحہ ۲۲۵ میں درج ہے:

۳۰۵۹ مریم عکالی۔ بادشاہ قادی الدین حید کی زوجہ بادشاہ حکیم کا خطاب ہے۔ ان کا انتقال ۱۲۶۶ھ (۱۸۴۹ء) میں ہوا۔

۳۰۶۰ "قیصر التوحش"، جلد دوم، ص ۳۳

۳۰۶۱ "کتاب کی ایک نگارہ فخر شوی" مشکوٰۃ "نگارستان ادب"، مطبوعہ ۱۹۶۹ء، ص ۱۹۲ تا ص ۲۰۲

۳۰۶۲ "مخبر" دلی، مشکوٰۃ نگار سید مسعود حسن رضوی، بابت ۲۵ دلی تا تاریخ ۱۹۷۳ء، ص ۵

۳۰۶۳ "ایضاً، ص ۶

۳۰۶۴ "مردوں سے" ص ۲۶۱

۳۰۶۵ "خطوط کتاب"، شش ماہی پشاور، ص ۳۲۳



## غالب اور ان کے قدردان حسام الدین حیدر خان (مع خاندان کے شعرا)

غالب کے ایک بزرگ اور مہربان دوست نواب میرزا حسام الدین حیدر خان  
ہی فیض آبادی (م اکتوبر ۱۸۳۶ء) لکھنؤ کے رئیس اعظم اور امیر کبیر تھے۔ وہ نواب  
شہار علی ولد بہادر (م ۱۷۷۷ء) کے قرابت داروں میں تھے۔ دلی میں ملی مدارس میں  
ایک بڑی اور شان دار عہدہ میں رہتے تھے۔ یہ محلہ اب تک عہدہ حسام الدین کے نام  
سے مشہور ہے۔<sup>۱۵۱</sup> غالب ہائی کے بڑوں میں قیام پذیر تھے۔ وہ نواب صاحب کا بے حد  
احترام کرتے تھے۔ دونوں میں گہرے اور مربوط تعلقات تھے۔ نواب صاحب ہی کے  
زیر اثر غالب نے منصب اشاعری قبول کیا تھا<sup>۱۵۲</sup> کلیات بحر غالب سے معلوم ہوتا ہے  
کہ ہائی ہی نے غالب کا تعارف شاہان اودھ سے کرایا تھا۔<sup>۱۵۳</sup>

جب غالب کسی انگریز سے ملنا چاہتے تھے تو ہائی ہی ان کی سواری کے لیے  
خوش کا اہتمام کرتے تھے۔ غالب اس کا ذکر ایک خط میں یوں کرتے ہیں:

جناب نواب صاحب، قبلہ و کعبہ دو جہاں مدظلہ العالی۔

آداب کورٹس بجا آوردہ معروض می دارو۔ بندہ امروز آہنک  
ملاقات کیے از صاحبان انگریز دارو۔ لیکن آنجا کہ مسکنش حیدر خان



غالب اور ان کے قدردان حمام المدین حیدر خان (ساحبِ دہلی کے شعر)

چھاؤنی قریب کھلدار خانست۔ رہے از سطوت آفتاب مہر دلو خیل  
ہراساں است۔ اگر بخش عنایت گردد در سایہ عطوفت رہگزارے  
مذہبائی تو اس گردید۔ مگر القاس ایکہ وقت ملاقات دیکھو روز  
برآمدہ قرار یافتہ است۔ یہ کہاں فرماں رود کہ ہر گاہ آدم ظالمانے  
بیایہ یہ بھپائے اور برآمد۔ آں وقت آں جناب در خواب راحت  
خواہد بود۔ ۴۵

نانی مرزا غالب کے تخلص مددگاروں میں بھی تھے۔ قرض کے لین دین میں  
وہ غالب کے مسابین اور وکیل تھے۔ اور انہی کے توسط سے امداد جیت اور پیرا لال  
ساہوکاروں سے قرض وصول کرتے تھے۔ ایک خط میں نانی کو لکھتے ہیں:

اسد اللہ دام پرست شامت و سریش تو انکیش بدست شامت۔ عالیہ از امداد  
تک دتی دلریش در امداد بکار غولیش است۔ دستش کیرید و بہ ہزار روپیہ دیکر بکارش  
آئید۔ سی شا خالص خواہد رفت و سودمند خواہد افتاد۔ ۵۵

حالی نے نانی کے حوالے سے ایک روایت بیان کی ہے کہ نانی مرزا غالب  
کے بچپن کے دوستوں میں تھے اور انہوں ہی نے غالب کے لڑکپن کے اشعار الہیم خن  
کے بادشاہ میر تقی میر کو اخیر عمر میں دکھائے تھے۔ جب میر نے غالب کے اشعار سنے تو  
یہ پیشین گوئی کی:

اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے  
رستے پر ڈال دیا تو لا جواب شاعر بن جائے گا، ورنہ کھل بکھن  
کھے گا۔ ۶۵

غالب نانی کے حسن اخلاق، ہم دردی اور راست گوئی سے اتکا کھاڑ ہوئے  
تھے کہ ان کا ذکر خیر مثنوی ”چراغِ دہر“ میں یوں کرتے ہیں:

چو حزن بازوئے ایمان تویم  
حمام مدین حیدر خاں تویم

غالب کے سر پر بزرگوار نواب الہی بخش خاں معروف (م ۱۸۴۶ء) تائی کے مخلص دوستوں میں تھے۔ معروف نے اپنے دیوان میں ایک پوری غزل تائی کے نام نذر کی۔ غزل کا مطلع اور مقطع پیش کیے جاتے ہیں:

جو آؤ تم مرے مہماں، حسام الدین حیدر خاں  
کروں دل نذر، جاں قرباں، حسام الدین حیدر خاں  
دل معروف سے میری محبت کیوں نہ ہو نکاہر  
رہے کیا دل میں بو پنہاں، حسام الدین حیدر خاں

تائی شعر بھی کہتے تھے۔ ان کے دیوان کے دو نسخے اچھی حالت میں محمود آباد ہاؤس (قیصر باغ، گلشن) کے نادر الوجود کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ ایک نسخہ تائی کے صاحب زاوے نواب ذوالفقار الدین حیدر خاں عرف حسین میرزا کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس کی ابتدا میں مرزا غالب کا دیباچہ بھی شامل ہے۔ دیباچے میں غالب نے تائی کے اخلاق و عادات اور درویشانہ طبیعت پر خاصی روشنی ڈالی ہے۔ غالب کے دیباچے کے آخری الفاظ یہ ہیں:

کہیں پرش آں فرخ نربغ تابیوں... فرزادے بے ہمتا محمد الامرا  
محمین اللہ ملہ صغیر الملک سید ذوالفقار الدین حیدر، نکاحات خان  
بہادر ذوالفقار جنگ الشتر بہ حسین مرزا نگر آہودن آں گھر ہائے  
پراگندہ ہمت گماشت و غالب پریشاں روا بہ الکاشغری دیباچہ  
فرمان داد۔ تا نکندہ نامہ را فرمان کرد آئندہ چاہد بر جان و دل  
روائی گرفت بر گنج باد آہود را ز دل نشیں فہرستی ہشت آہ۔ و بر  
در گنجینہ دل کشا پردہ فرد ہشت شد۔ یارب ایں گفتار را در شہرت  
روائی و کرد آئندہ را حیت ابدانی باد۔

دیوان تائی میں ۲۱۱ غزلوں کے علاوہ مطلع و اقرا، مثنوی، جنس، سلام، ہجرا، ہنگام، قصیدہ، راہنمائی اور قطعات کے دیگر اصناف بھی موجود ہیں۔ آخر میں

۱۲۱۵ ہجری تک چند اہم تاریخیں ہیں۔ دیوان کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے:

نہ حق حیدر خالق کر سکی طبع رواں پیدا  
بجائے ہر غنی موتی پہ ہو کر سو زباں پیدا  
محمدؐ باعث ایجادِ عالم گر نہ ہوتا تو  
دش کیوں خلق اور کاسے کو ہوتا آسماں پیدا

دیوان ذیل کے تاریخی قصبات پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ یہ سبھی تاریخیں اہم ہیں:

تاریخ وفات میر محمد تقی مرحوم و مدفون، انجمن پیر: میر  
چوں مضمون ز خاطر روزِ رفتِ میر  
ہمکب ہوا قری سچے سرائے  
چہ سالِ تاریخ دے  
کہ "از استادِ سخن دئے دئے"  
جہاں ۱ ۲ ۲ ۳

تاریخ وفات نواب میرزا محمد مقیم ابوالصور خان بہادر صفدر جنگ مدفون کہ  
حسب الحکم خاڑی الدین حیدر خان بہادر شاہ زمان مدفون بادشاہ اودھ گفتہ شد و بر مقبرہ  
شان کندہ گردید۔ قطعہ:

چوں آں صفدر عرصۂ مردیش  
بدارِ فنا گشت رحلت گزیش  
چہ سالِ تاریخ او شد رقم  
کہ "بادا مقیم بہشت بریں"  
۱ ۲ ۳ ۴

قطعہ تاریخِ فخر خانہ درگاہ حضرت شاہ مرداں علیہ السلام:

چوں کہ صادق علی بتائے رفیع  
ساخت بر آستانہ حیدر

## سال تارخ آں بتا تائی گفت "نقار خانہ حیدر"

دیوان کے آخر میں نواب میرزا حسین کا ترقیم اس طرح درج ہے:  
دیوانی اعجاز بیان جناب والد ماجد نواب مبارک اللہ ولد ممتاز الملک،  
سید حسام الدین حیدر خان بہادر حسام جنگ، بیاد جناب مرحوم،  
امیر احقر العباد، سید ذوالفقار الدین حیدر المعروف بہ حسین  
میرزا۔ از دست خود تحریر نمود و بتالیف الٰہی تارخ نوروز جم ماہ  
رجب المرجب ۱۲۸۸ ہجری مطابق ۱۱ جم اکتوبر ۱۸۷۱ء عیسوی روز  
پنج شنبہ دوشنبہ شاہ جہاں آباد باتمام رسید۔  
ترقیے کے بعد حسین میرزا کی مر اس طرح چپاں ہے:

۱۲۵۲ ہجری  
خان بہادر ذوالفقار جنگ  
سید ذوالفقار الدین حیدر جنگ  
مصلحین اللہ ولد مسعود الملک

حسام الدین حیدر خان <sup>رحمۃ اللہ علیہ</sup> تائی کے حالات زیادہ نہیں مل رہے ہیں۔ ان کی  
ولادت فیض آباد میں ہوئی۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نشوونما اور تعلیم و تربیت  
بھی وہیں ہوئی۔ فیض آباد سے لکھنؤ اور پھر کچھ عرصے کے بعد لکھنؤ سے فیض آباد گئے۔  
وہ اپنے زمانے میں رئیس اعظم اور غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے۔

تائی بادشاہ اکبر شاہ دہلی (م ۱۸۳۷ء) کے عہد سلطنت میں ممتاز حیثیت اور  
مصب اہلی پر فائز تھے اور ان کا شمار دہلی کے امرا میں ہوتا تھا <sup>۸۵</sup> سرور کہتے ہیں کہ  
تائی نواب شجاع اللہ ولد بہادر (م ۱۷۷۵ء) کے قرابت داروں میں تھے۔ جب ان کی  
والدہ ماجدہ کا انتقال ہوا تو تائی کے والد نواب سراج اللہ <sup>۸۶</sup> نے نواب

نواب اور ان کے قہرمان مہم الدین حیدر خان (سب خاندان کے شہر)

ذوالفقار اللہ ولد میرزا نجف خان (۱۸۲۴-۱۸۷۱ء) کی بیٹی سے عقد کیا۔ نواب سید محمد خان رحمہ ان کے بہن سے تھے۔ تائی کو علاقائی والدہ کا سلوک پسند نہ آیا۔ اور وہ لکھنؤ سے نکل کر دلی چلے آئے۔ یہاں اکبر شاہ ثانی کا زمانہ تھا۔ انھوں نے سات گاؤں کی جاگیر کے علاوہ دربار میں عہدہ بھی دیا۔ لکھنؤ سے بھی خاصی رقم ماہوار مل جاتی تھی۔ نقد روپیہ بھی کافی ساتھ لائے تھے۔ دلی میں چائیداد خریدی۔ شاہانِ اودھ کی دلی دلی چائیداد کا انتظام بھی انہی کے سپرد تھا۔

تائی کی شادی نواب سیف اللہ ولد بخشی الملک نجف علی خان بہادر مظفر بجک کی صاحب زادی کے ساتھ ہوئی۔ خوش دامن صاحب کا نام صدرالشاہیک (م ۱۸۰۸ء) تھا۔ دیوانہ تائی کے آخر ان کی تاریخ وفات مندرج ہے۔

تائی اوصافِ حمیدہ اور اخلاقی پسندیدہ کے مجسمے اور اتحاد و ارتباط کے دلداد تھے۔ قاسم ان کے ترجمے میں لکھتے ہیں:

وے جمانے است رعنا، زینا مظهر، نیکو مضر، نکلند جبین، غرارت  
آگین، سخن سنج، بذل گو، نکتہ چرا، کشادہ رو، گرم جوش، خوش مزاج،  
یکسر سرور، سر بسر ابتہاج، نہایت صاحب شعور و ہوشیار، بغایت  
نیک طبیعت، ذوالنہار<sup>۱۱۵۶</sup>

تائی کا انتقال ۳ اکتوبر ۱۸۳۶ء مطابق ۲۲ شوال ۱۲۶۲ھ کو بیمارستان قاری ہوا۔ دلی میں علی گنج میں درگاہِ قدم مبارک کے چبوترے میں دفن ہیں۔<sup>۱۱۵۷</sup>

تائی کی اولاد: تائی کی تین اولادیں تھیں۔ دو بیٹے مظفر اللہ اور حسین میرزا اور ایک صاحب زادی قدسیہ بیگم عرف حسینی صاحبہ ان کی شادی مرشد آباد کے عالی خاندان امیر محمد نسیر عرف نواب جان سے ہوئی تھی۔ نواب جان زیادہ تر لکھنؤ میں رہے تھے لیکن قدسیہ بیگم نے زندگی کا بڑا حصہ دلی میں گزارا۔ نواب جان ۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد بھارت کے جرم میں ماخوذ ہوئے تھے۔ ۱۸۵۹ء میں باقاعدہ سے گرفتار کر کے لکھنؤ لائے گئے۔ پہلے جس دوام کو سزا ملی، لیکن بعد میں ۱۸۶۰ء میں پھانسی میں

جدیل ہو گئی۔ یوسف میرزا انہی کے بیٹے تھے جن کا ذکر آگے آئے گا۔ قدسیہ بیگم مظفرآباد سے چھوٹی اور حسین میرزا سے چار سال بڑی تھیں۔

مظفرآباد: ان کا نام میرزا سیف الدین تھا۔ نواب مظفرآباد، ناصرالملک، خان بہادر سیف جنگ خطاب۔ جناب مالک رام صاحب <sup>۱۳۵۱</sup> اور جناب اکبر علی خان مرثی زادہ <sup>۱۳۵۲</sup> کہتے ہیں کہ حسین میرزا صاحب ۱۲۲۳ ہجری (مطابق ۱۸۰۸ء) میں پیدا ہوئے اور وہ مظفرآباد سے ۱۳ سال چھوٹے تھے۔ ان دونوں کے حساب سے مظفرآباد کی تاریخ ولادت ۱۲۰۹ء قرار دی جاسکتی ہے۔ حسین میرزا کی تاریخ ولادت معلوم نہ ہو سکی۔ البتہ مالک رام اور مرثی زادہ نے مظفرآباد کی جو تاریخیں پیش کیں ہیں ان سے وہ دست نہیں۔ اگر ان دونوں کا مانعہ "حمام الدین حیدر کے خاندانی حالات" ہے، پھر بھی غلط ہے۔ دراصل مظفرآباد ۱۲۲۰ء (۱۸۰۵ء) میں پیدا ہوئے۔ دیوانہ نامی میں تاریخ اس طرح درج ہے:

تاریخ تولد نواب مظفرآباد ناصرالملک میرزا سیف الدین حیدر  
خان بہادر سیف جنگ:

جب خدا نے مجھے دیا تائی  
جب یلدائے آلود کا بد  
کئی تاریخ اس کی تب میں نے  
ارشد و ارجند و صاحب قدر  
ہجری

دوسری تاریخ تتر میں یہ ہے: "ہے عطائے شیر خدا" (۱۲۲۰ ہجری)

مظفرآباد نے کبھی کوئی مشغولیت قبول نہ کی اور اپنی جائیداد پر امیرانہ مزاواقت جاری رکھی۔ <sup>۱۳۵۱</sup> ان کی شادی شمس آقا خان بخشی لہراک بخشی محمود خان کی صاحب زادی عالیہ بیگم سے ہوئی تھی۔ جب خدو ہوا تو مظفرآباد کو اپنے چھوٹے بھائی حسین میرزا کے حلقہ سخت تشویش ہوئی۔ ہندوستانی سپاہ تمام امور پر قابض ہو چکی تھی۔

حسین میرزا اور خود بادشاہ بے بس تھے۔ جب انگریزی سپاہ دلی میں داخل ہوئی تو مظفر قلعہ دہ دوسرے لوگوں کے ساتھ اللہ چلے گئے جہاں کا راجہ لہن کا دوست تھا۔ اللہ میں وہ پکڑے گئے اور گھوڑ گاؤں میں انگریز فوجوں نے بغیر مقدمے کے انہیں دوسرے لوگوں کے ساتھ گولی مار کر شہید کیا۔

مظفر قلعہ دہ اور ان کے مہمانی عالم کی مسابقتی میں ایک بڑی حویلی میں رہتے تھے۔ حویلی پہلے غدر میں لوٹ لی گئی اور پھر نذر آتش کی گئی۔ عالم کو اس حویلی کے لٹ جانے اور بعد ازاں اسے خاکستر کرنے پر بے حد صدمہ ہوا اور انہوں نے اس دل خراش واقعے پر خون کے آنسو بہا دیے۔ تفصیلات ”دہلی“ (۳۱-۳۲) مطبوعہ صد سالہ یادگار عالم کمیٹی میں درج ہیں۔ جب عالم کو مظفر قلعہ دہ کی شہادت کی خبر ملی تو انہیں بے حد قلق ہوا۔ یوسف میرزا کو ایک تقریبی خط میں لکھتے ہیں:

اے میری جان! اے میری آنکھیں...

تا تانی کے مرنے کا ذکر کیوں کرتے ہو۔ وہ اپنی اہل سے مرے ہیں۔ بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے۔ کیا تم چاہتے تھے کہ وہ اس عہد میں ہوتے اور اپنی آہدہ کھوتے۔ ہاں، مظفر قلعہ دہ کا غم من مغلہ واقعات کہلائے مغل ہے۔ یہ داغ ماتم جیتے جی نہ مٹے گا۔<sup>۱۵۵</sup>

مظفر قلعہ دہ کی طرف سے ایک کتاب ”حلیق اثامشری“ (۱۲۵۵ھ) منسوب ہے۔ اس کا تاریخی نام بھی ہے۔ جس کتاب سے یہ ترجمہ کی گئی اس کا نام ”رسالہ سفیہ“ تھا اور اس کے مصنف سید مہدی علی تھے۔ سید حسام الدین حیدر خان نے اہل کتاب کا تاریخی نام ”صاحب شرع شریف“ (۱۲۳۱ھ) رکھا تھا۔ ”حلیق اثامشری“ کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس لندن میں موجود ہے۔ ابتدا اس طرح سے ہوتی ہے:

الحمد للہ رب العالمین کہ اس نے آپ اور آتش اور باد اور خاک

سے آدم بنایا اور بہت پسند آیا تو اسے اشرف المخلوقات فرمایا اور  
خلعت رسالت کا عطا کیا اور ابوالبشر آدم صلی اللہ علیہ کا خطاب  
دیا۔<sup>۱۱۵۶</sup>

مظفر اللہ کی اولاد کے بارے میں معلوم ہوا کہ ایک لڑکا تھا جس کا نام محمد  
میرزا تھا۔ عالم نے سجاد میرزا کے نام ایک خط میں ان کا ذکر کیا ہے۔

حسین میرزا: سید ذوالفقار الدین حید نام، عمدة الامراء، معین الدولہ،  
مصدق الملک، نکات خان بہادر ذوالفقار جنگ خطاب، عرف حسین میرزا۔ وہ تائی کے  
چھوٹے صاحب زادے تھے۔ ان کی شادی ضمیر اللہ ولی جلیل الملک، افتخار الامراء احمد حسین  
نکات خان بہادر مستقیم جنگ کی صاحب زادی جہاں آرا بیگم عرف حسینی بیگم سے  
ہوئی۔ خسر کے انتقال کے بعد شاہی نکات کا عہدہ حسین میرزا کو ملا، جس پر وہ غور  
نک فائز رہے۔ ان کی عزت و تعظیم کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ بادشاہ کی  
خواہی میں بیٹھے تھے<sup>۱۱۵۷</sup> جب غور ہوا تو وہ لواحقین کے ساتھ پہلے صندوق جنگ کے  
مقبعرے پر چلے گئے اور کس حالت میں؟ امیری و دواڑے سے لے کر مقبرے تک چار  
پانچ میل کا فاصلہ ہر گاہ چلے گئے کرنے میں دس ہزار روپے کی رقم ٹھیرے گوجروں کے  
حوالے کرتی پڑی۔ پھر نواب حامد علی خاں، جو نواب احمد اللہ ولی (متوفی ۱۲۳۷ھ)  
وزیر اعظم قاری الدین حید بادشاہ کے داماد تھے، حسین میرزا کو مع حلقہ چپ چاپ  
نکال کر اپنے گاؤں برست لے گئے جو پانی پت کے قریب ہے۔ موصوف بادشاہ کے  
ناظر رہ چکے تھے۔ ان کی جگہ جگہ تلاش ہوتی رہی۔ جب انگریزوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ  
برست میں ہیں تو گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوئے۔ حسین میرزا اس سے پہلے  
پانی پت پہنچ گئے۔ انصاریوں نے جانوں پر کھیل کر انہیں بچایا۔ پھر حسین میرزا بھی  
بدل کر گھسٹو پہنچے اور وہاں زود پش ہو گئے۔ جب عام صفائی کا اعلان ہوا تو پھر دلی  
واپس آ گئے۔ یہاں ہاشم آباد ضبط ہو چکی تھی۔ اس کے بارے میں مرزا عالم یوسف  
میرزا کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

نک کے خط کی پشت پر جو سطریں ناظر بی کے ہاتھ لکھی ہوئی



تھیں، اس کے دیکھنے سے آس ٹوٹ گئی۔ کچھ ہاتھ آتا نظر نہیں آتا۔ املاک واقع شہر دہلی کے سوال کا جواب اب کی بار قلم اعداد ہوا۔ مکرر اگر کہا جائے گا تو بے شک یہ جواب آئے گا کہ ہم نے تو عرض اُن مکانات کے یہ مکانات دیے، معاوضہ ہو گیا۔ برائی، میں پہلے ہی جانتا تھا کہ یہ املاک قتل ہوئی اور وہ سو لاکھ روپیہ جو علاؤ زر مقررہ ملا ہے، وہ دہلی کی املاک کا خوں بہا ہے۔ پرسوں ناظرین کے نام کے سرنامے میں فرد فہرست مجموعہ املاک بھیج چکا ہوں۔ خیر یہ وار بھی خالی گیا۔<sup>۱۸۶۲</sup>

حسین میرزا کے قیام لکھنؤ کے زمانے میں ان کے لکھنؤی عزیزوں کے علاوہ نواب ضیاء الدین احمد خان نے کمال اہتمام سے حجِ دوستی ادا کیا اور بھتیجی وہ اعداد کر سکتے تھے، دیتے رہے۔ حسین میرزا کچھ عرصے کے لیے بیکانیر میں تحصیل دار ہو گئے تھے۔ جب نواب سالار جنگ اول، وزیر اعظم حیدر آباد (م ۱۸۸۳ء)، دہلی آئے تو حسین میرزا سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ نواب صاحب نے انھیں حیدر آباد آنے کی تاکید کی۔ اچھے میں ان میں جنوں کے آثار نمودار ہوئے۔ جن ہولناک مصائب سے وہ گزر چکے تھے، ان کا نتیجہ بھی ہو سکتا تھا۔ اس پر جوان بیٹے کی اچانک موت نے اور بھی اضافہ کیا چنانچہ باقی ساری زندگی بحالت جنوں گزاری۔ آخر کار ۶ رمضان ۱۳۰۷ھ (مطابق ۶ مئی ۱۸۸۹ء) کو جاں بحق تسلیم ہوئے۔ دہلی میں علی گنج میں مجلس خانے کی چار دیواری کے اندر پہلے دالان میں دفن ہوئے۔ میرمہدی مجروح کی لکھی ہوئی یہ تاریخِ قبر پر کندہ ہے:

حسین میرزا چوں فرد در ششِ رمضان  
ازاں کہ بود ز نسلِ امیرِ خمیرِ گبر  
بہ شامہ سالِ وقاتِ رضواں گفت  
بیا، بکاغِ چناں اے امیرِ ابنِ امیر

حسین میرزا مرزا غالب کے نہایت گہرے دوست اور قاری میں ان کے

شاگرد تھے۔ وہ بلا کے سخن فہم اور سخن سنج تھے۔ غالب کی صحبت میں عالمِ عقلی سے حوالہ سالی تک سیر کی اور مرزا کا فارسی کلام خود ان سے پڑھ کر مرثب کیا۔<sup>۱۹۵۶</sup> مرزا انھیں پیار سے ناظر جی اور ناظر حسین بھی کہتے تھے۔<sup>۱۹۵۷</sup>

حسین میرزا نے ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۰ء) میں دیوانِ غالب اپنے ہاتھ سے لکھا، پھر اس کے مستند ہونے کے لیے غالب کو پڑھ کر سنایا اور اس پر غالب سے سہر تصدیق بھی مثبت کرائی۔ دیوانِ غالب کا یہ نسخہ ”ظاہر ایضاً یثبت“ کے نام سے ۱۹۳۶ء میں آغا ظاہر دہلوی نے شائع کیا۔ دیوان کے دوسرے نسخے پر درج ذیل عبارت ہے:

ایں کتاب مستطاب بتاريخ ششم جمادی الثانی ۱۲۷۷ھ (مطابق ہجری دسمبر ۱۸۶۰ء) روز پنج شنبہ در شاہ جہاں آباد از دست سید ذوالفقار الدین سعید الموسوی المعروف بہ حسین میرزا علی عہد ابن نواب مہاراجہ ولہ ممتاز الملک میرزا حمام الدین حیدر خان بہادر حمام جنگ مرحوم و مفقود باتمام رسید۔

ہر کہ خواہد دعا طبع دارم  
زانکہ من بندہ گنہگارم  
لکھنؤ حضرت غالب / لکھنؤ را آفرین و مکرنگاں را نوید

**نیم غالب**

بندۂ علی ابن ابی طالب / اسد اللہ خاں غالب ۱۲  
حسین میرزا غالب کے مستند اور وفادار دوستوں میں تھے۔ غالب کا اردو کلام انہی کے یہاں جمع ہوتا تھا جو خود میں لٹ گیا۔ میرزا ایک خط میں مرزا یوسف علی خاں مزین (۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۲ء) کو لکھتے ہیں:

بھائی، تم کیا فرماتے ہو۔ جان بوجھ کر اُن جان بے جاتے ہو۔  
واقعی خود میں میرا گھر نہیں لانا مگر میرا کلام میرے پاس کب تھا  
کہ نہ لکھا۔ ہاں، بھائی شہداء الدین خاں صاحب اور ناظر حسین

مرزا صاحب ہندی اور فارسی نظم و نثر کے مضامین مجھ سے لے کر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے سو ان دونوں گروہوں پر بھانڈو پھر گئی، نہ کتاب رہی، نہ اسباب رہا۔ پھر اب میں اپنا کلام کہاں سے لادوں۔

غالب حسین مرزا سے بھائیوں کا سلسلہ کرتے تھے۔ ایک وقت تھا کہ ان کے والد نواب حسام الدین حیدر خاں قاضی قرض کے معاملے میں مرزا غالب کے وکیل تھے۔ اب گزشتہ زمانہ دیکھیے کہ غدر کے بعد جب حسین مرزا پر وقت آن پڑا اور وہ پراگندہ حال رہے تو غالب قرض کے لین دین میں ان کے وکیل بنے۔ قرض کے بارے میں غالب ۲۹ اکتوبر ۱۸۵۹ء کو حسین مرزا کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

بھائی، تمہارے خطوں کا اور یوسف مرزا کے خطوں کا جواب بھیج چکا ہوں۔ اگر کہوں کہ میری جان بھی تمہارے کام آئے تو میں حاضر ہوں، یہ کہنا تکلف محض ہے۔ کون جان دیتا ہے اور کون کسی سے جان مانگتا ہے، مگر جو فکر مجھ کو تمہاری ہے اور جو میری دست دس ہے اس کو میرا خدا اور میرا خداوند جانتا ہے۔ دست دس کو تم بھی جانتے ہو۔ ان شاء اللہ ادا کرنا، ماؤ آئندہ، یعنی نومبر میں خیر والا مقدمہ درست ہو جائے۔

ان سطور کی تحریر سے مراد یہ ہے کہ ابھی بچی لال، تمہارا قرض خواہ، آیا تھا۔ تمہارا حال پوچھتا تھا۔ کچھ بچ، کچھ جھوٹ کہہ کر اس کو راہ پر لایا ہوں۔ کہ سو دو سو روپے تم کو بھیج دے۔ بچوں کی طرح تقریر اس کو بھائی ہے کہ لال، جس درخت کا پھل کھانا منظور ہوتا ہے تو اس کو پانی دیتے ہیں۔ حسین مرزا تمہارے کہتے ہیں۔ پانی دو تو اناج پیدا ہو، بھائی، کچھ تو نرم ہوا ہے۔ تمہارے مکان کا پتا لکھوا کر لے گیا ہے اور یہ کہہ گیا ہے کہ میں اپنے

بیٹے رام جی اس سے صلاح کر کے، جو بات غصہ لگی، آپ سے آکر کہوں گا۔ اگر وہ روپیہ ہی بھیج دے تو کیا کہنا ہے اور اگر وہ خط لکھے اور تم اس کا جواب لکھو تو یہ ضرور لکھنا کہ ”اسد اللہ نے جو تم سے کہا ہے، وہ سچ ہے اور وہ امر محمود میں آنے والا ہے۔“<sup>۲۲۵</sup>

حسین میرزا نے غالب کے نام ایک خط میں اپنی خستہ مالی اور پریشانوں کا ذکر کیا کہ ”میں کہاں جاؤں اور کیا کروں“ اس خط کے لہجے نے غالب کو انتہائی متاثر کیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں یوسف میرزا کو ۲۹ نومبر ۱۸۵۹ء کے خط میں لکھتے ہیں:

”تمہارے ناموں صاحب کی دستخطی تحریر نے جو میرا حال کیا ہے وہ کس زبان سے ادا کروں۔ ہے ہے، حسین میرزا اور یہ کہے کہ میں کہاں جاؤں اور کیا کروں اور مجھ کم بخت سے اس کا جواب سرانجام نہ ہو سکے۔ بہت بڑا آسرا تھا اس سرکار کا، خدمت نہ سکی، عہدہ نہ سکی، علاقہ نہ سکی، سو ڈیڑھ سو روپے درماہ مقرر ہو جانا کیا مشکل تھا۔“<sup>۲۲۶</sup>

مرزا غالب کو جو اخلاص و ارچاہ حسین میرزا کے ساتھ تھا اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ ایک دن حسین میرزا بیماری سے ڈوب چار ہوئے اور اپنی بیوی سے غالب کو کہلوا دیا کہ ان کے شوہر لکھنؤ میں بہت بیمار ہیں اور وہ پیسے کے محتاج ہیں۔ اس کے جواب میں غالب نے یوسف میرزا کو ایک محبت آمیز خط لکھا:

”صبح کے وقت مرزا آغا جانی صاحب آئے اور انھوں نے فرمایا کہ حسین میرزا کی حرم لکھنؤ سے آئی تھی۔ بی بی علق کے ہاں اتری تھی اب وہ پٹنوی کو اپنے بیٹے کے پاس گئی۔ کہتی تھی کہ نصیب ادا ناظرینی بہت بیمار ہیں۔ خدا خیر کرے۔ یوسف مرزا، میری جان نکل گئی۔ کیا کروں، کیوں کر خبر ملے؟ پاتلی پاتلی پاتلی، دس بارہ

بار دل میں کہا ہو گا کہ عاری کا چٹا دوڑا ہوا آیا، اور تین خط لایا، یعنی وہ نیچے حویلی میں تھا۔ ڈاک کے ہر کارے نے خط لا کر دیے۔ نیاز علی اوپر لے آیا۔ ایک خط عیار عزیز کا اور ایک خط ہرگوپال تفت کا اور ایک ذوالفقار الدین حیدر موسوی کا۔ میاں، قریب تھا کہ خوشی کے مارے مجھ کو روڈ آجائے۔ ہارے، اس خط کو میں نے آنکھوں سے لگایا۔ ٹھپیاں لیں۔ آغا صاحب کو سب خط سنا دیا اور ان کو اسی وقت کاشی ناتھ کے پاس بھیجا ہے تاکہ وہ اس کو گرمائیں اور شربائیں اور کچھ سہاو مرزا کے واسطے بھجوائیں۔ خدا چاہے تو کچھ سہاو مرزا کو اور نکلنے سے ان کے خط کے آنے کے بعد کچھ ناظرین کو ان سے بھجواؤں۔ میرا وہی حال ہے، بھوکا نہیں ہوں مگر کسی خدمت گزاری کی توفیق نہیں ہے۔ بڑے بھلے حال سے گزر رہے جاتی ہے۔ انسو، ہزار انسو، جو تم سے اور ناظرین سے میرے دل کا حال ہے، اگر کہیں تو کون پادر کرے؟ اور وہ بات خود کہنے کی نہیں، کرنے کی ہے، سو کرنے کا مقدور نہیں۔

۳۳۵

حسین میرزا کی اولاد: حسین میرزا کی تین اولادیں تھیں: سہاو میرزا، اکبر میرزا اور ایک صاحب زاوی جو سید افضل حسین کو منسوب تھیں اور انہی کی بیٹی یعنی حسین میرزا کی نواسی ذکیہ بیگم کا نکاح جس اعلمی مولوی محمد حسین آزاد (۱۹۱۰ء) کے اکوڑے بیٹے آغا محمد ابراہیم سے ہوا تھا۔ اسی سلسلے سے نانی کے خاندان کے قلمی حالات آغا محمد طاہر نصیر آزاد کے پاس لاہور پہنچے تھے۔ یہ کاغذات سید محمد تقی موسوی کیورٹر لاہور میوزیم کی ملکیت میں تھے۔ موصوف نانی کے خاندان کے ایک فرد تھے۔

نواب سید معین الدین حیدر عرف سہاو میرزا: سہاو میرزا شاعر تھے اور سہاو تھیں کرتے تھے۔ وہ حسین میرزا کے بڑے صاحب زادے تھے۔ اوائل میں مرزا

غالب سے اصلاح لیتے تھے<sup>۳۵۵</sup>، لیکن بشیر دہلوی (نور مطلق خلیفہ، سہ ماہی "اردو"، کراچی، غالب نمبر، مطبوعہ: ۱۹۶۹ء) نے انھیں قربان علی بیگ ساک کا شاگرد لکھا ہے۔ "تذکرہ بشیر" (قلبی) میں یہ بھی درج ہے کہ سجاد میرزا مدرسہ زمانہ واقع شہر سعادت خاں میں مدرس تھے۔

سجاد میرزا ۱۲۹۳ ہجری (مطابق ۱۸۷۶ء) میں صاحب کسٹرز کے ہم راہ تھے تو گھوڑے سے گر کر انتقال کیا۔ مولف "معم خاں جاوید" نے غلطی سے ۱۸۷۷ء لکھا ہے۔ "تذکرہ بشیر" میں ۱۲۹۵ھ سجاد کی تاریخ وفات درج ہے۔ یہ بھی درست نہیں ہے۔ میرزا عبدالغنی ارشد نے ذیل کا مازہ تاریخ کہا ہے:

چند کر رنج و غم سے سمجھوں آہ

"رنج و غم" کے اعداد ۱۲۹۹ سے "آہ" (۶) کا تخریج ہے۔ جس سے ۱۲۹۳ برآمد ہوتے ہیں۔ جناب مالک رام نے "رنج و غم" کے اعداد ۱۳۰۰ اور "آہ" کے ۷ لیے ہیں<sup>۳۵۶</sup>، جو درست نہیں میرزا جہاں کاکل نے یہ تاریخ کہی ہے:

ہے ہے از پیش اسب اللادہ

سجاد میرزا بھی علی گنج میں اسی دکان میں دفن ہوئے جہاں ان کے والد کی قبر ہے۔ دواصل اسی جہاں بیٹے کی ناکہانی موت حسین میرزا کے لیے جاں لیوا ثابت ہوئی۔ ۱۸۵۷ء کی اللادہ کے بعد سے وہ بہت پریشاں حال رہے۔ وہی سبب کسر سجاد میرزا کی جہاں مرگی نے پوری کر دی۔

سجاد میرزا نہایت پاکیزہ خیال، جاوید مقال شاعر تھے۔ حسن صورت بھی رکھتے تھے۔ حیرانہ بیان دل گداز اور تفصیل کرشمہ ساز تھی۔ اگر کچھ دنوں اور زعمہ رہتے تو کہنہ مشقی اور پختگی سے قلم ڈونے سخن میں اپنے نام کے ڈاکا بجا دیتے، چند شعر نمونے کے طور پر درج کیے جاتے ہیں:

آئینہ خانے میں ہے محو خودآرائی کا  
دلا، کیا خوب ہے دھوئی اسے یکنائی کا

اب تصور میں بھی مجھ کو نظر آتے نہیں تم  
ناجرا پوچھتے کیا ہو شب تنہائی کا  
یہ جو دیوانہ سا بھرتا ہے بکھا ہے سجاد  
شہر میں شور تھا اس شخص کی دہائی کا

سجاد میرزا سجاد اپنا کلام پہلے مرزا قربان علی بیک سالک اور میر مہدی حسین  
بمروج کو دکھایا کرتے تھے۔ جب طبیعت زور پکڑ گئی تو پھر اپنا کلام غالب کو دکھانا  
شروع کیا۔ دو شعر ان کے غالب نے بہت پسند کیے تھے، وہ ہم یہاں لکھ دیتے ہیں۔  
غالب کی غزل ہے: ”دعا میرے بعد“، ”بغا میرے بعد“، اس پر ایک دلدہ سجاد میرزا  
نے طبع آزمائی کی۔ غالب نے اس غزل میں سے چھڑ کر ایک شعر ان کو دیا کہ سجاد  
ایسے شعر کہہ کر لاؤ۔ شعر یہ ہے:

جس میں کچھ شکل و شبہات بری لیتی دیکھی

میرے دھوکے میں اسے قتل کیا میرے بعد

ایک دلدہ ایک مشاعرے کی طرح ’کوے دوست‘ تھی۔ سجاد میرزا نے اس  
طرح میں ایک غزل لکھی۔ اس کے ایک شعر پر غالب نے دو صادر فرمائے۔ شعر یہ ہے:

یہ مٹی غیر ہے کہ نہیں مجھ کو دھکب غیر

یوں جو دوست ہوں کہ نہیں آؤ دئے دوست

ایک بھرے ہوئے مشاعرے میں، جس میں غالب اور ذوق کے  
شاگرد موجود تھے، سجاد نے مذکورہ بالا شعر پڑھا۔ اس پر ہر طرف  
سے صدائے تحسین و آفریں بلند ہوئی۔ نواب فیاض الدین احمد خان  
قنبر کو یہ شہ ہوا کہ یہ استاد کا حلیہ ہے۔ میرے بھائی نے جس  
وقت نواب صاحب کو اصلاح شدہ غزل دکھائی، اُس وقت ان کا  
یہ شہ رشح ہوا اور فرمایا کہ ”کیاں سجاد تمہاری بے باک سے یہ شعر باہر  
ہے۔“

قالب سجاد میرزا کو بہت چاہتے تھے۔ دونوں میں خط و کتابت بھی تھی۔ ایک خط مؤرخہ ۱۵ مارچ، روز چارشنبہ، ۱۸۶۵ء کو سجاد میرزا کے نام لکھتے ہیں:

قرۃ العین سجاد بن حسین سلام اللہ تعالیٰ۔

خوبی دین و دنیا تم کو ارزانی۔ تمہارے خط کے دیکھنے سے آنکھیں روشن ہو گئیں۔ دل کو چین آگیا۔ چشم بد دور، خط اچھا، عبارت اچھی، اردو میں مطلب تو ایسا اچھے ہو۔ حق تعالیٰ تم کو عمر و دولت عطا کرے۔ اپنے والد ماجد کو سلام کہنا۔ اپنے بھائی مظفر میرزا کو دعا کہنا، اکبر میرزا کو دعا۔ زیادہ، زیادہ۔ نہایت کا طالب، قالب۔

نواب اکبر میرزا نواب حسین میرزا ناظمی کے چھوٹے صاحب زادے تھے۔ میر مہدی مجروح کے شاگرد تھے۔ ان کے انتقال کے بعد انھوں نے ایک جامع مضمون لکھا جو جیشور داس مائل دہلوی نے اپنے ماہانہ رسالے ”زبان“ دہلی، بابت اپریل ۱۹۰۹ء میں شائع کیا تھا۔ اس کا عنوان ”میر مہدی مجروح“ ہے۔ ”زبان“ کے محدث شمارے میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔ اکبر میرزا کا تخلص سید تھا۔ قالب ان کا ترجمہ سب سے پہلے قالب ”لم خانہ جاوید“ نے لکھا تھا اور وہ یہ ہے:

سنور معجزیان و شام شیریں زبان، سید اکبر میرزا، غلبہ صمیم  
 اللہ ولہ نواب ناصر حسین میرزا بن نواب حسام الدین حیدر خان  
 نانی قربات دار شاہ اودھ۔ آپ نے میر مہدی مجروح سے بھی  
 استفادہ کیا۔ میرزا قربان علی بیگ سالک کے بھی شاگرد رہے۔  
 مولانا حالی سے بھی نسبت مکتہ حاصل تھا۔ نہایت معزز اور ممتاز  
 خاندان کی یادگار تھے۔ برہان الملک میرزا امین نیشاپوری ان کے  
 اجداد پوری میں، اور اجداد مادری میں بخشی الملک نواب میرزا نجف  
 خان بہادر کا نام روشن ہے۔ آپ جس طرح ایک نای گرامی  
 خاندان کے افراد سے تھے ویسے ہی خلق و انکسار میں احتساب



روزگار تھے۔ آپ کی گنگو نہایت سلیس و شستہ ہوتی، باوجود پیرانہ سالی بھی کبھی شوخی اور بذلہ سخی کی جھلک بھی کلام میں نمایاں ہو جاتی۔ مشاعروں میں اکثر شریک ہوتے اور اس خطہ الرجال کے زمانے میں آپ کا دم قیمت تھا۔ آپ کے خاندان میں کئی پشت سے شاعری کا فن چلا آتا ہے۔ آپ کی سلاست، سادہ بیانی، خدا داد تھی۔ کلام میں تکلف چھو بھی نہ کیا تھا۔ سیدھا سادہ روزمرہ لکھتے، فصیح محاورات باندھتے۔ جو کچھ کہتے، خوب کہتے۔ ہنگام ترحیب تذکرہ، یعنی قبل ۱۹۲۶ء میں انتقال کیا۔ ۷۰ برس سے زائد عمر پائی تھی۔ مشاق، شادان، معتدل اور ارشد کے ہم عصر تھے۔ درد و سوز، جو شاعری کی جان ہیں، کلام میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

یہاں نمونے کے طور پر چند شعر درج کیے جاتے ہیں:

زمیں تیری، زماں تیرا، کہیں تیرے، مکاں تیرا  
جب ناداں ہیں وہ، جن کو نہیں ملتا نکاح تیرا  
عیاں ہر شے سے ہے قدرت، نہیں جلوہ کہاں تیرا  
ترا مذاح ہے عالم، شاخوں سے جہاں تیرا  
تصنع سے کہیں بڑھ کر ہے تیرے عشق کا وجہ  
یہاں تک ٹھو ہوں، اپنے پہ رہتا ہے گماں تیرا  
نہ سیرت سے تری واقف نہ صورت آشنا کوئی  
تماشا ہے کہ دم بھرتا ہے ہر جہ و جواں تیرا

جدا کی شاق تھی دم بھر وہ دن بھی یاد ہیں تھے کب

نکھیاں میرا ٹو رہتا تھا، میں تھا ملازماں تیرا

یارب، جہاں میں مجھ سا کوئی ہے وہاں نہ ہو

اپنی مصیبت آپ ہی جس سے بچاں نہ ہو

کیا تیرے ہاتھ آئے گا اے برقی شعلہ ریح  
گلشن میں اک غریب کا گر آشیاں نہ ہو  
میں نے کہا، سنو تو سناؤں کچھ حال دل  
بس کر عجب انا سے کہا، داستان نہ ہو  
دامنہ، حصیں کہو کہ رہا کیا بہشت میں  
گر ہاں قصور و عجز و سبے ارقمواں نہ ہو  
مصور گر نہ ہو یہ بت و بت پرست سے  
ہندوستان کا نام ہی جنت نکلاں نہ ہو

آہ میں جو حرا ہے، وہ آوروں میں نہیں  
پھر شہری نہیں ہے جو لطف دہاں نہ ہو  
کوئی چیز ہاں دل سے ارزاں نہیں ہے  
مگر اس پہ بھی کوئی خواہاں نہیں ہے  
دم سرد بھر کر کوئی رو رہا ہے  
یہ خضی ہوا اور باراں نہیں ہے  
بجو سحر تابان و ماہ درخشاں  
چراغ حرا غریباں نہیں ہے

جئے بت پرست آ کے ہندوستان میں  
کوئی ہم سا سیدھا مسلماں نہیں ہے  
اکبر میرزا مجلس پڑھتے اور مرے بھی کہتے تھے۔ حالی نے ایک واقعہ یوں

بیان کیا ہے:

مرزا غالب کا ایک قاری قصیدہ ہے: ”دردِ گریستن“، ”تجا  
گریستن“ کے قافیے میں۔ اس قصیدے کی نسبت سید اکبر میرزا  
غلف الصدق ناظر حسین میرزا مرحوم بیان کرتے ہیں کہ ہندو گاہ

بصرہ میں ایک مجلس عزائمی اور بارش ہو رہی تھی۔ پہلی مجلس نے مجھ سے کہا کہ تم بھی کچھ پڑھو۔ میرے پاس اس وقت پڑھنے کی کوئی چیز، مرثیہ یا کتاب نہ تھی۔ اسی قصیدے کے چند اشعار دہانی یاد تھے۔ میں نے وہی پڑھ دیے۔ پانچ ہی سات شعروں پر مجلس میں خوب رشک ہوئی۔ عرب، گجلی اور ہندی، سب اس مجلس میں شریک تھے۔ مجلس کے بعد ہر ایک گجلی مجھ سے پوچھتا تھا کہ اشعار کس شخص کے تھے۔ خصوصاً اس شعر کی بہت تعریف کرتے تھے:

حرد شفاعت و صلہ صبر و خوں بہا  
پچ ار کے خواستہ کا گریستن ۳۹۵

اکبر میرزا کے بٹری منونے بہت کم ملتے ہیں۔ ”دیوان مجروح“ پر انھوں نے تقریباً کسی جو دیوان میں موجود ہے۔ دیوان میں یہ تاریخ بھی ہے:

جو دیوان مجروح گردید طبع  
خوش کردہ آں را دست و کج  
خود بے حش و شیخ تاریخ طبع  
ہکتا کلام بلبل و فصیح

یوسف میرزا: سید ناصر الدین حیدر خاں نام۔ خطاب امتیاز اللہ ول، عرف یوسف میرزا، گھٹس نام۔ ناصر کے والد گرامی کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ موصوف، جو بڑے ناز و خرم سے یہودان چڑھے تھے، نذر کے بعد عرصے تک پریشان حال رہے۔ آخر کار الور میں پناہ لی۔ مہاراجا الور کے مزاج میں بہت دشمن ہو گئے تھے، اس لیے خوش و خرم رہنے لگے۔ مہاراجا نے پچاس روپے کا ماہانہ تنگید بھی مقرر کیا تھا اور اس بات کی کوئی پابندی نہ تھی کہ لازماً الور میں ہی رہیں۔ البتہ یہ شرط بہت ہی ضروری تھی کہ اگر باہر

رہیں تو سال میں دو ایک مرتبہ ضرور یہاں آئیں۔

یوسف میرزا اردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ طبیعت میں عرافت تھی۔ یہ لطیفہ مشہور ہے: ان کے ایک چچا کا نام سید محمد رضا تھا۔ ان کے دوستوں میں ایک نواب محمد رضی خاں تھے۔ یوسف میرزا نے رضی کی "سی" کو یائے تانیث قرار دیا اور چوں کہ سید محمد رضا ان کے چچا تھے، اس لیے نواب محمد رضی خاں کو "چچی" کہنے لگے۔

میرزا یوسف اور میرزا غالب کے درمیان خاموشی مرام نہایت مضبوط و مربوط تھے۔ دونوں میں عرصے تک خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ بعد یوسف میرزا کھنڈ چلے گئے۔ دہلی میں ان کا بھرا گھر لٹ گیا اور قیامت ٹوٹ پڑی جس کا مختصر حال خطوط غالب میں موجود ہے۔ پہلے بڑے ماموں نواب مظفر علی دہلوی کے گھاٹ اتارے گئے۔ اس کے بعد چنے کا داغ کھاتا پڑا۔ پھر دہلی گرای (نواب جان) کو انگریزوں نے گولی سے اڑا دیا۔ یہ ایسے دل خراش اور روح فرسا حادثات تھے کہ غالب کا دل بھی خون کے آنسو رو رہا تھا۔ ایک خط میں یوسف میرزا کو لکھتے ہیں:

یوسف میرزا، کیوں کر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا اور اگر لکھوں  
تو پھر آ کے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو، مگر صبر؟ یہ ایک شیخہ فرسودہ  
انٹے روزگار کا ہے۔ تعزیت ہیں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا  
کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہاں، ایک کا کلیجہ کٹ گیا ہے اور لوگ  
اسے کہتے ہیں کہ ٹو نہ ٹپ۔ بھلا کیوں کر نہ ٹپے گا۔ صلاح اس  
امر میں نہیں بتائی جاتی، دعا کو دخل نہیں، دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے چٹا  
مرا، پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سر ہوا کس کو  
کہتے ہیں، تو میں کہوں گا، یوسف میرزا کو۔<sup>۳۵۵</sup>

ایک اور خط میں حسین میرزا کی لاچاری اور بے بسی کے بارے میں

لکھتے ہیں:

کل تمہارا خط آیا۔ بھائی حسین خاں کیوں ہوئی؟ حسین میرزا

صاحب کیوں بیمار ہوئے؟ خدایا ان آوارگانِ دھبِ غربت کو  
 جمعیت، جب تو چاہے حمایت کر مگر تصدقِ مرتضیٰ علی کا، حدودِ دست  
 رکھ۔ اَللّٰہُمَّ اَحْسِنْ مِرزا کی ڈاڑھی سفید ہو گئی۔ یہ شدتِ غم و رنج  
 کی غوطیاں ہیں۔ اس خط کے پہنچنے ہی اپنی اور ان کی خیر و عافیت  
 لکھتا۔ ۳۳۵

غور کے بعد یوسف میرزا کو مفلسی نے ایسا پریشان اور مجبور کیا کہ روزگار کے  
 لیے پانچ بیٹے پڑے۔ وہ خاندانی رکھن اور صاحبِ جاکداو تھے۔ جو کچھ بھی تھا وہ سب  
 لٹ گیا۔ اب مالی پریشانیوں نے ایسا طر حال کر دیا تھا کہ انھوں نے عالم سے ہد کی  
 درخواست کی۔ عالم نے انہی دنوں واجد علی شاہ سلطانِ عالم کی تعریف میں ایک قصیدہ  
 لکھتے اس امید پر بھیجا تھا کہ جو کچھ بھی وہاں سے ملے میں آئے گا اس میں سے نصف  
 یوسف میرزا اور ان کے ماموں حسین میرزا کو دوں گا اور نصف رقم اپنے مصرف میں  
 لے آؤں گا۔ چنانچہ دوم جمادی الاول ۱۲۷۶ھ (۲۸ نومبر ۱۸۵۹ء) کو یوسف میرزا  
 کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

یہ خط اپنے ماموں صاحب کو پڑھا دینا اور فردا کن سے لے کر  
 پڑھ لینا اور جس طرح ان کی رائے میں آئے، اُس پر حصول  
 مطلب کی پتا اٹھا لینا اور مدارج کا جواب شتاب لکھنا۔  
 نیاہ الدین خاں رجب چلے گئے، اور وہ کام نہ کر گئے۔ دیکھیے، آ  
 کر کیا کہتے ہیں، یا رات کو آگئے ہوں، یا شام تک آجائیں۔  
 کیاں کروں؟ کس کے دل میں اپنا دل ڈالوں؟ یہ مرتضیٰ علی پہلے  
 سے نیت میں یہ ہے کہ جو شاہِ اودھ سے ہاتھ آئے حقاً برادرانہ  
 کروں۔ نصف حسین میرزا اور رقم اور سہارہ نصف میں مفلسوں کا  
 حار۔ ۳۳۵

یوسف میرزا شعر بھی کہتے تھے اور ہنرِ تجلّس کرتے تھے۔ جناب مالک رام

ساحب کو ان کا کوئی شعر دستیاب نہیں ہوا۔ راقم کو یہ شعر ملا ہے جو تذکرۂ بشیر دہلوی میں موجود ہے:

ترشنے سے بچوں کے بڑھ گئی تو قیر و خمر کی  
منم بین کر ہوئی مشہور یہ قصور و خمر کی

مجھے ایک اردو رسالے ”مرتبہ تہذیب“ لکھنے کا ایک شمارہ نمبر ۵۸ جنوری ۱۸۷۵ء کا دستیاب ہوا۔ اس میں ایک قاری قطعہ ہے جو نامہ نے میر انیس کی وفات پر لکھا ہے۔ چوں اس کا حوالہ کہیں نظر سے نہیں گذرا، اس لیے ذیل میں من و عن صریح کیا جاتا ہے:

تاریخ وفات جناب میر بہر علی، انیس تخلص، چکیدہ قلم جناب سید یوسف میرزا نامہ

آں سہو جلیل شہنشاہ ملک علم  
فرمود کوچ، ملک فصاحت تمام شد  
روح بہ بزم ختم رسل انصاف یافت  
بگذاشت ایما غراب و جنت مقام شد  
امش بہر علی و تخلص انیس ہو  
وہ بزم قدس و ذکر مدح امام شد  
مذاقی امام چو از صدق دل نمود  
ذی شان و ذی شکوہ و ذی الاحرام شد  
خبر سر، طیل دعوت و قلم علم  
سلطان و اکرمین و ملک احتشام شد  
ہنگام رزم، تنگی زباں و ذوالنصار ہو  
بہ جوش علم چو اہل احسان شد  
ہنگام بزم و کرم و کرمیاد بہ زباں  
مجز ہاں، معور شیریں کلام شد

با شکت و شکوہ پہ چشمِ بر نمود  
 یا عز و انکار و جلالِ اتمام شد  
 دا کرد چشم چوں ہے دیارِ مرضی  
 محوِ مکی غیب و کارش تمام شد  
 این است ادبِ رجبہ مدح بہ قول  
 وقبہ جلالِ رجبہ ماو تمام شد  
 تا سرِ بیار سالِ وفات از سرِ الم  
 کلتا۔ انیس خاس نام تمام شد  
 ہری

یوسف میرزا کا انتقال ۱۳۰۰ ہجری (۱۸۸۲-۸۳ء) میں کلکتہ میں ہوا۔ محلہ  
 نوربازی میں دفن ہوئے۔ میرسیدی بروج نے تاریخ لکھی۔ آخری شعر یہ ہے:  
 چشیں گشت رضواں شکیا وفات  
 ”بلا منہدم در بخت بریں“  
 ہری

چند سال قبل راقم حروف کو اردو خطوط کا ایک ناقص مخطوط نہایت کرم خود  
 اور خستہ حالت میں ایک صاحب کے یہاں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ وہ  
 یوسف میرزا کے خاندان سے حلقہ ہیں۔ چوں کہ غالب کی نگارشات کے بارے میں  
 محدث ”ماہرینِ غالبیات“ ٹھوکر کھا چکے ہیں اور ان کے جعلی خطوط اور فرضی کلام کو  
 غالب کی طرف منسوب کر کے لوگوں کو غلط فہمیوں میں مبتلا کر چکے ہیں، اس لیے میں  
 نے ان خطوط کے کچھ اقتباسات ”ہماری زبان“ دہلی کی ۸ جنوری ۱۹۹۷ء کی اشاعت  
 (صفحہ ۸) میں اپنے مضمون ”غالب کے ایک مکتوب الیہ، سید یوسف میرزا تا سرِ کھسوی“  
 کی دوسری قسط میں ماہرینِ غالبیات کی آرا کے لیے شائع کیے تھے۔ ابھی تک کسی کا  
 ردِ عمل سامنے نہیں آیا۔ خطوط کے طرزِ اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید غالب نے

یوسف میرزا ہی کے نام لکھے ہوں گے۔ ان میں ایک علاحدہ خط کسی مولوی وحید الدین کے نام بھی شامل ہے۔ ہیں کہ یہ غلطو دیکھی سے خالی نہیں اور ان میں طرفت کی چاشنی بھی ہے، اس لیے مزید تحقیق کے لیے چند کتابسات درج کیے جاتے ہیں:

(۱) کون سنتا ہے نغان درویش

قبر درویش بہ جان درویش

میرے بھروسہ مرشد جناب مولوی وحید الدین صاحب کو میری تسلیم! حضرت، آپ نے اپنے خادم کو ایسا بھلا یا کہ خط کیا خالی سلام بھی کسی کی زبانی نہ آیا۔ خیر دل سے نہ بھلائیے گا۔ شکایات کا موقع زبانی ہے، باقی کہانی ہے۔ حضور، اب قصور معاف کیجیے۔ آپ ہی آئے اور اس شر کو بھی لے آئے دیجیے۔ واللہ ہم آپ کے کمال و تصرف کو مانتے ہیں۔ اگرچہ کشش محبت ہی چیز ہے، یہ سب جانتے ہیں۔ آپ کا کس کو انکار ہے۔ یہ تو چشم نمائی بے کار ہے۔

(۲) کہوں کیا، مجھ سے کسی کا ہے اجارا دل پر

تو نے مقرر مری جاں، کھینچ کے مارا دل پر

ہے ہے، اب کی حرم میں دو طرح کا غم ہے۔ ایک تو شہر میں عزاداری میں ہی کم ہے، دوسرے اور بھی تخفیف ہوئی یہ بڑا الم ہے۔ اس خط کے مضمون ماتم... نے اچھا کام کیا۔ تم نے مشرء حرم کو... سلام کیا۔ میں تو غم لامتناہی طور ممکن ہے، لیکن یہ بات کہاں۔ وہ نوے، جن سے رقت بدرجہا تھی، کاسے کو سنائی دیں گے۔ خالی ماتم کریں گے۔ مختصر کلام، خط آپ کا آیا۔ مجھ کو آپ نے حج اسباب قعویہ داری بلایا تھا۔ بیٹے، وہاں کا ماتم دیکھنے کا میں شائق ہوں، مگر حسب الطلب ضرور چلا آتا۔ جاں،



فقط اتفاقاً نہیں و بیش ہے کہ یہاں کی خبر گیری اور عمرانی میں کسی قدر ضرورت کم و بیش ہے۔ اس سے بہتر یہ تھا کہ کسی معبر کو بھیجتے جو لے جائے اور اگر دور ہو تو بندہ اپنا ہرج کرے۔ جیسا لکھیے، اب وہاں گیا جائے۔

(۳) اہل ایمان میں دو تہیں سے مقسم تھا کہ یہ باعث کیا ہے جو خود بخود طبیعت کچھ بٹاؤں ہوا ہے۔ ذاتی آنکھ ہر بار پھڑک جاتی ہے۔ عشرہ بحر طوع امام میں روئے۔ اب بے اختیار ہنسی چلی آتی تھی۔ اس کا سبب تھے۔ کہ اس نہ کیجیے۔ اپنی چہ میگوئیاں رہنے دیجیے۔ مبارک ہو، مبارک۔ ڈاکینا اکبر آباد کا دروازے پر حاضر ہے۔ سرنامہ پڑھ کے ایسے ہوئے جس کے بیان میں زبان قاصر ہے۔ وہ کیا کہ میرے دوست۔۔۔

(۴) بھٹی سی آج کیوں دم فریاد آگئی

بادش بخیر، کس کو سری باد آ سگی

آج تو کسی بھاکوٹن کا صفحہ دیکھا تھا۔ لیجیے، بندہ نواز اپنے عاشق بھراں نصیب کی حلیم قبول کیجیے۔ آپ کے نوازش تائے کا فقرہ گویا میری رہائی ہے۔ باقی کہانی ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے، کہیں یہ فقرہ محمول پہ خوشامد ہو جائے۔ میں نے اپنی مدت العمر میں ایسا شخص دیکھا نہ سنا۔ انصاف کرے تو ذرا مشکل ہے۔ سہل المستیع اسی کا نام ہے۔ ان شاء اللہ، چشم بدو، میرے نزدیک تو اگر مرزا وجیب علی بیگ <sup>۱۳۵۵</sup> زندہ ہوتے تو اپنے کلمے کو بہت دلوں روئے۔ واہ رے فقرہوں کی صفائی، اللہ رے عبارت آرائی۔ قلم توڑ دیا ہے، کارنامہ کیا ہے اب یہ بحث تو فضول ہے، اس سے کیا حاصل ہے؟ ذرا میرے پیارے دوست مہاں فیر <sup>۱۳۵۵</sup> کو

بلوایئے۔ حضرت سلامت، میدان میں آئیے۔ زمین آسمان کے  
 ملائے نہ ملائیے۔ آپ نے تو بڑی چمک دکھ سے میری شکایت  
 کو ٹالا تھا۔ اچھا بہانہ بچارے مولوی کا ٹالا تھا۔<sup>۳۶۵</sup>

## حواشی اور حوالے

- ۱۵۱ "نغم غات ہادی"، جلد چہارم، ص ۳۱۸۔ حربہ تصنیف کے لیے "نویاتی تائی" مرثیہ ذاکر اکبر حیدری (مطبوعہ ۱۹۷۲ء) ملاحظہ ہو۔
- ۳۵۱ "ذکر قالب"، مالک رام، ص ۳۲۸۔ دیوان قالب، کتب مرثی، پیلا ایٹیشن، ص ۳۱۷
- ۳۵۲ "دیوان تائی"
- ۳۵۳ "کلیات سحر"، مطبوعہ مطبعہ ذکون، کھنڑ، ۱۹۸۳ء، ص ۱۱۲
- ۵۵۱ ایضاً
- ۶۵۱ "بانگور قالب"، ص ۹۸
- ۷۵۱ "سحرہ سحر"، نواب اعظم لڈوہی میر محمد خان سرور، مرثیہ خواجہ احمد فاروقی، ص ۷۷
- ۸۵۱ "مکتوبہ" مکتوبی ہے "خار"، کتب ۱۳۶۱ء
- ۹۵۱ نواب سراج لڈوہی، نام میرزا غیاث الدین محمد خان، خطاب نواب سراج لڈوہی خان بہادر نصرت بنگ۔ قاری میں شعر کیجئے تھے اور قیامت نکلیں کرتے تھے۔ حربہ تصنیف کے لیے "نویاتی تائی" (ص ۳۹-۴۵) دیکھا جا سکتا ہے۔
- ۱۰۵۱ "مجموعہ لغز"، حصہ دوم، بحکم قدس لڈوہی، ص ۲۵۹
- ۱۱۵۱ "مجموعہ شعرائے ہند"، مولوی کریم الدین، مطبوعہ ۱۸۳۸ء، ص ۳۲
- ۱۲۵۱ "مطالعہ قالب"، مالک رام، پیلا ایٹیشن، ص ۱۳۹
- ۱۳۵۱ مکتوب نام نام
- ۱۴۵۱ "تیسرا انوار"، جلد دوم، سید کمال الدین حیدر، ص ۲۵
- ۱۵۵۱ "اسد کے مکتوب"، مطبعہ تہجائی، دہلی، ۱۸۹۹ء، ص ۳۵
- ۱۶۵۱ "تیسرا انوار"، جلد دوم، مطبوعہ نوکلور پریس، کھنڑ، ۱۸۹۶ء، ص ۳۵۸
- ۱۷۵۱ "اسد کے مکتوب"، حصہ اول، ص ۲۶۲
- ۱۸۵۱ "نغم غات ہادی"، ص ۳۱۸
- ۱۹۵۱ "اسد کے مکتوب"، ص ۳۵۸



گاہے گوارہی کے قدردان تمام الدین جودخان (مخ تادمی کے مشور)

مے کدہ ہو گیا سناں، چائے ہیں ہر سو  
ٹوٹے پیرے کہیں ساغر تو کہیں جام سناں  
اب وہ بات نہ رہی رہاں سر رہاں  
سو چرخ کہا۔ ”خوب ہے ہاتھ کا سناں“  
((”دعوتی گردش“، ص ۱۸۹۹، ص ۲۲۵))

نوٹ: بعض خطوط میں چرخیں بھی درج ہیں۔ اس خط پر ۲۵، جنوری ۱۸۹۸ء کی تاریخ لکھا ہے۔



## غالب، سالار جنگ اور ذکا

نواب سالار جنگ بلند عظمت و منزلت کے مالک تھے۔ حیدرآباد دکن میں ان کے رتے کے مقابل اور کوئی خطاب نہیں ٹھہرتا۔ ان کا نام نای میر تراب علی خاں، خطاب جس الامرا، مختار الملک، نواب سالار جنگ تھا۔ انھوں نے سالار جنگ نڈل کی حیثیت سے اپنی لیاقت، حسن تدبیر، غیر خواہی دولتِ برطانیہ و حکومتِ نظام کی بنیاد پر جو شہرت حاصل کی تھی وہ نہ صرف دکن بلکہ ہندوستانی مسلمانوں میں منبری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ ان کا سلسلہ نسب اوہیں قرنی تک پہنچتا ہے اور ان کے بہن اہل باقر مستوفی الملک شہنشاہ دہلی کی طرف سے کشمیر کے نائب تھے۔ ان کے فرزند محمد تقی شاہان اورنگ زیب، بہادر شاہ و فرخ سیر کے عہد میں ویدار کے معزز اراکین میں سے تھے، جن کی وفات ۱۱۳۵ھ (۱۷۳۱ء) میں ہوئی۔ ان کے صاحب زادے صدر خاں غفور جنگ افشع الملک خاں خاں بہادر نے، جو دیوان صوبہات دکن تھے، ۱۲۰۵ھ (۱۷۹۰ء) میں انتقال کیا۔ ان کے بیٹے علی زمان خاں غفور جنگ، شیرالودار شیر الملک دیوان ہوئے۔ ان کے فرزند ارجمند میر محمد علی خاں شیر الملک امیر الامرا تھے۔ ان کی شادی ۱۸۰۳ء میں دکن کے امیر کبیر سیر ابوالقاسم میر عالم دارالہمام کی دوسری

صاحب زاوی کے ساتھ ہوئی۔ حیدرآباد میں میرعالم کی یادگاریں اب تک قائم ہیں جن میں میرعالم کی منڈی (ایک بڑا بازار) اور شہر سے کچھ فاصلے پر ایک پختہ تالاب جو فنی تعمیرات کا گچہ ہے، مشہور ہیں۔ میرتراب علی سالار جنگ میرعالم کے نواسے تھے۔ سالار جنگ کی ولادت ۲۲ جنوری ۱۸۲۹ء کو ہوئی۔ ان کی تربیت و پرورش میں ان کے دادا منیر الملک امیر الامرا کا خاصا ہاتھ تھا۔ میرعالم کے بعد مسیح وزارت پر وہی جلوہ افروز ہوئے تھے۔ منیر الملک کا انتقال ۲۷ مئی ۱۸۵۳ء کو ہوا تو نواب ناصر الدولہ فرماں روا نے دکن نے سالار جنگ کو کم سنی کے باوجود قلم دان وزارت سپرد کیا۔ موصوف بلوخت تھے، ان کی طبیعت میں عزم و استقلال کا مادہ تھا۔ انھوں نے اولوالعزمی کے ساتھ تمام ملکی قصب و فرار پر قابو پایا۔ اسی زمانے میں تختہ غور نمودار ہوا۔ اس پڑاؤ میں انھوں نے نہ صرف حیدرآباد کو فساد سے محفوظ رکھا بلکہ ہندوستان میں بھی انگریزوں کی لدا سے دریغ نہ کیا۔ قوی دلی ہمدردی میں وہ کسی سے کم نہ تھے۔ سرسید کے مثنیٰ کو ان کی ذات سے جو تقویت پہنچی اور علی گڑھ کالج نے ان کی بدولت جو فائدہ اٹھایا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

نواب سالار جنگ نے حیدرآباد کو علوم و فنون کی روشنی سے سزا کیا تھا۔ انھوں نے حیدرآباد اسکول کھولے اور ہندوستان سے قابل اور لائق لوگوں کی خدمات حاصل کیں۔ ان میں نواب عبدالملک سید حسین بکراوی وغیرہ ہیں۔ ۱۸۷۶ء میں لندن کے سفر میں نواب موصوف بھی ان کے ہمراہ تھے۔ سالار جنگ نے قیام انگلستان کے زمانے میں بیش بہا قلمی کتابیں اور قرآن مجید کے حیدرآباد نسخے اور دوسری نادر و نایاب چیزیں خریدیں۔ انگلستان کی دلچسپی کے بعد وہ روم بھی گئے۔ وہاں کے بادشاہ سے ملاقات کی۔ روم میں وہ نادرالوجود تختہ ویلڈ رییکا (Veild Rebecca) خریدا جو آج بھی سالار جنگ میوزیم میں موجود ہے اور سب احوال کا مرکب و توجہ بنا ہوا ہے۔ یہ میوزیم نوادرات اور قلمی خطوطات کا ایک جلیں قیمت خزانہ ہے۔

نواب سالار جنگ جب مارچ ۱۸۷۰ء میں لکھنؤ آئے تو ان کی آمد پر فطی

نولکھور نے ”اودھ اخبار“ کا ایک خصوصی شمارہ ضمیمے کے طور پر بعنوان ”پرچہ ضروری“ مارچ ۱۸۷۰ء، ”وقت صبح“ جاری کیا۔ یہ چار صفحات پر مشتمل تھا۔ اس کی تفصیلات ”اودھ اخبار“ نمبر ۱۱، مطبوعہ ۱۸ مارچ ۱۸۷۰ء، مطابق ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۸۶ھ، روز شنبہ، جلد ۱۲ کے ساتھ شامل ہیں۔ ذیل میں ضمیمہ اخبار سے چند باتیں درج کی جاتی ہیں:

عالی جناب شوکت آف نواب مختار الملک سید تراب علی خاں سالار جنگ کے درود لکھو کے بارے میں ایک بسیط مضمون درج ہے۔ جن لوگوں نے ان کا استقبال کیا تھا ان میں حکومت کی طرف سے سرکردہ اعلیٰ افسروں کے علاوہ معززین شہر بن بھی تھے۔ ان میں خصوصیت سے راجا امیر حسن خاں امیر الدولہ اور مفتی نولکھور صاحب مالک مطبع ”اودھ اخبار“ و ”لکھو پائرس“ شامل تھے۔ راجا صاحب نے دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ جلسہ میں نولکھور صاحب بھی مخصوص کپے کئے تھے۔ ۲۲ مارچ ۱۸۷۰ء کے پرچے (ص ۲۹۵) میں درج ہے کہ نواب سالار جنگ لکھو میں معشوق منزل میں اترے تھے۔ جن لوگوں نے ان سے ۱۸ مارچ کو ملاقات کی تھی ان میں مفتی صاحب کے ساتھ ”اودھ اخبار“ کے ایڈیٹر رفیق علی بھی تھے۔ صفحہ ۲۹۶ میں چمپا ہے کہ جب سالار جنگ کان پور کے لیے سوار ہوئے تھے تو جن لوگوں نے انکسٹن پر انھیں رخصت کیا تھا ان میں افسران کے علاوہ راجا امیر حسن خاں اور مفتی نولکھور صاحب بھی موجود تھے۔ مفتی صاحب کان پور تک ان کے ہمراہ تھے معشوق منزل لکھو میں نواب موصوف کی ملاقاتیں مفتی صاحب کے ساتھ بے تکلفانہ رہی تھیں۔ نواب صاحب نے مطبع ”اودھ اخبار“ کے بارے میں ٹیک

حیالات کا اظہار کیا تھا۔

جب ماہِ ربیع الاول ۱۳۰۰ ہجری (۱۸۸۳ء) میں فوٹک آف میکلورگ وارو حیدرآباد ہوئے اور نواب سلاطین نے ان کی دعوت کا اہتمام رات کو ۱۱ بجے میر عالم پر کیا تو اسی روز نواب موصوف کی طبیعت خراب ہو گئی اور پہنچے میں چلا ہو کر ۲۹ ربیع الاول ۱۳۰۰ء (مطابق ۸ فروری ۱۸۸۳ء) کو روزِ پنج شنبہ ساڑھے سات بجے رات انتقال کیا اور بروڑ جہاں پہلے دن کو وائزہ میر سمن حیدرآباد میں دفن کیے گئے۔

نواب سلاطین علم دوست، ادب نواز اور سخن شناس تھے۔ اہل کمال کے قدردان اور مہربان تھے۔ یہ مرزا غالب کی انتہائی بد قسمتی تھی کہ بار بار عرض داشتیں بھیجنے کے باوجود وہ نواب موصوف کے لطف و کرم سے محروم رہ گئے۔ نواب صاحب نے حیدرآباد میں ایک بڑا دفتر ”دارالانشاء“ کے نام سے قائم کیا تھا جہاں بڑے بڑے اہل کمال ملازم تھے۔ اسی دفتر میں محمد حبیب اللہ شخص وکا خصوصی کاتب کی حیثیت سے ۱۸۵۶ء میں ملازم ہوئے تھے۔

وکا کا خاندان دراصل بنگالہ کا رہنے والا تھا۔ ان کے والد بزرگوار حافظ محمد میمن بنگالی تھے۔ وکا ۱۳۳۲ ہجری (۱۸۱۸-۱۹ء) میں نیپور میں پیدا ہوئے۔ جناب مالک رام صاحب نے ”معارفِ غالب“ طبعِ ثانی، ص ۱۸۲ میں وکا کا سال ولادت وکا کی تصنیف ”غاش و غماش“ کے دیباچے کے حوالے سے ”بے خود مدعوئے“ سے نکالا ہے۔ ماہِ تاریخ میں جامع سہ کاتب لکھا ہے۔ میرے خیال میں صحیح ماہِ تاریخ ”بے خود بخودی“ ہے۔ اس سے ۱۳۴۳ء کے اعداد نکلتے ہیں۔ وکا ۱۲۷۲ء (۱۸۵۰ء) میں ۳۸ برس کی عمر میں حیدرآباد آئے اور یہاں سید محمد عباس (والد نواب مہدی نواز جنگ) اور مہدی نواب حسینیؒ کے قوتل سے نواب علی الملک سلاطین کی سرکار تک پہنچے اور دارالانشاء میں نواب صاحب موصوف کے خصوصی کاتب مقرر ہو گئے۔ پہلے وہ حیدرآباد میں میر شمس الدین فیض (متوفی ۱۳۸۳ء) سے اصلاح لیتے تھے اور ۱۸۶۲ء میں جب



غالب کی استادی کا شہرہ سنا تو ان سے اصلاح لینے لگے۔ کہتے ہیں:

فائل ہوں میں غالب کے ڈاکا طرزِ سخن کا

ایسا کوئی دلی میں سنو نہ ہوا تھا

ڈاکا مدتوں تک نواب سالار جنگ کے میرٹھی رہنے کے بعد تعلق دار و درجہ سہم

مقرر ہوئے، لیکن نواب صاحب نے ان کا حیدرآباد سے کہیں جانا گوارا نہیں کیا۔ ڈاکا

کبھی دہلی نہ گئے اور غالب حیدرآباد نہیں آئے۔ دونوں میں ایسا غائبانہ اور روحانی رشتہ

تھا کہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے کے لیے عزم رہے تھے۔ دونوں میں کئی سال تک

خط و کتابت جاری رہی۔ غالب ڈاکا کا خاطر خواہ احترام کرتے تھے اور ڈاکا کو ”میر اور

ایمانی“ اور ”دوست روحانی“ کے اعزاز سے محترم کرتے تھے۔ جب ۱۲۸۵ھ میں غالب

کا انتقال ہوا تو ڈاکا نے ذیل کی تاریخ لکھی:

میرا استاد معوی غالب

جس کا ہر لفظ معنی اعجاز

وصد لا شریک لہ کی قسم

ایک فنِ سخن میں بے انباز

ایسی قسمت کہاں جو میں کرتا

پردہ چٹم صرف پا اعمار

ہاں سنا ہے کہ اس کے تھے کردار

جیسے گفتار حافظ شیراز

کیا جب ہے جو حرمِ نئے سے

بخش بھی دے کریم نکتہ نواز

بہرہ کا انور و سحر تھا

سخن اس پہ ہیں سخن پرداز

خود ہی فرما گیا ہے یہ منقطع  
چشمِ نبی کا دیکھنا اعداد  
”اسد اللہ“ خاں تمام ہوا  
ماورینا، وہ معر شہاد ہاں  
پہلے مصرع سے تا پہ آخر شعر  
سال تاریخ کا ہے جلوہ طراز  
غیبِ دانی صفت خدا کی ہے  
اک عدد کی کمی میں تھا یہ راز

غالب کے مصرعِ اول سے ۱۲۷۵ھ کے اعداد نکلتے ہیں۔ دوسرے مصرع  
کے ”ہاں“ کے ۱۰ عدد جمع کر کے ۱۲۸۵ھ کے اعداد برآمد ہوتے ہیں۔ دوسری صورت یہ  
ہو سکتی ہے کہ غالب کے مصرعِ ثانی کے ”شہاد“ کے لفظ سے ”ہاں“ کے ۹ عدد نکلتے ہیں۔  
تاریخ یوں صحیح نکلتی ہے ۱۲۷۵ھ + ۹ = ۱۲۸۴ھ۔ ”ایک جس کی کمی کی طرف آخری مصرع  
میں اشارہ کیا گیا ہے اس کے مطابق تاریخ یوں نکلتی ہے۔ ۱۲۸۵ھ = ۱ + ۱۲۸۴ھ  
ہجری۔ ☆☆

ذکا کا انتقال ۴۷ سال کی عمر میں ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۵ء) میں حیدرآباد میں ہوا۔  
جناب مالک رام صاحب نے ”مات فی عشق رب حبیب اللہ“ ماور تاریخ لکھا۔ یہ  
ماور تاریخ نواب حفیظ الدین خاں پاس کا طبعِ زاو ہے۔

غالب نے ۱۸۶۲ء میں خط کے ذریعے سے ذکا سے نواب سالار جنگ کی سخن  
پروردی، قدردانی اور مزاج کی کیفیت کے بارے میں دریافت کیا۔ ذکا نے مطلع کیا  
نواب صاحب، صاحبِ ذوق اور سخن شناس ہیں اس لیے ان کے نام کتابیں روانہ کی جا  
سکتی ہیں۔ غالب نے امداد کے لیے جو خطوط سالار جنگ کو بھیجے تھے ان میں سے دو  
تین خط کلیاتِ نثر میں ملتے ہیں۔ اس وقت میرے سامنے کلیاتِ نثر کا وہ نسخہ موجود

ہے جو ۱۸۶۷ء میں غنی نوکھور صاحب نے لکھنؤ میں شائع کیا تھا۔ صفحہ ۱۹۲ میں خط کا آغاز رہائی سے ہوتا ہے:

والا نظر اسرار گمراہی گمراہ  
کز فیض تو یافت دوقی ایں کہنہ سرا  
یارب چہ کے لفظ شمس الاسرا  
جزویت تر اجزائے رقم نام ترا

اس کے بعد اپنی شاعری اردو فارسی کے بارے میں لکھتے ہیں:  
شعر و سخن را باہمو کترین بیجو روحانی است و خامہ از بدو فطرت  
در گہر افشانی در آغاز ریختہ گفتی و پہ اردو زبان سراے بودی تا بہ  
پاری زبان دوقی سخن یافت۔ ازاں دای عیان اندیشہ برتافت۔  
دیوان مختصرے از ریختہ فراہم آورد۔ آں را طبعہ طاقی فیاں  
کرد۔ کما پیش سی سال است پاری سال است۔

پھر عالم خط میں قصیدے کا ذکر کرتے ہیں:  
چہ قصیدہ از سبذ کہ غم دریاں آتش افروخت۔ نیم سوختہ آہ و از  
خرمنے کہ برق آں را پاک سوخت، دور اندوہ گیا ہے فرخا بخت  
عریضہ نگار کہ بہ تسمایہ چشم داشت، قبول داشت۔ روزے چند  
بشاردانی نہد و دریں تہائی داد ہدی خوش۔

اے منظر کل در ازل آچار کرم را  
مقت سر لوح ز اسم تو قلم را  
شمس الاسرا کز شرف نسبت نامش  
خود قبلہ بر اورنگ تعینان نجم را

جب عالم نے دیکھا کہ بھیجی گئی تصانیف کے بارے میں نواب  
سالار جنگ کی طرف سے کوئی رسید نہیں آتی ہے تو انہوں نے

دیوانی رشتہ کے بارے میں ایک اور خط ۱۱ ربیع الاول ۱۲۷۸ھ  
(ستمبر ۱۸۶۱ء) کو روانہ کیا، لکھتے ہیں:

در ماہ گزشتہ کہ بقضائے عمر فزائے سال اگست پیشانی و صفرائے  
پس ہی گزشتہ منتخب دیوان رشتہ کے تازہ بکاپ اعطائش فرو  
رشتہ اند در مومنین چارہ نہادہ بنظر گاہ روشن گزر گاہ حضرت فلک  
دعوت آسان سلیمان منزلت فرستادم۔ چوں درود ساری صیفہ بر اثر  
ارسال پادشاه اتفاق افتاد۔ در اندیشہ ہی سلیم کہ مگر اس نگارش  
حسب انگشکای پیشگاہ وزارت بودہ است و بمیان نیامدن سخن از  
رسیدن سفینہ اردو و خواہش مجموعہ نظم فارسی در گیرندہ بدیں اشارت  
بودہ است کہ بکار نیاید پیش کش آں باید... دیگران خواہم کہ  
رسیدن و نارسیدن دیوانی اردو باز دائم و نیز بدائم کہ طلب کلیات  
فارسی چنان کہ گماں بودہ ام بفرمان حضرت معظی القاب است۔ یا  
بمیں از جانب صیفہ طراز را در ہر دو صورت فرماں پذیری آئین  
خواہد بود۔

کلیات نثر (صفحہ ۲۴) میں ایک خط ملتا ہے جو غالب نے نواب سالار جنگ  
کی تعریف میں لکھا تھا اور جس کی رسید کے لیے وہ گرمند اور مضطرب تھے:  
قصیدہ مدحہ فرستادہ ہاشم و عیاض ہاشم کہ مطبوع طبع اقدس افتاد یا  
خدا۔ ایں خود سخت بود کہ در سراسر سبکی بزمان رفت۔ ہنوز ایں نیز ندانست  
ام کہ بنظر گاہ خدا انکان گزشت یا خود عرصہ در عرض تلف گشت۔

غالب نے نواب سالار جنگ کو اکسٹھ اشعار پر مشتمل اپنا قصیدہ بڑے اہتمام  
کے ساتھ بھیجا تھا۔ یہ قصیدہ میں نے نہایت اچھی حالت میں سالار جنگ میوزیم کے  
شعبہ مخطوطات میں خوب صورت فریم میں دیکھا اور میں نے اس کا فوٹو بھی حاصل کیا

جو کتاب میں مضمون کے ساتھ شامل کیا جاتا ہے۔ قصیدے کے چند شعر یہ ہیں:

در مدح خن چماں نہ گویم  
 شرط ست کہ داستان نہ گویم  
 از زہد و درخ خن نہ مانم  
 از بھ و طلیاں نہ گویم  
 بخار الملک را دریں عصر  
 جز آصہٴ جم نکاں نہ گویم  
 کوئی کہ بہ چشماہ خواب  
 بسیار گوسے ہاں نہ گویم  
 پاکیزگی نہاہ پاکش  
 جز در صلب قدیاں نہ گویم  
 در مرتبہ کارخ دولتش را  
 زیں ششدرہ شارساں نہ گویم  
 نازم بدش خن سراے  
 از گوہر خود نکاں نہ گویم  
 روشن دل و آفتکیں زیاںم  
 از دودہ و دودماں نہ گویم  
 در لقم بلعد پایہ راندم  
 دالاے خانماں نہ گویم  
 دالا کمرہ پھر چاہا  
 میرم اگر آں چہاں نہ گویم  
 ساسانہ چشم یم کہ خود را  
 جز سوہ سوہاں نہ گویم

ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ سے دو چیزیں نکلتی ہیں  
 ۱۔ جس سے ہم جانتے ہیں کہ ایک ہی جگہ سے دو چیزیں نکلتی ہیں  
 ۲۔ جس سے ہم جانتے ہیں کہ ایک ہی جگہ سے دو چیزیں نکلتی ہیں  
 ۳۔ جس سے ہم جانتے ہیں کہ ایک ہی جگہ سے دو چیزیں نکلتی ہیں

ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ سے دو چیزیں نکلتی ہیں  
 ۱۔ جس سے ہم جانتے ہیں کہ ایک ہی جگہ سے دو چیزیں نکلتی ہیں  
 ۲۔ جس سے ہم جانتے ہیں کہ ایک ہی جگہ سے دو چیزیں نکلتی ہیں  
 ۳۔ جس سے ہم جانتے ہیں کہ ایک ہی جگہ سے دو چیزیں نکلتی ہیں

ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ سے دو چیزیں نکلتی ہیں  
 ۱۔ جس سے ہم جانتے ہیں کہ ایک ہی جگہ سے دو چیزیں نکلتی ہیں  
 ۲۔ جس سے ہم جانتے ہیں کہ ایک ہی جگہ سے دو چیزیں نکلتی ہیں  
 ۳۔ جس سے ہم جانتے ہیں کہ ایک ہی جگہ سے دو چیزیں نکلتی ہیں

ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ سے دو چیزیں نکلتی ہیں  
 ۱۔ جس سے ہم جانتے ہیں کہ ایک ہی جگہ سے دو چیزیں نکلتی ہیں  
 ۲۔ جس سے ہم جانتے ہیں کہ ایک ہی جگہ سے دو چیزیں نکلتی ہیں  
 ۳۔ جس سے ہم جانتے ہیں کہ ایک ہی جگہ سے دو چیزیں نکلتی ہیں

ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ سے دو چیزیں نکلتی ہیں

عالمِ سلاور دکن نہ دارم  
 از تاق و سارہاں نہ گویم  
 ایں نیست نماز پنجگانہ  
 کس جہ نہاں ازاں نہ گویم  
 کافر ہاشم اگر شایست  
 بیست نہاں نہاں نہ گویم  
 شیام اگر دعاے دولت  
 از ہم نصاں نہاں نہ گویم  
 آہں ہشوم گر از سرشاں  
 ہ مردم ایں جہاں نہ گویم

قصیدے کی ابتدا میں عالم کی یہ بڑی مہارت بھی موجود ہے جو پہلی مرتبہ  
 سامنے آرہی ہے:

یارب در محرت فلک رفعت دانش خدو خداوان خدا جوئی و دانا  
 داور حق شای حق کوئی۔ بہرام رزم، ہدیہ رزم جناب امایوں  
 القاب نواب مختار الملک بہادر، دام اقبال، عذر تھا رواں دانشی  
 چکامہ و بنگاشی نیا شامہ مقبول و آمید فرمانی محض طراز بشیدین  
 آگہی از رسیدن محضہ راز محصور باو۔

قصیدے کے مطلوبہ اور فکری فنون میں الفاظ و ترتیب میں کچھ اختلاف ہو  
 ہے جو درج کیا جاتا ہے:

فکری:

کوئی کہ بہ پیش گاہِ خواب  
 بیدار گویے، ہاں نہ گویم

مطبوعہ:

مصرع اول میں "کوئی" کی بجائے "کفئی" ہے۔

تلمی:

از ویدہ دوی و پایہ دانی  
مسیح فرقاں نہ گویم

مطبوعہ:

ور ویدہ دوی و پایہ دانی  
مسیح فرقاں نہ گویم

تلمی:

والا گہرا سپر چاہا  
میرم اگر آچنناں نہ گویم  
مطبوعہ کلیات میں اس شعر کے بدلے یہ دو شعر ہیں:

والا گہرا سپر چاہا  
ایں ہا ز رو گماں نہ گویم  
نگ ست دل از ہجوم اندوہ  
میرم اگر آچنناں نہ گویم

تلمی:

ایک من ایں ترانہ ہا ما  
شورامہ ہاستاں نہ گویم

مطبوعہ:

ایں زمرہ ہے خوشچکاں ما  
شورامہ ہاستاں نہ گویم



قصی:

آئم کہ اگر ز آسائم  
پرسند ز ریمساں نہ گویم

مطبوعہ:

ایں یکہ اگر ز آسائم  
پرسند ز ریمساں نہ گویم  
ذیل کا شعر قصی نے (سالار جنگ) میں نہیں ہے:  
کارم بہ عزم و صفر باد  
شہر ہر و مہرگاں نہ گویم

قصیدے میں ردائی، سادگی، روئیف و توانی اور مدح گستری کے علاوہ فارسی الفاظ کے استعمال میں وہ ساری باتیں طوطی خاطر رکھی گئی تھیں جن کا ذکا نے مشورہ دیا تھا۔ قصیدہ اگرچہ طویل ہے لیکن اس قدر گفتہ اور سلیس ہے کہ ممدوح ایک ہی نشست میں پڑھ سکتا تھا۔ یہ نومبر ۱۸۶۱ء میں نظم کیا گیا تھا اور اسی مہینے میں نواب سالار جنگ کو ارسال کیا گیا تھا۔ ممدوح کو قصیدہ نومبر کے اواخر یا ۲ دسمبر ۱۸۶۱ء سے قبل مل گیا تھا اور پاور کیا جاسکتا ہے کہ نواب میر غلام حسین خاں صفدر جنگ حسام الدولہ فخر الملک، خیر معظم نواب صاحب موصوف کے انتقال ۲۳ دسمبر ۱۸۶۱ء سے پہلے موصول ہوا تھا۔ نواب سالار جنگ کی نظر سے قصیدہ گزرنے کی اطلاع ذکا اپنے خط میں غالب کو اس طرح دیتے ہیں:

قصیدہ مدید وصول ہوا۔ ممدوح نے اس کے اوراق دیکھے۔ دیکھا یہ کہ اس کے دیکھنے سے کیا کھلا ہے۔ اب جب کہ حالات بدلے، فخر الملک کی رحلت سے جگر ٹوٹن ہو گیا۔ یہ بلند پایہ جاہ مند وہ ہے کہ جس کی صاحب زادی جناب وزارت کی بیوی ہیں۔ اب مذت عزائم گزرنے تک میں کہاں، اور میں جو کرتا چاہتا ہوں

وہ کہاں! خط کا جواب دینا ضروری تھا اور آج جناب والا کے صحیفہ دل نواز نے مزید تاکید کا کام کیا۔ ان امور پر مشکل ایک خط لکھنا ضرور ہے جو پہلے عرض کیے گئے ہیں کہ اس زمانے میں ”کیا کیا“ اور ”کس نے کیا“ دونوں کا اکتھا ضروری ہے۔

ڈکا نے مذکورہ بالا خط کی آخری سطور میں مرزا غالب کو یاد دہانی کی تھی کہ وہ مختار الملک سالار جنگ صاحب کو عرض داشت بھی روانہ کریں جس میں اپنا تعارف کرا دیں۔ غالب نے ۱۰ مارچ ۱۸۶۲ء کو ڈکا کے کہنے کے مطابق نواب صاحب موصوف کو ایک عرض داشت بھیجی۔ اس کی ایک نقل ڈکا کو بھی ارسال کی۔ عرض داشت سالار جنگ کو موصول ہوئی اور ان کی نظر سے گزری۔ اس سلسلے میں ڈکا نے صورت حال دریافت کرنے کے لیے مزید جنگ و رد کی تھی۔ اس کی اطلاع غالب کو بھی روانہ کی۔ خط کے چند جملے یہ ہیں۔

نواب مختار الملک کے نام ۱۰ مارچ کو لکھی ہوئی عرض داشت نہایت درست و مناسب ہے اور اس میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا میری خاطر خطا اندیش میں کھٹکا تھا۔ یہ عرض داشت معروض الیہ کی نظر سے گزری۔ میں نے دفتر کے میرٹھی مولوی سید عبدالقادر کو اس پر آمادہ کر لیا ہے کہ وہ دوبارہ ذکر پھیریں اور جناب والا کے محاذ کو پھر سے گول گزار کریں، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ گزارش دل نشیں ہوئی اور عبارت شیریں نے خمیر کو جس طرح کام بخشی پر رجوع کیا ہے، وہ صاف جھلکا پڑتا تھا۔ جواب فرمایا جو مصلحت آمیز تھا۔ فائدہ اس کا یہ ہے کہ صلہ ضرور ہے اور واسطہ بھی۔ اس جواب سے کہ جو مصلحت وقت کے لحاظ سے خفیہ سازوں کا منہ بند کرتا ہے، یہ کہتا ہے کہ ”زبان آور ہندوستان“ کو پوشیدہ طور پر تعارف نہیں چاہیے۔ اس کے بعد اگر

عرض داشت اور قصیدے کا ٹکٹی ایکٹ دہلی یا کسی انگریز کے قونسل سے بھیجیں جو وہاں ذی اقتدار ہو۔ حضرت نے اپنے قلم سے جو فقرہ لکھا تھا، ممکن نہیں کہ اس کا بطلان ہو سکے۔ (فقرہ، بدخواہان نواب نواب مختار الملک بہادر بختی و بہرہ و بہرمن نیز نہادہ اندہ) [”خاش و غمناش“، ص ۱۳]

قصیدے کے بعد ذکا کے مشورے پر ۱۰ مارچ ۱۸۶۲ء کو غالب نے نواب سالار جنگ کو جو عرض داشت بھیجی تھی، وہ کہیں دستیاب نہ ہو سکی۔

قیام حیدرآباد کے زمانے میں غالب کا ایک خط ذکا کے نام میری نظر سے گزرا ہے۔ اس کا نمبر ۵۷۹۸ ہے۔ اس کے ساتھ حیدرآباد کی معروف شخصیت نواب سرآسمان جاہ کے چشم و چراغ نواب عنايت جنگ کا ایک خط بھی ہے جس پر ۳۸۹۳۹ نمبر درج ہے۔ غالب کا یہ خط اصل میں نواب عنايت جنگ کے پاس موجود تھا جو بعد میں انھوں نے کتب خانہ آصفیہ کی نذر کیا تھا۔ نواب موصوف صاحب ذوق تھے۔ ان کے پاس کچھ قلمی کتابیں بھی تھیں جن میں دیوان تیر کا قدیم نسخہ مکتوبہ ۱۱۹۲ ہجری بھی تھا جو بعد میں انھوں نے ڈاکٹر عی الدین قادری زود کو دیا تھا اور جو آپ ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہے۔ نواب عنايت جنگ صاحب نے غالب کا خط اپنے خط کے ساتھ جناب ڈاکٹر رحمت اللہ صاحب کیوریٹر کو ۲۲ اپریل ۱۹۵۵ء کو بھیجا تھا۔ اس کے ساتھ ذیل کا نوٹ بھی تھا، جس پر ۷۷ رجب ۱۳۳۲ھ کی تاریخ موجود ہے:

غالب دہلوی کا خط: یہ خط حبیب اللہ ذکا باللی کے نام ہے۔ خلیع نیلور مداس کے رہنے والے حافظ محمد میران (مدان) کے فرد نے تھے۔ ۱۳۷۲ھ میں حیدرآباد میں آپ کو مختار الملک نے ٹکٹی گری پر تقرر کیا۔ بعد میں دوم تعلق دار ہوئے۔ ۱۳۹۲ھ (۱۲۹۱ھ) میں انتقال کیا۔ ان کی تصانیف سے ”خاش و غمناش“ میرے ہاں موجود ہے۔ مفضل حالات ”تاریخ ناطہ“ مؤلفہ عزیز جنگ میں ہیں۔ سنا ہے، اچھے لایب اور بہتر شاعر تھے۔ مرزا مہدی خاں

کوکب سے اکثر ذکر آتا رہا۔ شاید کوکب کو تھکھ تھا۔ ۱۳۳۳ھ میں جوتپ مرزا محمد تقی خاں تقی جو کب خانہ آصفیہ سے تعلق رکھتے تھے اور سید علی شوستری کے شاگردوں میں تھے۔ چند کتابیں میں نے غریبی تھیں۔ من جملہ ان کے ایک دیوان صائب تھا جو خطبہ صائب حاشیہ پر۔ بعض جگہ صائب نے کچھ اضافہ اور کمی کی ہے جس کو میں نے پروفیسر مرزا حسین علی کو تھکھ ان کے ذوق کا لحاظ کرتے دے دیا۔ آخری حصہ غبار ہے۔ اس خط میں جس قصیدے کا ذکر کیا گیا ہے، گمان ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ سرکار کی شان میں ہے۔ دارالانشا کا ذکر ہے۔ دارالانشا کا تعلق ذات شاعری سے تھا۔ کہیں سے مطبوعہ نسخے میں ہو تو پتا چلے گا۔ میرے والد مرحوم کے لئے والوں میں سے تھے۔ اکثر یہ ضمنی تذکرہ میر انیس ان کا بھی ذکر فرمایا کرتے تھے۔

غالب نے مذکورہ بالا خط سے پہلے ذکا کو ۱۰ ربیع الاول ۱۳۶۹ھ (مطابق ۲۶ اگست ۱۸۶۳ء) کو ایک خط لکھا تھا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ نواب سالار جنگ نے میری طرف کوئی توجہ نہیں فرمائی۔ خط کے ضروری پہلو یہ ہیں:

میں برس دن سے بیمار اور تین مہینے سے صاحب فراش ہوں۔ اٹھنے بیٹھنے کی طاقت مفقود، پھوڑوں سے بدن لالہ زار، پوست سے ہڈیاں نمودار۔ پھوڑے ایسے جیسے انگارے سلگتے ہیں۔ اعضا پر دس جگہ پھائے لگتے ہیں۔ ضعف و ناتوانی علاوہ، سوزِ غم ہاے نہانی علاوہ۔ صحتِ سہل متعین میں میں نے نواب علی الملک کو قصیدہ بھیجا، کچھ قدر دانی نہ فرمائی۔ ایک کم سٹر برس کی عمر میری ہوئی۔ سوائے شہرتِ خشک کے فن کا کچھ پھل نہ پایا۔ ”احسن و مرہب“ کا شوق سامعہ فرسا ہوا۔ غیر ستائش کا حق ستائش سے ادا ہوا۔ علی الملک نے یہ بھی نہ کیا۔ نہ مدح کی داد دی، نہ مدح کا

صلہ دیا۔ حیران ہوں کہ نواب صاحب مجھے کیا سمجھے۔

عالمِ ۲۵ ستمبر ۱۸۶۳ء کے خط میں ڈاکا کو لکھتے ہیں:

ناچار اب آپ سے یہ چاہتا ہوں کہ آپ مولوی صاحب سے ملیں اور ان کو یہ خط اپنے نام کا دکھائیں اور میری طرف سے بعد سلام میری کلیات کے پارسل کا ان کے پاس اور ان کے ذریعہ عنایت سے اس جملہ کا حضرت ملک رفعت نواب عثمان الملک بہادر کی نظر سے گزرتا اور جو کچھ اس کے گزرنے کے بعد واقع ہو دریافت کر کے مجھ کو مطلع فرمائیں۔

آخر میں عالمِ کا وہ خط درج کیا جاتا ہے جو انھوں نے ڈاکا کے نام ۱۶ جمادی الثانی ۱۲۸۰ھ<sup>۲۲۵</sup> مطابق ۲۸ نومبر ۱۸۶۳ء کو لکھا اور جو نواب عنایت جنگ کے پاس محفوظ تھا۔ اس خط میں عالمِ نے قصیدے، عرض داشت اور پارسل کا ذکر کیا تھا۔ جس میں دیوانِ عالمِ (اردو) اور کلیاتِ عالمِ (نظم) رجسٹرڈ ڈاک سے بھیجا تھا۔ پارسل کے بعد مرزا نے یاد دہانی کے طور پر مسلسل نو عرض داشتیں نواب سلاور جنگ کو بھیجی تھیں۔ نواب صاحب کی طرف سے نہ تو عالمِ کو کتابوں کی اور نہ ہی کسی خط کی رسید ملی تھی۔ دیوانِ رشتہ کا جو نسخہ بھیجا تھا وہ عالمِ مطبع احمدی اسوہان دہلی کا تھا جو ۲۰ صفر ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) کو چھپا تھا۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ خط کی عبارت ملاحظہ ہو:

بندہ پورا پورے مولوی صاحب کا خط آیا تھا، مکتب فیہ پہ سنبھل نقل ہے... آج مسودہ عرض داشت کا جو آپ نے مجھ کو بھیجا تھا، چھکا و آقاے نامدار گزارنا اور اپنے نام کے خط کا بھی پیش کرنا مناسب جانا۔ بعد ملاحظہ کے یوں ارشاد ہوا کہ قصیدہ اور عرض داشت کی تحقیق اور تلاش کی جاوے جو دارالافتا میں ملے تو جواب لکھا جاوے۔ یقین ہے کہ بعد گرد آؤںی کا اخذات کے اگر



عرضداشت مل گئی یا قصیدہ نکل گیا تو جواب ملے گا۔ اب میں  
بقول صاحب:

وہ مائتہ کار خودم حیرانِ اطوار خودم

ہر لحظہ داندِ نیستی چوں قرعہ رمال ہا

یوں سمجھا ہوا تھا کہ نو لغانے جو علی التواتر یکے بعد دیگرے ارسال ہوئے  
ہیں، متواتر دارالانشا میں پہنچے ہوں گے اور میرٹھی نے حضو میں گزارے ہوں گے۔ اب  
ثابت ہوا کہ دفتر پہنچے بھی تو مرجع کی نظر سے نہیں گزرے بلکہ بعید نہیں جو فٹنی نے  
چاک کر کے پھینک دیے ہوں۔ مانا کہ یوں ہی ہوا۔ بشرط اتفاقات مولانا میرا مطلب  
اس صورت میں بھی فوت نہیں ہوتا، یعنی مولوی صاحب کہہ سکتے ہیں کہ یہ جو نذر اس  
کی میری معرفت گزری ہے اس کے قبول ہونے کی عجز اطلاع میں وہی کچھ لکھا جائے  
جو قصیدہ و عرضداشت کے گزرنے کے بعد لکھا جاتا۔ مولوی مؤید الدین خاں صاحب  
جو حضرت کے مقرب اور اس حضرت میں میرے مقرب ہیں، یہ کلرے مؤخر کہہ سکتے ہیں،  
مگر میں ان سے نہیں کہہ سکتا کہ آپ یوں کہیے۔ خیر جو ہوتا ہے ہو رہے گا۔ تم کو یہ  
اطلاع دے کر اطلاع کرتا ہوں کہ آیا وہ دنوں کاغذ دفتر سے نکل کر پیش ہوئے یا  
نہیں ۱۲۔

آگے اس سے جس دن دہقان کا پارسل اور خط مولانا کو بھیجا ہے اس کے  
دوسرے دن ایک پارسل اور ایک خط آپ کو میں نے بھیجا ہے۔ آج تک اس پارسل کی  
رسید میں نے نہیں پائی۔ سخت متعجب ہوں۔ اگر وہ پارسل پہنچ گیا ہے تو اس کی رسید  
مجھے۔ اگر نہیں پہنچا تو وہاں کے ڈاک گھر میں دریافت کیجیے اور میرے خط کا جواب  
جلد لکھیے۔  
نجات کا طالب، غالب

ہاں، خوب یاد آیا، وہ قصیدہ بھی اس کلیات میں مطبوع ہو گیا ہے۔ صفحہ ۳۲۶  
سطر ۱۲۔ دفتر سے قصیدے کا کاغذ نہ نکلنے کی صورت میں بھی قصیدہ ممدوح کی نظر سے گزر  
سکتا ہے۔

والسلام مع الاکرام





## مرزا غالب اور مفتی میر محمد عباس<sup>۱۵۱</sup>

مرزا غالب خاندانِ اجتہاد لکھنؤ کے علما کا بے حد احترام کرتے تھے اور ان کی علمی استعداد کے قائل تھے۔ ان میں سے جن بزرگانِ دین کے ساتھ ان کے تعلقات و مراسم مربوط و استوار تھے ان میں خانوادۂ غفراں کاب کے چشم و چراغ سلطان العلماء سید محمد قبلہ، سید حسین سید العلماء، سید تقی صاحب ممتاز العلماء وغیرہم قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ مرزا صاحب میر محمد عباس قبلہ مفتی صاحب کے بڑے معتقد اور مداحوں میں تھے۔ مفتی صاحب عالم، جید اور فاضلِ یگانہ تھے۔ دینی معاملات میں مرزا صاحب ان سے استفادہ کرتے تھے۔

مفتی صاحب کے جدِ اعلیٰ سید نعمت اللہ بزازری تھے۔ ان کی ولادت ۱۰۵۰ھ (۱۶۳۰ء) اور وفات ۱۱۱۲ھ (۱۷۰۰ء) میں ہوئی تھی۔ سید موصوف مقتدرِ عالم اور طبائے اراکین تھے۔ تقریباً ایک سو کتابیں مہسوط، علومِ معقول و معقول میں ان کی تالیفات و تصانیف ہی سیں۔ یہ کتابیں عراق و ہجیم کے مجتہدین میں مروج ہیں۔ ان کا سلسلہ نسب ۷۱ پشتوں سے امام موسیٰ کاظم تک پہنچتا ہوتا ہے۔

فرستاده  
و بهایه مسدود

و کسب که بجا است از کسب	و کسب که بجا است از کسب
از عابدین مسلمانان که	از عابدین مسلمانان که
است و بدو عهده و کلام	است و بدو عهده و کلام
بر سبب حاضریه و دان	بر سبب حاضریه و دان
امام این اعلام و تنبیه	امام این اعلام و تنبیه

<p>و کسب که بجا است از کسب</p> <p>از عابدین مسلمانان که</p> <p>است و بدو عهده و کلام</p> <p>بر سبب حاضریه و دان</p> <p>امام این اعلام و تنبیه</p>	<p>و کسب که بجا است از کسب</p> <p>از عابدین مسلمانان که</p> <p>است و بدو عهده و کلام</p> <p>بر سبب حاضریه و دان</p> <p>امام این اعلام و تنبیه</p>
---	---

نور خطی میر محمد عباس

مفتی صاحب کے جہز امجد سید محمد جعفر، عہد نواب آصف الدولہ بہادر میں ۱۲۱۰ء (۱۷۹۵ء) میں شومڑ سے وارہ لکھو ہوئے تھے۔ ان کے بارے میں ”تختہ العالم“ (سال تصنیف ۱۲۱۶ھ) میں مذکور ہے کہ:

واللہ لا ذہر البید محمد جعفر بن البید طالب سلمہ اللہ از عباد و  
پارسایان روزگار و در حسن خلق و ہمت فطری ثمرہ ادوار و بخیر  
خواہی عباد از اعلیٰ و ازلی معروف و بہ ہمیش بانہاج مطلب  
سائین معروف و در آداب مجلس و رنگینی صحتی سلیقہ اش بکمال  
رسائی و در جود و ایثار دانی تاریخ افسانہ حاتم طائی است۔ فیاض  
متعال، خلقے پاکرامت کردہ است کہ باوجود بے بضاعتی ہرگز  
سائل را محرم نہاشد است۔ در پلمپ حال تحصیلی مقدمات را در  
شومڑ نمودہ و در قاری و عراق بہ تحصیل طب و نجوم پرداخت و در  
ہر دو بکمال رسید۔ از آنجا بہ ہندوستان افتادہ بآکامی بسر برد۔ حقیر  
او را پاں نواح تحدیدہ یوم۔ مراسنہ رشاع بود کہ او برآمد، بگلندہ  
کہ رسیدم از وفور اشتقاقی برادرانہ از لکھو بانجا رسید۔ و بایں  
سعادت مستفیض گردانید۔ حالیا ہم در آن بلدہ روزگارے بہرت  
دارد۔ بہ طبابت مشہور و بجاییت درویش و آزادہ است۔ توفیق عود  
یومین نہ گشت۔

سید محمد جعفر نے باقیات صالحات میں دو اولادیں چھوڑیں۔ سید علی اکبر  
(والدہ مفتی صاحب) اور سید عباس۔ سید علی اکبر نے شومڑی خانگانی رسم کے مطابق  
اپنے بیٹے مفتی صاحب کا نام چچا کے نام پر حمزہ سید عباس رکھا تھا۔ سید علی اکبر فارسی  
زبان پر قدرت رکھتے تھے۔ اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ قاری میں شعر کہتے تھے  
اور علی گھس کرتے تھے۔

سید علی اکبر کا انتقال ۱۰ رجب ۱۲۶۱ھ (اگست ۱۸۴۵ء) میں ہوا مفتی

صاحب نے مثنوی ”دردِ شاہوار“ میں ان کے مختصر حالات نظم کیے ہیں۔ ان تاریخ وقات کے قلمے میں لکھتے ہیں:

حضرت سید علی اکبر لقب آنکھ بودے نیک نام اعد نام  
حیرت حُتّان و طابت در خن غیرت حُتّان و دانت در کلام  
با لباس کہن و با نان خشک تر زباں از حکم حق بودے مدام  
بذلہ سنج و شندہ رو با ہمدان گرم آہ و گریہ در بزم امام  
رفت و از خار و نصیب دنیا کشید دامن و شد راجی دارالقام  
خامہ تاریخ و قاتل زد رقم  
شد مقیم گلشن دارالسلام

مفتی میر سید محمد عباس وہ شبہ آخر ربیع الاول ۱۲۴۳ھ (اپریل ۱۸۰۹ء) کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ”خود ہیچ کمال و ادب“ تاریخ ولادت ہے۔

مفتی صاحب نے ابتدائی کتابیں پڑھنے کے بعد سات برس کی عمر میں مولوی عبد القدوس صاحب (شاگرد ملا حسن صاحب) سے ”شرح سلم“ سے ”مصباح“ شروع کی۔ اس کے بعد مولوی قدرت اللہ صاحب (شاگرد بحر العلوم مولوی عبد اعلیٰ) سے کتب معقولات و حساب و فلسفہ و فنیّت و ہندسہ پڑھ کر چودہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے اور کتب جنی کا سلسلہ شروع کیا۔ دیگر علما کے علاوہ مفتی صاحب نے سید اعجاز آغا سید حسین، مولوی قدرت علی اور سچ الدولہ مرزا حسن علی جاناں سے بھی استفادہ کیا تھا۔

مفتی صاحب کا انتقال ۲۵ ربیع ۱۲۰۶ھ (مارچ ۱۸۸۹ء) کو لکھنؤ میں ہوا۔ مولانا سید اولاد حسین صاحب سلیم نے ذیل کا قلم لکھا:

در لحد خوابیدہ چوں مفتی ما خاک حسرت بر دل فزونی قناد  
از زمیں برخاست شور ہائش نالہ با در سکون عطر قناد  
سویچ سوز غم دل ہر دل دل آتش اعد عالم جانہا قناد

چوں بیامید الخب خوں در تاب شب باصرہ از دیدہ قنّو قنّو  
خاک پائش کے جدا گشت از جہاں گونیا عرش خدا از جا قنّو  
نیست لعلب ناخدا کز شارخ دہر حلیب گلشن زہرا قنّو  
اے سلیم ارکان سائش را مگر

آہ قصر اجتہاد از پا قنّو

مفتی صاحب امام بارگاہ غفران مآب میں دفن کیے گئے۔

مفتی صاحب بادشاہ احمد علی شاہ کے عہد میں محکمہ وزارت کے مفتی قرار دے دیے گئے تھے اور واجد علی شاہ کے زمانہ سلطنت (۱۸۴۷ء تا فروری ۱۸۵۶ء) تک بدستور یہ عہدہ ان کے حلق رہا۔ بادشاہ کو مفتی صاحب سے بے حد عقیدت تھی۔ علی الخصوص مفتی صاحب کے اشعار و منظومات سے خاص دل بٹگی تھی۔ موصوف نے اپنی کتاب مشنوی ”صحیح چمن“ کا ایک نسخہ بادشاہ کو بھیجا۔ بادشاہ نے اس کی رسید میں ۸۹ اشعار نظم کر کے بھیجے، چند شعر یہ ہیں:

سلطان اودھ قراب اقدام	واجد علی جس کا دکھا ہے نام
چارچ دوم بھی مہینا	اس سن میں ملا عجب خزینا
جب ”صحیح چمن“ کتاب پائی	فی الغور وہ پھولوں میں بیکائی
سبحان اللہ، رکب دریا	یہ علم ہے یا کہ مجرہ تھا
ہر بیت پہ بیت حق کا دھکا	مضمون نہ تھے، رہن ملک تھا
اس صحیح چمن کے آگے ہے خار	نظام خوں تو درد ناز
اور دھمک و حمیرتی و متعل	صائب سے فزوں ہوئے ہیں بیدل
اور محکم اس سے ہے حشم ہے	جو مدح کروں بہت ہی کم ہے
فردوسی کو ہے ملا بیاباں	خاکانی گدائے شہر کہیاں
افزون کہیں تیر سے ہے سید	ہے پائے جلال امیر از حد

خبر سند رہیں جناب مہاش

نے ٹکڑہ نہ غم ہو اور نہ دواں

مفتی صاحب نے عظیم سلطانی کے جواب میں ایک عرضداشت رقم و قلم میں اور ایک قصیدہ بھی قلم کیا تھا۔ ان کے اور بادشاہ کے درمیان مکاتبت بھی تھی اور آپس میں اپنی تصانیف ایک دوسرے کو بھیجتے تھے۔ واجد علی شاہ کا انتقال ۱۳۰۵ھ (ستمبر ۱۸۸۸ء) کو ہوا۔ ان کے اخلاق ستودہ اور اوصاف حمیدہ کے بارے میں مفتی صاحب لکھتے ہیں:

واجد علی شاہ سی و دو سال بعد استزاج سلطنت در مصائب شدیدہ از جس خوش و خوش والدہ و برادر و دلش و تھنہ صد ہزار روپیہ ماہ وار باوجود گرفتاری کز دفر شہر یاری، کمال تواضع و خاکساری و عزاداری و نماز گزاری و غریب پروری و ہر گستری شیعہ و شعار خود ساختہ و طرح عمارت سازی نقش و نگارے کہ چہاں رنگاری عمدہ انداخت۔ و زیادہ از نصف شہریہ خود برائے ملازمان و کارگزاران مقرر بہ پردوشی فرما پر داشتہ و در تقسیم و توقیر حقیر چچ و قچہ فرو کذاشت۔ روزے چہر ما برداشتہ منی خادماں بہت سرمن از قیسن تا مسجد کہ نیلے راہ بود پیادہ رفت۔ روز دیگر مراطلید۔ در اثناے کلام و کلام کفتم۔ شاہ خاتم السلاطین مستید۔ گفت بعد از من سلطنت تو ابد ماند۔ برائے تسکین خاطرش کفتم خاتم بہتگی بگستری آمدہ است۔ غلامہ ہامن عظیم حقیدہ داشت۔ لکن صحبت حاسدین و مفیدین او را کذاشت کہ اشاعت دیں باعانت او بہ وسب ممکن شود۔

مفتی صاحب نے واجد علی شاہ کی تاریخ وفات یوں لکھی:

واجد علی آں ہجر ما قیر اعظم شد تیرہ و تار از غم مرگش بہ عالم آں بحر کرم رفتہ ازین گلشن غانی کز دے شدہ ہر خار چو گل تازہ و نرم وسب اہل از غیر رنگاری اٹھاک ہر جگر خستہ دلاں ساختہ مرہم

شیدائے حسینؑ اپنی علیؑ بود و علم او گردید دوبالا سوم ماہ عزم  
کنز الفقرا بود و پنهانی ز وقاش ہے درہم و دینار شدہ درہم و برہم  
تاریخ وقاش چو زمن خواست دل من  
کفتم ”خیر اسلام دلا رفت ز عالم“

مفتی صاحب کو فریق شعر سے خدا داد مناسبت تھی۔ عربی، فارسی، اردو، تینوں  
زبانوں میں ان کا مذاق سلیم تھا۔ انہیں ان تینوں زبانوں پر حیرت انگیز قدرت حاصل  
تھی۔ نمونے کے طور ”میل بے نقط“ کی مثال پیش کی جاتی ہے:

عالم مرام عدل و داد ساک ساک صلاح و سید او مالک  
سماکب ولا و داد، محرم اسرار کردگار، مریح دلی سوگوار، سردار اعلیٰ  
کرم سرکردہ اولوا الہم، ملائم اسلم سلم اللہ الاکرم۔ اہم مرام و  
اؤل کلام حصول مہام امور و حصول حال سرور۔ دیگر محرم بطور امداد  
کدہ مکرمہ و حرم رسول اللہ و بحال مطہرہ امام دلدل سوار و آل  
اطہار دار۔ تمام عدم مال و درم سید راہ مامول کہ اعطاء ماہ وار  
دوسہ ماہ را حکم تمام حوالہ کلکب گوہر سلکب گرد، کہ درہم محدودہ  
در رسد و کام دل روا گرد، دوسہ سطر کلام عاقل را رونما اصلاح  
ارسال کرد۔

سرم را کہ سودا عطا کردہ	ہمہ دورہ سر را دعا کردہ
سحر دورہ گردہ ہوا و ہوس	مگر دورہ سحر ہا دعا کردہ
ہمہ سال و مہ دارم آہ و الم	کہ ہر سال و مہ کار ہا کردہ
مرا کار گردہ گدہ جد گدہ	گردہ ہا کہ در طرزہ ہا کردہ
سرخ آہ دلا راہو صبر و دلا	کہ طول اہل را رہا کردہ
دہ لعل ہم کام دلہا خام	کہ اہل ہوس را صلا کردہ

دہ طول در راہ صبر و کرم  
اگر وعدہ و پلے ما کردہ

مفتی صاحب کی غزلوں کا دیوان غیر مطبوع ہے۔ غزلیں زیادہ تر واقعات کے حلقے ہیں۔ دیوان کی پہلی غزل نصرت سے شروع ہوتی ہے۔ مطلع و مطلع کے دو شعر درج کیے جاتے ہیں:

اے مر میر آستان تو عرشِ عظیم را و ز پایے تو سراغِ رو مستقیم را  
سید کہ بچہ تاب و توان در بدن نہ داشت مدح تو زندہ ساخت عظیمِ ربیم را  
ذیل میں مفتی صاحب کی چند غزلیں بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں۔ سلاست و روانی طبع ہر شعر سے پیدا ہوتی ہے۔ اس غزل میں اپنی موجودہ حالت اور کھٹکھٹ حقائق کا ذکر کیا ہے:

گمزارِ فکرتِ بجا را	کویم جو شکوہ وقا را
یاراں کہ غلطو می نویسند	چچیدہ ہزار عقدہ پا را
بھٹے بہ امیدِ امیں کہ کویم	تاریخِ حوادثِ قضا را
برے بہ ہوائے امیں کہ سازم	چوں فرشِ حریمِ بودیا را
امیں شکوہ ز جورِ چرخِ دارد	تا دورِ کسمِ اردو بلا را
اے می طلبِ دلیلِ من	تازہ بدیم بہ او عطا را
امیں فتویٰ و حکمِ شرع جوید	واں قطع و معززتِ دوا را
امیں ککتہِ ظلم و نثرِ پرسد	دیں سورہ و آیہ و دعا را
خواہد رضائے خویش از من	با امیں ہمہ اختلافِ آرا را
تھا من و امیں جماعتِ خلق	کک از نے و راہِ سبکِ خارا را
پناری و رنج و فکرِ جوی	بیکارِ گندہ دست و پا را
تقدیرِ سوالِ خلقِ سازم	با حیلہ پرستیِ خدا را
شد خج بہ بندہ جانِ شیریں	امیں غصہ چہاں کسم گوارا را



چوں طرد کسم بزار تالی گویند نہان و آشکارا  
اے چشم تو کدو گر یہ تے کے

ہوئیں جواب خط ماما

اے گل از من حجاب تا کیجا بر نداری نقاب تا کیجا  
مرگ مایہ میل ی آید سرکشی چوں حباب تا کیجا  
لرزہ بر عرش و کرسی افتاد است اے دلم اضطراب تا کیجا  
سالمہ شد لکھو لطفے نیست اے خدا ایں کتاب تا کیجا  
قلقل الرئیل برپا شد

ستیا نوش خواب تا کیجا

تا کیجا درہد گدائی من بر درت چوں شود رسائی من  
دل ہوشاک عہد و بچان ست توبہ ام محبت ڈاڑھائی من  
تا گنہ ذوق آفریں دارم دایے من دایے خود سستی من  
دل پریشاں، دماغ آشفست دست و پا طالب جدائی من  
ی کسم آہ دور از منزل آہ از تاوک ہوئی من  
پہدہ از رویے کار افتادہ من و ایں طامعہ کذائی من  
تشنہ برہمن بہ چوستانی جاب کعب جہ رسائی من

ستیا آنکھ بست کار مرا

ی کند خود گرہ کشائی من

مردوں رقم دلا زیں خار زار آہستہ آہستہ  
نفس از ناتوانی سبک ماہ زندگی بودہ  
غلش ہائے علاقہ خست کیرا بود در خاطر  
ز تہد عمر در کف دایتم کاٹین حور عین  
تین زارم نکال ی خود از باد سحر گاہاں  
رسیدم بر در آں گلخوار آہستہ آہستہ  
گر لقم بر سر منزل قرار آہستہ آہستہ  
ز پاسے دل کشیدم خار خار آہستہ آہستہ  
رہود ایں مایہ از من روزگار آہستہ آہستہ  
شدم بدوئی ایں مرکب سوار آہستہ آہستہ

نمی دایم کہا شد کاروان عمر ما منزل درای دل صدا زد چند بار آہستہ آہستہ  
 بود نازک تر از قوائے جہاںمے کہ من دایم  
 قدم بر مرہ سید گزار آہستہ آہستہ  
 کلاے فن کو لکھو سے ایک محبت تھی۔ یہ جذبہ ملحق صاحب کی ایک غزل  
 سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

گرچہ رائل شد شباب لکھو عشوہ با دارد جناب لکھو  
 ہست در نکلند گرسم و زری کیما باشد تراب لکھو  
 غیرت معور ہائے عالم است ہیر ویران خراب لکھو  
 بمضیر بلبل شیراز ہست در نوا نخی خراب لکھو  
 لب فرد بہتی اگر شستی عمر باریاب قاریاب لکھو  
 ی دہ یاد از نصیم بہت غلہ لطف و عیش بے حساب لکھو  
 ہر کہ رفت از لکھو خوابش بود در خیال خورد و خواب لکھو  
 ملحق صاحب کو جملہ اصناف سخن پر دستگاہ حاصل تھی۔ انھوں نے حد و  
 قصیدے کہے ہیں۔ عرقی کے مشہور قصیدے ”ترجہ اشوق“ پر ایک قصیدہ لکھا۔ وہ سید  
 حقیق کرتے تھے:

عرقی:

جہاں بکشم و دروا کہ چچ شہر و دیار دیاختم کہ فردشہد بخت در بازار  
 سید:

ترا کہ نیست بکف چچ دریم و دنیا۔ چہ سود ازیں کہ فردشہد بخت در بازار  
 سحر کہ شد تر و شتاب گلشن اقبال  
 ز آشیانہ برآمد ہائے زریں ہال

ملحق صاحب نے مجرہ نظام کے کلام کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ ان کے جواب میں

بہت سی رباعیاں کہیں۔ چند رباعیاں ملاحظہ ہو:

خیام:

من نے خودم دہر کہ چوں من اہل بود      نے خود دیا او خوش خدا سہل بود  
نے خود دیا من حق ز ازل می دانست      گر نے نورم علم خدا جہل بود  
ستید:

نے خود دیا تو پیشہ نااہل بود      خست است خراب و خود نش سہل بود  
در فعلی تو علم حق نہ دارد تاثیر      پس نسبت فضل بحق جہل بود  
خیام:

ناکردہ سناہ در جہاں کیست، بگو      آنکس کہ گنہ نہ کرد چوں زیست، بگو  
من بد کنم و تو بد مکاریات دہی      پس فرق میان من و تو چیست، بگو  
ستید:

خو و کرم از خدا مگر نیست، بگو      در بہت پس اعتراض تو چیست، بگو  
گر در عوض ستم کوئی بکنہ      پس عدل چہ چیز و صاحب کیست، بگو  
مطلق صاحب کی ایک غزل پروژہا رباعی ملاحظہ ہو:

فریاد کہ فریاد رسے نیست مرا      جز دُور دلم ہم تھے نیست مرا  
یارب تو بفریاد من خست برس      غیر از تو بداریج کسے نیست مرا  
گلدستہ یارانا دلم آہ چہ شد      در دور بجز خار و نئے نیست مرا  
راہِ عزیزان و شکست ست دلم      زان قافلہ آفتوں جرے نیست مرا  
در حظِ امانات چہ مدہر کنم      جز دُور دریں جا مسے نیست مرا  
خواہم کہ مرا دا بگذارند بمن      از غفلت جز ایں طعنے نیست مرا  
ستید شدہ ام میر و گلزار جہاں

جز دیدنا جگہ ہوسے نیست مرا

تاریخ کوئی: مطلق صاحب کو اس صعب خاص میں کمال حاصل تھا جو بڑے

بڑے شاعروں میں بھی نہیں تھا۔ استخراجِ مادۂ تاریخ ان کے لیے اسی طرح آسان تھا جس طرح نظم کر لیتا۔ بغیر تخریج اور تفسیر وہ بہت جلد تاریخ نکال لیتے تھے۔ موصوف کی جس قدر تاریخیں میری نظر سے گزریں وہ سب منافع سے بالامال اور منفائی سے ہم دوش ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں سوائے تاریخ کوئی کے دوسرا کام نہیں کیا۔ لکھنؤ کے مشہور مقابر اور عطا کے حزاروں پر ان کی بے شمار تاریخیں کندہ ہیں۔ اگر ان تاریخوں کا مجموعہ مرتب کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب ہو جائے گی۔ چند تاریخیں دوح کی جاتی ہیں:

(۱) تاریخِ وفاتِ سید العلماء سید حسین قبلہ فرزندِ غلاماں مآب:

لغات ز رطلج ہمام سید الشہدا کہ عیست چچ کس او را دریں زماں ہوتا  
 جس کہ ہر طرف افتاد شور ماقم او بکربلا و نجف، ہند و یثرب و بلخا  
 فرا گرفت مصیبت یہ مسلم و کافر زندہ بر سر و صورت لبتہ و ابدا  
 یا زیارت ایں تہ شریف بکن کہ ی رسد ملائک ز آساں انجا  
 گزار پاسے ادب سالِ فوت او برخواں

”حزاد مرقہ منور سید العلماء“

”ادب“ کے ۷ اور آخری مصرع کے ۱۲۶۶ نکلتے ہیں۔ کل اعداد ۱۲۷۳ ہجری

کے ہوتے ہیں:

(۲) تاریخ طبع کتاب ”مجلس بازر“

دشیم سید تاریخ غمیش  
 چب سر روشن برآمد ز مطلع

(۳) تاریخِ روزنہ فضل حسین (۲۳ شعر)

رواقش مسقا و مرغوب و موزوں چہ بیچ ز ایات رنگیں نکارے  
 کم بر شا عرض تاریخِ روزنہ چہان مسلم باشد حزارے

(۳) تاریخ ہے عمارت لکھنو، صلیبی حسین آباد:

ہم نام مصطفیٰ و علی بادشاہ عصر کا وصف اور حاتم و کسریٰ تو اس شہید  
آوازہ بٹائے عزا خانہ کے ساخت درخش درخش جہت قرار و ہفت آسماں شہید  
سید دریں مقام رسید و چشم دید کھینچے کہ از ارم و از جہاں شہید  
چہ بر ضرب پاک نگاہ من افکند آہ زدم ز گوش کبر آسماں شہید  
یا جدا عجیب مقامے کہ از ازل نے چشم چرخ دید و نہ گوش جہاں شہید  
سال بیاں ما چہ لم کرد جستجو آواز کرے از ملک پاساں شہید  
مکتا علیا میر تقی اور نوشتہ ایم

ایک نواسے ناک زہرا تو اس شہید

اسی حالی شان عمارت کی تشریف میں ذیل کی عبارت بھی نہایت لطیف

تحریر کی:

سبحان اللہ! جب مکانے دل کشا کہ بھجے خبر مرثیہ ما یادی  
آرد۔ و بر ارم ذات البہاد خاک حسرت ی بارہ کھینچ چوں  
مطر دید، منور و کھنکھ از ممکن پیڑ صاف تر، قہر طلائعش روکش  
آفتاب تابان و جہر بیتائش حیرت بخش گروان گرداں، خوش از  
دلال سلطیل سبب زن و روض پابست عدن ہم خن۔ خاش  
پاشیرہ صندل آلود و نسیم کدورت دہا زودود۔ روئے زمینش  
آئینہ رخسار حور العین و شکوفہ بریا پیش پر تو انوار غلہ بریں۔ سبحانہ ما  
اعظم شایہ آسماں ما بجائے قطرہ در جزہ پایہ انداخت۔ آنگاہ شہ  
از ملک رخش مرقوم تو اس ساخت۔ مرغ وہم در وسعت آبادش  
پر و بال ی ریزد و طائر خیال از ادب خفیش برنی خیزد تا چشم  
نگار گیاں بر آں مکان ی افتد۔ بار نظر بدامن فضا کش ی بیخ و

ہیکویشی صوبہ اور جزائر خالعات است و ستونہائش و قائم سادات۔  
 فروزش چوں فتون علم معظم و اصولش چوں اصول دین حکم۔ اما  
 باہر دل کشائی ہوش رہا است۔ چرا کہ عزا خانہ سید الشہدا  
 است۔ رنگ آمیزی ہدایت از خون دلہا و شور انگیزی بلبلانش چوں  
 فریاد غمگنا:

تعالیٰ اللہ جب ماتم سراے کہ باشد در کنارش کربلاے  
 صدائے بلبل انجا دردناک است قباے ہر گل از غم چاک چاک است  
 کعبتِ ی زہد گلابِ خوابار مگر خونِ جگر دارد بہ مقدار  
 سرور محبتش یاد آور کامیاب جوانانِ حسین علیہ السلام و موجِ خیرے  
 جھونش مذکرِ غلامِ اہلبیت کرام۔ سبزہ دہش ہر گلابِ عیسے ہے  
 زنگاری و از ہوا شہارِ افسردہ تر از دلہاے نگارے۔ سرئی گہا  
 عیشِ دُخاے امامِ مظلوم و شورشِ بلبلانش سراجِ شیعہ لب و اہم  
 کلوم۔ شہادتِ بمانا جگر پارہ ہے امامِ حسن و قارنش بر یاد  
 مظلون قباے کربلا کو لو زن۔ آبشارش مثلِ چشمہ فرات در جوش و  
 غیبِ ہائش مایہ اہلِ مبر و نہات خاموش۔ حصونش از فرطِ غم پشتِ خم  
 ز رومش الم و برہم و برہم۔ سنبلش ماتاے خواطر پریشان۔ نوافش  
 مثلِ ریختن خونِ فشان۔ گلشن چوں صبح گل شدہ ہے دور و دوشش  
 چوں لہجائے تپِ زدہ کہود۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ علوم ادبیہ میں مفتی صاحب کو دینی شرف  
 حاصل ہے جو اور علوم میں غفراں کتب مولانا سید دہلوی صاحب کو حاصل تھا۔ وہ  
 اپنے مہد میں اس کے مجدد تھے۔ قریب قریب اس فن کے جس قدر کامل ہندوستان میں  
 نظر آئیں گے ان سب کا سلسلہ کلمہ آخر میں مفتی صاحب تک جتنی طے گا۔ علوم ادبیہ  
 ان کے دینی اور دہانی فن تھے۔ انہوں نے کسی سے ان کو حاصل نہیں کیا اور نہ شعر

پر کبھی کسی سے اصلاح لی۔ خود فرماتے ہیں:

یہ ذوقِ خدادادِ ہاں فن نہ شاگرد نہ استاد دریں فن  
مفتی صاحب نے عربی، فارسی، اردو نثر و نظم، تفسیر، فقہ، حدیث، رجال،  
لسان، وکیت فرض ہے شمار علوم و فنون پر سیکڑوں کتابیں لکھیں جن میں سے سو کے قریب  
شائع ہو چکی ہیں۔ جناب مرتضیٰ حسین فاضل نے ۱۹۴۷ء میں مفتی صاحب کے مؤلفات  
کی تین الماریاں دیکھی تھیں جن میں ان کے قلمی تصانیف دوی کی طرح بھرے ہوئے  
تھے۔ کچھ مؤلفات راجا صاحب محمود آباد کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ عزیز لکھنؤ  
نے مفتی صاحب کی تصانیف کی تعداد ۱۶۴ لکھی ہے۔ ان میں ذیل کی مشنیاں بھی ہیں:

(۱) من و سلویٰ (۲) گوہر شاہوار (۳) آبِ ذلال (۴) جوہر

معلوم (۵) بیت المزن (۶) سخنِ جان (۷) نظم السروض (۸)

خطابِ فاضل (۹) مشکینِ مسکین (۱۰) شمع الجہانس (۱۱) مرصع

(۱۲) مولیٰ المظاہر (۱۳) موجزۃ راہدہ فی المجرۃ الشائیہ (۱۴) نور

(۱۵) ربّ دہلوی (۱۶) حلقہ حیدری (۱۷) بنیاد اعتقاد (اردو)

## مفتی صاحب کی اردو نثر و نظم:

بلوچستان میں باہموم عربیت اس قدر غالب ہوتی ہے کہ فارسی یا اردو کا خاص  
لفظ ان کی زبان میں نہیں ملتا۔ مگر یہ شرف بھی مفتی صاحب کے واسطے ہندوستان میں  
مخصوص تھا کہ عربی زبان کی نوا سنہیوں میں وہ رشکِ حسّان و آہنگی تھے۔ مفتی صاحب  
ہیشہ اردو زبان سے اپنی اجنبیت ظاہر کرتے تھے۔ چنانچہ مشنوی ”بنیاد اعتقاد“ میں  
فرماتے ہیں:

ماہر زبان ہند سے دہلے میں نہیں ہندی کے روزمرہ سے آگاہ میں نہیں  
جازی و فارسی کی تو کچھ مفتی بھی ہوتی ہندی کی مجھ کو فکر نہ اب تک کبھی ہوئی  
مفتی صاحب کی نثر کے نمونے نایاب ہیں۔ مشکل سے ایک دفعہ ملا۔ ترجمہ

ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

مہدی بیگم صاحبہ میں خود قرض وار ہوں اور زیر بار ہوں اور  
توثیق میں گرفتار ہوں۔ چاہا تھا کہ میر باقر سوداگر سے قرض  
لے کے اپنے خرچ میں لاؤں۔ تم کو دس روپے دلوادوں۔ ادھر  
میں نے یہ خیال کیا، ادھر انہوں نے انتقال کیا۔ میری کیا تقصیر  
ہے، تمہاری تقدیر ہے۔ مگر تم نے پھر خط بھیجا ہے اور میرے پاس  
ایک روپیہ نہیں۔ لیکن ایک شخص کی امانت رکھی تھی۔ اس میں سے  
دس روپے کی ہٹدہی کی۔ پیسے بھی اسی میں سے لیے اور بابت  
رجسٹری خط کے دیے۔ تم اس کو خرچ کرو اور حکم خدا کرو اور  
میرے حق میں دعا کرو کہ قرض میرا بھی ادا ہو اور آخرت کا بھلا  
ہو۔ یہ اتماس میری قبول کرو۔ چار آنے کم دس روپے وصول کرو  
اور توپ کرو، خدا سے ڈرو، تم نے یہ کھسا کہ والد ہیں تو آپ ہیں،  
خدا ہیں تو آپ ہیں۔ معاذ اللہ! میں بندۂ ناچیز گنہگار کہاں، میں  
کہاں، پردہ نگار کہاں!

نیم دس جوالا تاجہ کی دکان چوک میں سنی ہے اور ہٹدہی درشتی ہے۔  
مفتی صاحب غزلیں بھی خوب کہتے تھے۔ ذیل میں چند غزلیں درج کی جاتی  
ہیں، زبان کی فصاحت اور سادگی کا اظہار ملحوظ ہے:

شام سے صبح ہوئی، مرگ کا سلاں نہ ہوا  
لعلک حسرت سے بھی آلودہ یہ داناں نہ ہوا  
سن بیڑا، زور گشت، جہل کیا، علم آیا  
تو مگر اپنے گناہوں سے چھیاں نہ ہوا  
واعظ و شاعر و حکام، طیب و زاپ  
سب میں مشہور ہوا، حیف ہے انساں نہ ہوا



دل و تعویذ و دعا، نسیم کانونی شفا  
سب ہوا پر دل پرورد کا دریاں نہ ہوا  
صبح ہے فصل بہاری کی مگر دل بے نور  
شیخ کا گل ہے کہ اس فصل میں شہاں نہ ہوا

روئے محبوب کی کچھ یاد نہ کی سید نے  
صاحب علم ہوا، حافظ قرآن نہ ہوا

کیا ہو گئے وہ دن کہ غرور شباب تھا  
کیسا سرور اور نقش بے شراب تھا  
کچھ غم نہ مرگ کا نہ معیشت کی فکر تھی  
نے کچھ خیال حشر نہ خوف عقاب تھا  
غفلت میں کس حڑے سے گزرتی تھی زندگی  
جو لطف کم سنی میں اٹھایا، وہ خواب تھا  
لفکوں کی بھری نہیں کرتے ہیں عقلمند  
جو غور سے حیات کو دیکھا، شباب تھا  
دامادگان راہ کا کیا پوچھتے ہو حال  
کوئی سوار تھا کوئی پاؤں در رکاب تھا

وصلت کی شب کو کچھ نہ ہوئی مٹنگو بہم  
ان کو غرور حسن تھا، ہم کو شباب تھا

زینت نہیں ہے، رنگ نہ پوچھو خطاب کا  
یہ ماتی لباس ہے فوسٹ شباب کا  
ملتی ہے اک ہنس میں یہاں صورت حیات  
دیکھا ہے جیسے آب پہ نقش شباب کا

کیا بیش تجھ کو ملتا ہے دور شراب میں  
 مت کر خیال عشرت پا در رکاب کا  
 ابرو ہے بھیج شعر تو وہ خال مٹکیو  
 نقطہ کنارہ صلی پہ ہے انتخاب کا  
 ہم کو حصارے لطف کی امید کچھ نہیں  
 پر خط کھو اگرچہ ہو مضمون عتاب کا  
 دل گرچہ ہے پرشت سلامت سخن میں ہے  
 جب تک نہ ہو شک تو مزہ کیا کباب کا  
 خافل کو ہوش آتا ہے میرے کلام سے  
 چکا ہے جو قلم سے عرق ہے نگاہ کا  
 ہے اس قدر زکات سے نفرت کہ طفل و بزر  
 کتب میں نام بھی نہیں لینے نصاب کا  
 کھاتے ہیں سود روز و شب اس کا حساب ہے  
 آتا نہیں خیال بھی روزِ حساب کا  
 آنکھوں کا نور عالم بھری نے کھو دیا  
 گل کر دیے چراغ کہ ہے وقت خواب کا

ستارے خاک میری نظر میں سرے و تاج  
 ہے خلق آب و گل میں مرے پرتاب کا

اپنے ہر سے اہل ہر بہرہ در نہیں  
 کمال کو کچھ کمال پہ اپنے نظر نہیں  
 اہل نظر کو لطف جو ملتا ہے غمن کا  
 خود صاحب جمال کو اس کی خبر نہیں

لڑیاں ہیں موتیوں کی اسے نظم کیا کہیں  
ہم سگ ان کا درج میں کوئی کمر نہیں  
یہ ہیں جواہر ان کا طلبکار ہے فقیر  
تم ہو غنی جو قدر تحسین اس قدر نہیں  
شیریں سخن کو اپنے سخن میں مزہ کہاں  
جی بھر گیا ہے رعبہ قد و شکر نہیں

کیا جانے اپنا حال کہ کتنا بلند ہے  
جب تک نگاہ عرش بریں فرش پر نہیں

ہمدِ عشق ہوا میں، تو کیا تعجب ہے  
ترا حرار پر آنا بسا تعجب ہے  
پیش ہے قلب میں اور آو مرد ہے لب پر  
یہ گری اور یہ غلطی ہوا، تعجب ہے  
گزر ہوا کا بھی ہرگز نہیں ہے اس گل تک  
پیامِ دہل کا کس نے دیا، تعجب ہے

طلب وہ کرتے ہیں جاتے نہیں ہو تم سید  
عجب ہے آپ سے، اُن سے جدا تعجب ہے

ملتی صاحب ایک مرتبہ کان پور میں قیام پذیر تھے۔ مکان میں آگ لگی تو  
ذیل کا قطعہ نظم فرمایا:

حالت تھی کل ہماری جب بچہ و تاب کی  
دل جل رہے تھے دھم تھی بس آپ و تاب کی  
سویا تھا میں کہ آگ کا اک ہار غل ہوا  
الھا تو کچھ خبر نہ رہی فزں غلاب کی

دیکھی ٹپک تو دل نے کہا بھر کے آؤ سرو  
دورخ کی آجج ہوئے گی کس انہاب کی  
مطبخ میں جب کہ آگ لگی بارخ کے قریب  
پھولوں کی شاخیں بن گئیں سیخیں کتاب کی  
اترا نہ تھا ہنوز گل سرخ شاخ سے  
ہوئیں ٹپک رہی تھیں زمیں پر گلاب کی  
اس گل سے کوئی پوچھے کہ بلبل کا کیا گناہ  
کیوں بارخ میں دکتی تھی آتش عذاب کی  
جب تک کہ پینے پانی وہ برداو ہو گیا  
اس آگ نے چمن کی بھی مٹی غراب کی

ستید یہ کس کے عشق کا جوش و غروش تھا  
ہے یہ غزل تھمادی عجب آب و تاب کی  
مولوی میر محمد جعفر صاحب مرحوم مجلس امید جو خاندان اجتہاد کے ایک رکن  
تھے اور مفتی صاحب کی خدمت میں بہت حاضر و حاض تھے، ایک روز آئے اور کہا کہ  
جناب، آج میرے یہاں مشاعرہ ہے۔ آپ کو بھی زحمت دوں گا۔ مفتی صاحب نے  
خس کر فرمایا کہ مشاعرے میں میرا کیا کام ہے۔ انھوں نے بے حد اصرار کیا۔ راضی  
ہو گئے تو تشریف لے گئے۔ شیخ ناسخ کی مشہور نزل کی طرح تھی:

مرا سید ہے مشرق آفتاب داغ بھراں کا

کنول گردش کرتا ہوا مفتی صاحب کے سامنے آیا۔ لوگوں نے اصرار کیا کہ  
حضور بھی کچھ پڑھیں۔ چند شعر جو وہیں نظم کر لیے تھے، پڑھ دیے۔ تمام مشاعرہ اٹ  
گیا۔ ایک شعر اب تک لوگوں کو یاد ہے:

مری کے صبح تک امیدوار و مل اے گردوں  
ابھی سے ماتی کیوں بڑھن ہے شام بھراں کا

سلطان عالم و امجد علی شاہ کا یہ شعر کسی نے سنایا:  
شانہ کر کے بال رخساروں پہ کیوں نکھرا دیے  
آنکھوں میں بال ڈالے، اس سے کیا حاصل ہوا  
آپ نے فوزا بے ساختہ یہ شعر نظم کیا:

حسن ابد سے جب نصرت ہوئی رخسار کی  
یہ ہلال ایسا ہے جس سے ماہ بھی کامل ہوا  
کسی نے غولہ حیدر علی آتش کے یہ دو شعر سنائے:

دل لگی اپنی ترے ذکر سے کس رات نہ تھی  
صبح تک شام سے یا نو کے سوا بات نہ تھی  
اتھا تھم سے کب اے قبلہ حاجات نہ تھی  
تری درگاہ میں کس روز مٹا جات نہ تھی

مفتی صاحب نے فی البدیہہ یہ شعر کہے:

نہ ہوئی رات کو توفیق نماز شب کی  
ذکر معبود کیا کرتے تو کچھ بات نہ تھی  
ہوش آیا جو جوانی میں تو بھری آئی  
شب کو اس وقت کھلی آنکھ کہ کچھ رات نہ تھی  
ذیل کے شعر بھی مفتی صاحب سے یادگار ہیں:

عباس روز حشر پکارے گا برلا  
لونا مجھے بتوں نے، وہائی خدا کی ہے

مفتی صاحب کو فوجِ ربانی میں بھی مہارت حاصل تھی۔ ذیل کی رباعیاں  
مسمونے کے طور پر درج کی جاتی ہیں:

(۱) بھری بھی جب ظم کا افسانہ ہے  
اس صبح کو خواب، مرگ کا آنا ہے

- حالات کا ہے یہ حال کہ جنش ہے حال  
اس ضعف پہ دیکھو کہ کہاں جاتا ہے  
(۲) بے چلی دل نے شب کو سونے نہ دیا  
پاس اوب عشق نے رونے نہ دیا  
نہ ذمہ کی وصل نہ مرگ فرقت  
تکدیر نے کوئی کام ہونے نہ دیا  
(۳) برسوں ہے خیال ہذر خواہی دل میں  
ہرگز نہیں کچھ خوف الہی دل میں  
تاتے کی طرح خطا میں کی عمر بسر  
بالوں میں سفیدی ہے، سیاہی دل میں  
(۴) حاقل نے کبھی نہ دل کسی کا توڑا  
ہاں تو سن ہنس کو لگایا کوڑا  
جو امر کہ دلی کا ہے اسے آپ کیا  
دنیا کے امور کو خدا پہ چھوڑا  
(۵) جب معرکہ حشر میں جانا ہو گا  
جز آل نبی نہیں ٹھکانا ہو گا  
رویا طمع شاہ میں، بخشش لے لی  
آلہو کا بہانہ ہی بہانا ہو گا  
(۶) اک دن سفر اس جہاں سے کرنا ہو گا  
مگر لاکھ برس جیسے تو مرنے ہو گا  
تابت نہ رہے وہ شریعت پہ قدم  
کس طرح صراط سے گزرتا ہو گا

(۷) کیا نعل ہے خیال طوق سجاد نہیں  
فریاد کے موج پہ یہ فریاد نہیں  
مجلس میں طلب ہے دمدم پانی کی  
کیا کھٹکی حسین یکم یاد نہیں

مفتی صاحب مشہور مرثیہ گو مرزا دیر اور میر انیس کے نہایت قدردان تھے۔ دونوں کے کلام کو پسند کرتے اور اسے بلند پایہ قرار دیتے تھے۔ دونوں بزرگوں سے مراسلت بھی تھی۔ دیر کو ایک جامع الکالمات مجتہد سمجھتے تھے اور ان کے کلام سے محفوظ ہوتے تھے۔ مفتی صاحب نے مثنوی ”من و سلویٰ“ لکھی۔ اس کی تاریخ طبع میں مرزا صاحب لکھتے ہیں:

بیت او بیت الحرم را در نظر چوں بحال یوسف و چشم پدر  
مصرعش طوبائے فردوسی بریں منکب ابرو بر سر بالائیں  
مطلع روشن مثال نخل طود ی کند چشم از فروزش کب نور  
آرے آرے نیست جائے گفتگو نثر جاری از شاخ علم او  
تلمع علماء عالی جناب سینو القدس بناو شیخ و شاب  
قبلہ اہل یقین لاریب فیہ واسطہ و مفتی و محتاط و فقیہ  
صدر پائش صدر الہام غیب روز و شب گوش و دل پیغام غیب

مصرعے گفتے پہ تاریخ آں  
کچھ نقد معنی و علم رواں

پچھلے کی ایک مجلس میں مرزا دیر نے گھوڑے کی تعریف میں یہ مصرع کہا تھا:  
اس رخس کے منہ پر کوئی دن چڑھ نہیں سکتا

اس پر سر شبہ ۲۰ ربیع الاول ۱۲۷۶ھ (اکتوبر ۱۸۵۹ء) کو کسی نے اعتراض کیا۔ مفتی صاحب نے اس اعتراض کے جواب میں دماغ حکم جواب دیا تھا اور دلیل میں لکھائی، مرقی، ناصر علی سرہندی اور تاج کی مثالیں پیش کی تھیں۔ مرزا صاحب نے

مرزا غالب اور مفتی میر محمد ماس

مفتی صاحب کے دعائیں شکن جواب پر شکر ہے کا خط لکھا تھا۔ تفصیلات ”تجلیات“ میں  
دیکھے جاسکتے ہیں۔ شعر یہ ہیں:

مرثی:

اں سبک سیر کہ چوں گرم حنائی ساری  
از ازل سوے ابد وز ابد آید بہ ازل  
فلہا سس دم رفتن چکد از پیچانی  
ہبم آساش نصید کہو رجعت بہ کفل  
گر بخورشید دہد سرعت او در یکدم  
آید از طود ہر صیپ منازل محفل

تلی:

در ملک فنا ہم غنودیم اکامت  
از بسکہ علی حیز جہانم فرس را

ناتج:

ہے یہ اپنے ضعف کا روز جدائی میں اثر  
شام ہے اور دھوپ چڑھ سکتی نہیں دیوار پر

مفتی صاحب میر انیس کے مذاہن میں تھے۔ ان کے غلطو کا ایک قلمی  
مجموعہ ”ظن ممدوح“ کے نام سے راجا صاحب محمود آباد کے کتب خانے میں موجود ہے۔  
اس میں انیس کے نام حصہ و غلطو ہیں۔ مشہور ہے کہ انیس نے مفتی صاحب کو ایک  
مرثیہ لکھا۔ اس میں یہ مصرع تھا:

جب حملہ در امام کریم اٹھس ہوئے

مفتی صاحب نے فرمایا، ”کریم اٹھس“ نہیں ”سج اٹھس“ فرمائیے۔ میر  
انیس نے مفتی صاحب کی شہری ”من و سلوئی“ کی تاریخ طاعت میں یہی تھی:  
طبع شد ایں نظم از فضل الہ در جلوس صیبت مانوس ثناء



مرزا غالب اور مفتی میر تقی میر

خاصہ درگاہ رب ذوالمنن عین حق واحد علی شاہ دین  
 صہ حکم سید مجاز عیاں قید کونین استاد دین  
 قاضی باذل فقیر بالقیس آفتاب آسمان علم و دین  
 چوں نائل کرد با فکر سلیم از چہ تاریخ آں طبع انیس

داد ہاتھ ایں صدائے دلپذیر

ہست تاریخش ”کلام ہے نظم“  
 ۳ ۲ ۱ (۱۸۳۷ء)

میر انیس نے مفتی من و سلوی کی جو تاریخ نظم کی تھی اس کا ذکر مفتی صاحب نے ایک نظم میں یوں فرمایا:

بچیاں کز فیض سلطان ایں کلام یافت در آئینہ طبع ارتسام  
 شب کہ بوم در خیال سال طبع ایں نوید آمد باستقبال طبع  
 کاغذ آغاز جلوں خسروی یافت سر انجام طبع شغوی  
 دل چہ از روئے جلوں آگاہ گشت گفت مطبوع از جلوں شاہ گشت  
 مصرعے کامل ہم آمد در نگہ گشت مطبوع جلوں بادش  
 باز تاریخ دگر کردم طلب از جناب سید والا لب  
 نور چشم مجلس صدق و صفا ذاکر مقبول سید مصطفی  
 بلبل دستان زن بستان ہند مارچ میر عرب سبحان ہند  
 شام یکا ریختی ذاکریں تارک دنیا انیس اہل دین  
 ارتقا آں دھند روزگار

دو رقم ایں چند صچ آبادار

متذکرۃ بالا اشعار کے جواب میں میر انیس نے مفتی صاحب کو ذیل کا خط

لکھا تھا:

قلہ و کعب علوم کیساں دام شکلم العالی۔ زبان ایں کج بج عیاں

را چہ یارا کہ بدح ایں اشعار آبدار نہاید۔ الحق کہ دریں جزو زبان  
 طرز انجاز طرازی و سحر پر دانی بر ذات فیض آیات ختم گردید۔  
 موقلم بودہ است کوئے کلکب مجز سلب تو  
 صفحہ قرطاس را کردی نگارستانا بخش  
 از زمین الکمال نگاہ داشتہ سایہ تا پایہ را بر مفارق خادمان خاص  
 مبسوط دار۔۔

میر انیس نے ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۳-۵۵ء) میں امام باڑا تعمیر کیا تھا۔ مفتی صاحب  
 نے ۱۵ اشعار کا قطعہ تاریخ کہا جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

”تاریخ بتائے مزاخات میر میر علی انیس ساختہ بود“

یکتاے عصر میر علی آں کہ مثل او  
 نے چشم چرخ دید نہ کوئی جہاں شنید  
 آں سچو انیس لقب عذیب بند  
 کاوصالب او تو اس ز زمین و زباں شنید  
 آں ذاکرے کہ گفت سر حبر آفتاب  
 رازے کہ جبرئیل نگردوں نہاں شنید  
 آں نغز کہ سر نہ زد از طائرانی قدس  
 وہ حیرت کہ بلبل کلکش چساں شنید  
 غیر از زبانی دل مواء ثنا کند  
 آنکس کہ قلم پاک وے از کوئی جاں شنید  
 نازک دے کہ ہر چہ بکھنہ کوئی کرد  
 لا نہ حال زار من تا توں شنید  
 تعذیب نیم حرف ہم از سرگذشت من  
 از دیگران اگرچہ دو صد داستان شنید

آواز ہائے عزا خانہ کہ ساخت  
دشمن بہت فائدہ دہنت آسماں شنید  
معاد وقت صبحِ امیں خانہ عزا  
شاید کہ جیتے از لب آں نکتہ ہاں شنید  
ہر کسی سر نیاز بر امیں آستان گزاشت  
آوازِ خیر مقدم گز و ہاں شنید  
ہر ذرہ کہ بارِ دریں بارگاہ یافت  
آیاتِ نور خود ز ہر خادماں شنید  
چو بر خراجِ پاک نگاہ من اوقات  
آپے ز دم کہ گوئی کہ آسماں رسید

سالِ بناش گفت رقم از سر الم

امیں جا عام تالہ زہرا تو اس شنید  
۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶ ۷ ۸ ۹ ۱۰ ۱۱ ۱۲ ۱۳ ۱۴ ۱۵ ۱۶ ۱۷ ۱۸ ۱۹ ۲۰ ۲۱ ۲۲ ۲۳ ۲۴ ۲۵ ۲۶ ۲۷ ۲۸ ۲۹ ۳۰ ۳۱ ۳۲ ۳۳ ۳۴ ۳۵ ۳۶ ۳۷ ۳۸ ۳۹ ۴۰ ۴۱ ۴۲ ۴۳ ۴۴ ۴۵ ۴۶ ۴۷ ۴۸ ۴۹ ۵۰ ۵۱ ۵۲ ۵۳ ۵۴ ۵۵ ۵۶ ۵۷ ۵۸ ۵۹ ۶۰ ۶۱ ۶۲ ۶۳ ۶۴ ۶۵ ۶۶ ۶۷ ۶۸ ۶۹ ۷۰ ۷۱ ۷۲ ۷۳ ۷۴ ۷۵ ۷۶ ۷۷ ۷۸ ۷۹ ۸۰ ۸۱ ۸۲ ۸۳ ۸۴ ۸۵ ۸۶ ۸۷ ۸۸ ۸۹ ۹۰ ۹۱ ۹۲ ۹۳ ۹۴ ۹۵ ۹۶ ۹۷ ۹۸ ۹۹ ۱۰۰

میر انیس کے انتقال پر مفتی صاحب نے کئی تاریخیں لکھیں۔ انیس کی مشہور  
رہائی کا دوسرا مصرع ہے: ”جز خاک نہ نکلے نہ بچھوٹا ہوگا۔“ مفتی صاحب نے ایک لفظ  
بڑھا کر یہاں تاریخ لکھا:

تھے انیس الفریا واکر و عراج امام  
ہے یقین، غرضِ خدا صبیح اعلیٰ ہوگا  
اشھ کیا وارِ فنا سے وہ مہ برج کمال  
کوئی دنیا میں نہ اس وضع کا پیدا ہوگا  
موت کی یاد ہمیشہ قہی دلِ اقدس میں  
جو کہا شعر وہ الہی غم افزا ہوگا

دع میں ان کی کسے طاعت گویائی ہے  
کون ایسا ہے جو اس طرح کا گویا ہوگا  
سال تاریخ بھی گویا کہ کلام ان کا ہے  
”ہائے، ہر خاک نہ نگیں نہ پھوٹا ہوگا“  
۱ ۲ ۱ ۱

میر تقی میر کے ایک مشہور سلام کا مطلع یہ ہے:  
علم شہ کا کر داغ دل پر رہے  
سلائی لہ بھی مژدہ رہے  
مفتی صاحب نے اسی انداز پر چند شعر نظم کیے:  
یہ تھی آرزو قتلِ شیر کی کہ روئے سے اس دن ملکر رہے  
ہوا عصر تک صاف زہرا کا کمر نہ اکبر رہا اور نہ امیر رہے  
اسی وقت ادھر سب کے روئے کئے ادھر بھوکے آلِ ویر رہے  
پریشان، سراسیمہ، بے سرپرست  
نہ بھائی، نہ بیٹے، نہ شوہر رہے  
تقی میر نے مفتی صاحب کی خدمت میں ایک مجلس چلے  
جہلم میں پڑھنے کے لیے برائے اصلاحِ فطرت کی۔ مجلس کا مطلع یہ ہے:  
”از بارخ جہاں بلبل بیتابِ سخن رفت“  
مفتی صاحب نے اصلاح دیتے وقت فی البدیہہ ایک مجلس کہا، جس میں  
تقی میر کی عظمت اور ان کی محبت ظاہر ہوتی ہے۔ چند بند یہ ہیں:  
یارب کہ جدا شد کہ جنیں ہوش رہا نیست مفہوم و حزمیں خود سخن از دردِ جدائی ست  
افسردہ و ہجرش یمنِ مدحِ سرزائی ست از دستِ فطشِ صفو قرطاسِ جتائی ست  
خونِ جگر سے ہلکے و حوکانِ سخن رفت  
از حمامِ اور دلمچ سلطانِ سخن بود در اجلاسِ لو صادمِ بزائِ سخن بود

مرزا غالب اور مفتی میر محمد ہاں

در مجلس او لعلِ ایوانِ سخن بود از صحبت او بندش ارکانِ سخن بود  
 از دلچسپی او قدرت و امکانِ سخن رفت  
 بود از نقشِ مایہِ ذکاوتِ حلاوت می زد نقشِ موجِ پدِ پایے سلامت  
 می ریخت ز کفکشِ شکر و شیر فصاحت بر ثوانِ سخن بود ازو شورِ طاقت  
 تا رفت ہمہ نصیبِ ایوانِ سخن رفت  
 در بزمِ عزا آئینہ دار شہدا بود تصویرِ کیشِ معرکہ کرب و بلا بود  
 باطنِ حسن بود انیسِ الغریبا بود در مرشدِ گوئیِ خضرِ راہنما بود  
 او رفت کہ سرچشمہٗ حیوانِ سخن رفت  
 تا رفت بہ منبرِ پیشِ افتاد بہرِ دل از سیلابِ زہانش ہمہ محفلِ شدہ بزل  
 در بندِ چہ حسان و حسن بود چہ مقلیل ناگاہ سوسے روضہٗ رضواں شدہ مائل  
 چوں غنچہٗ غموشید و ز بستانِ سخن رفت

## مفتی صاحب اور مرزا غالب

جیسا کہ ابتدا میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ مفتی صاحب اور مرزا غالب کے درمیان محکم روابط قائم تھے۔ یوں تو مرزا صاحب آزاد خیال کے تھے لیکن مفتی صاحب سے محبت و عقیدت کا جذبہ کارفرما تھا۔ دونوں کے درمیان ۱۲۷۹ھ (۱۸۶۲ء) میں مکاتبت کا آغاز ہوا۔ مفتی صاحب کے کتب خانے میں مرزا غالب کے ہاتھ کے کلمے ہوئے کچھ خطوط ایک شکل میں موجود تھے۔ خط و کتابت کی ابتدا یوں ہوئی کہ غالب نے ”فاطمہ بے بان“ کا ایک نسخہ مفتی صاحب کی خدمت میں بھیجا۔ اس کے لفافے پر عبارت ذیل درج تھی:

در کان چوں ہرکانِ نواب باقر علی خاں صاحب موصول و بتقدیم

مخدومی جناب مفتی میر عباس صاحب زاو مجدد مقبول و دربارہ  
تکدین اطلاع رسیدن ارمغان عنایت مبدول باد۔

مرسلہ چہارم اگست ۱۸۶۲ء۔ اسٹامپ پیڑ۔

جب ”کالمج نہ بان“ کا نسخہ جناب مفتی صاحب قبلہ کو موصول ہوا تو نواب

نور الدولہ لیٹ الملک محمد احسن خان بہادر محکم جنگ، معروف بہ نواب ثناء مرزا صاحب  
نے اس کی وصول یابی کی رسید کی تاریخ نظم میں یوں لکھی تھی:

چوں غالب شاعر مکرم	استاد سخنوران عالم
آں غیرت صاحب و نظیری	وہاں رکب عرقی و عہدہ
تہان زبان و فصاحت	حتان عصر و بلاغت
و حضرت عالم محقق	آں فاضل کامل مدق
کز جملہ بہم پیش باشد	علامہ عصر خویش باشد
ستہ عباس ام پائل	و ز نور سرشت جسم پائل
صدیق لطیف ارمغان کرد	تحقیق خودش و دو عیاں کرد
آمد بیاں چو ذکر تاریخ	رقیم صفا بکھر تاریخ

از لہجہ فکر گوید ناب

شد تحریر ارمغان ثانیہ

کتاب ملاحظہ فرمانے کے بعد مفتی صاحب نے ذیل کا خط مرزا غالب کو لکھا:

”یا سدا قلہ الغاب و منکر الجباب

ہیں از اقدام ہمارے احناف تحفہ سلام کہ ثناء اقدام خدام تو اہم

چہ سلامیکہ چوں ذر نجف در صدف شرف پروردہ و در طایف انوار از

نکدہ زر تار آفتاب نصف انہار کوے سبقت بردہ۔ ملتس آنکہ

تقریر شکر ہے یہی مثل مدح و ثناءے آں علیہ از حیر بیان و

ہاتھ ایں منچداں ہر دست۔ سبحان اللہ کریم کر استایم و کی  
کرایم، بیکس "قاصد زبان" کہ در انقلاب زبان نام و نشان  
برہان قاصد را برہم زود و زیر و زبر کرد۔ یا پے پاس گزائی آں  
خسرو خاوند شیریں بیانی و ناظم قلم و سخاوتی کہ امروز در شعر و  
شاعری نظیری ندارد۔ کسے در برابرش عہدہ نبیاد۔ ہر گاہ در انجمن  
اہل سخن و کوش بر آید فروغی فراموش است و اگر در شہرستان قلم و  
نثر کوں "لمن الملک" زند، زمانہ سراپا کوش:

در قریح معانی پے پیشا دارد در سحر بیانی لب چینی دارد  
گر شیخہ خشیان دیگر جادوست آواز قلقلش عصاے موسیٰ دارد  
نواب مستغاب محسن الدولہ انتظام الملک سید باقر علی خان بہادر  
ہجک کہ کتو رے است یکتا و سجا نغسے است بے ہمتا۔ بریں  
شعر:

از من بمن سلام و ہم از من بمن پیام  
دینج ولی مہاو پیام و سلام ما  
وجد کردہ و کرد خواندہ و فقیر از چارچاق غم کہ میر غالب باشد مح  
خدم کہ چہ قدر بے تکلف و پر تکلف است و چارچاق وصول ایں  
بدیہ از ہمیں بازہ ہایی صورت بر آوردم:

غالب آں میر سید قلم و نثر مصفیہ ساجا و طالب  
خلف ہامہ از ہر ش رسید شد رقم تاریخ "میر غالب"  
۱۲۸۶ھ

حرمہ الضعف الناس سید محمد عباس فی کتو الاشغال و توزع الہل  
علی سبیل اللہ الاستعمال والحمد للہ سبحان واصلاۃ علی محمد وآلہ  
خیر آل:

اس خط کے جواب اور شکریے میں مرزا غالب نے ۱۹ صفر ۱۲۷۹ھ (جولائی ۱۸۶۲ء) کو ذیل کا خط لکھا تھا:

قبلہ حضرت کا نوازش نامہ آیا۔ میں نے اس کو حرص باز دہنایا۔  
 آپ کی تحسین میرے واسطے سرمایہٴ عز و افتخار ہے۔ لیکن فقیر  
 امیدوار ہے کہ یہ دفتر بے معنی نہ سراسری بلکہ سراسر دیکھتا چاہیے۔  
 پیش نظر دہرا رہے۔ وقت فرصت اکثر دیکھا جائے۔ میں نے جو  
 یہ نسخہ وہاں بھجوایا ہے گویا کسوٹی پر سونا چڑھایا ہے۔ نہ ہٹ دھرم  
 ہوں نہ مجھے اپنی بات کی شک ہے۔ دیاچہ و خاتمہ متن میں جا بجا  
 جو کچھ لکھ آیا ہوں سب سچ ہے۔ حقیقت کی داد جدا چاہتا ہوں۔  
 طرز عبارت کی داد جدا چاہتا ہوں۔ نگارش لطافت سے خالی نہ  
 ہوگی۔ گزارش غرافت سے خالی نہ ہوگی۔ علم و ہنر سے عاری  
 ہوں، لیکن کچھ برس سے جو سخن گزاری ہوں۔ مدد فیض کا مجھ  
 پہ احسان عظیم ہے۔ ماخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے۔ فارسی  
 کے ساتھ ایک مناسبہ ازلی و سرمدی لایا ہوں۔ مطابق اہل  
 پارس کے منطق کے بھی قرۃ ایزدی لایا ہوں۔ مناسبہٴ خدا داد  
 ترجمہ استاد حسن و قبح ترکیب بچکانے لگا۔ فارسی کے خواص  
 جاننے لگا۔ بعد اپنی تکمیل کے علاوہ کی تہذیب کا خیال آیا۔  
 ”قاطع نہان“ کا لکھنا کیا ہے۔ گویا ہاں کرمی میں لہلہ آیا۔  
 لکھنا کیا تھا کہ سهام طاعت کا ہدف ہوا۔ ہے ہے یہ نیک مایہ  
 معارض اکابر سلف ہوا۔ ایک صاحب فرماتے ہیں کہ ”قاطع  
 نہان“ کی ترکیب لفظ ہے۔ عرض کرتا ہوں کہ حضرت برہان  
 قاطع اور ”قاطع نہان“ کی ایک نسل ہے۔ برہان قاطع نے کیا  
 لکھا خیر نہیں کہ قاطع کیا جو آپ نے اس کو قاطع لقب دیا۔ برہان



جب تک غیر کے برہان کو قلعہ نہ کرے گا کیونکہ برہان قاطع نام ہوگا۔ برہان قاطع کی صحت میں جس قدر تقریر کیجئے گا وہ "قاطع برہان" کی صحت کے ثبوت میں کام آئے گی۔

قلعہ تاریخ کا کیا کہنا ہے۔ گویا کتاب معشوق اور یہ قلعہ اس کا گہنا ہے۔ جناب نواب صاحب کا نیازمند اور قرباں بردار ہوں۔ بعد عرض سلام کے پسند آنے کا شکر گزار ہوں۔ آپ کے علم و فہم اور اداک کی جو تعریف کی جائے وہ حق ہے۔ لیکن میرے شعر کی سائنس صرف خریداری دکانا بے روفی ہے، انصاف کا طالب غالب۔ (میر)

مرزا غالب کے خط کا جواب ملتی صاحب نے یہ دیا:  
جناب دلا سطر اللہ تعالیٰ۔ مکتوب مرغوب کو دیکھ کر مسرور ہوا۔ حلق خاطر دور ہوا۔ لیکن کان پور میں بسپ ترادات سفر جناب کی نوبت نہ آئی اور لکھنؤ میں ملاقات احباب سے فرصت نہ پائی۔ کیا عرض کروں، میں بہت ناتواں ہوں۔ مشیہ استخوان ہوں۔ رنجوں میں گرفتار ہوں۔ وجہ الہی کا امیدوار ہوں۔ اگر کچھ بھی دل و دماغ میں قوت پاتا اور فی الجملہ درس و تدریس اور تجربہ جواب مسائل سے فرصت پاتا، اس رسالے کو از ازل تا آخر دیکھ کر خود ذہن ناقص میں گزرتا، مفصل عرض کرتا۔

امشاء اللہ آپ کی نظم و نثر سے دل مزے اٹھاتا ہے۔ جو صاحب ذوق ہے لذت پاتا ہے۔ اس نگارش نے کتاب دینی کو نظر سے گرا دیا۔ حسن خط سبزاں دکن بھلا دیا۔ اللہ ری شوقی کلام کہ چشم غزالان سخن کو حیرت ہے اور نہ لطافت و ظرافت کہ اداسے بتاتا طراز کو کیا لہجہ ہے۔

سہام حلام کا جو آپ نے شکوہ فرمایا ہے، حال اس کا یہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے، حضرت موسیٰ نے درگاہ الہی میں عرض کیا کہ خدایا تیرا دم بھرتا ہوں، دو دعائیں کرتا ہوں، جنت مجھ کو عطا کر اور خلق کی زبان سے رہا کر۔ ارشاد ہوا۔ دعاے اول قبول ہے، ثو جلتی ہے، رسول ہے، لیکن دوسرا جو سوال ہے اس کا یہ حال ہے کہ ہم نے اپنے واسطے بھی نہیں کیا۔ غرض خلق کا خلق بند نہیں۔ وہ لوگ کم ہیں جو مردہ پسند نہیں۔

”قاطع برہان“ خوب نام ہے۔ اس میں کیا جاے کلام ہے۔ معنی صاف ہیں۔ معترض ناانصاف ہیں۔ لطف یہ ہے کہ خود نام سے پیدا ہے کہ اس نے برہان قاطع کو الٹا ہے۔ مگر ان دونوں باتوں کا ایک خط پر ہونا جاے قاطع غور ہے۔ ظاہر اس کا مطلب اور ہے اور آپ کا مقصد اور ہے۔ قطع کے معنی کاٹنے کے اور یقین کے بھی آئے ہیں۔ اس نے غالب معنی جانی مراد لیے ہیں اور آپ معنی اول استعمال میں لائے ہیں۔ بہر صورت برہان کی طرف ظاہر قاطع کی اضافت ہے اور اس تقریب میں سراسر لطافت ہے۔ اس میں شک و شبہ نہیں کہ ابہام میں حسن ہے۔ کچھ عجیب نہیں۔ لیکن تقصیر معاف:

غرابت نے آفت کو برپا کیا  
درستی نہ کرنی تھی یہ کیا کیا  
خیر گزشتہ راسلوت۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

شاہ اسماعیل دہلوی نے اپنی کتاب ”تقریب الایمان“ میں لکھا ہے کہ اگر اللہ چاہے تو بہت سے خاتم النبیین کو پیدا کر سکتا ہے۔ اس کے جواب میں مولانا فضل حق خیر آبادی نے ایک رسالہ ”انتاراع الطیر خاتم النبیین“ کے نام سے لکھا۔ غالب

مولانا سے موصوف کو بہت مانتے تھے۔ کسی نے مرزا سے شاہ دہلوی کے نظریے کے بارے میں دریافت کیا کہ آپ کی رائے کیا ہے؟ دراصل یہ سوال الکلام سے حلق قضا تو غالب نے اس بارے میں سلطان العلماء سید محمد قبلہ سے بھی دریافت کیا اور جو خط ان کو لکھا وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

خداوند نعمت آپ رحمت سلامت۔ حلیم و کورنش و ذریعہ نیازی کہ  
پیش ازیں پناہ گاہیوں توفیق رواں داشتہ ام۔ ہر قول قریں باد۔  
دریں ہنگام در شیر و دانشمند باہم در آویختہ اند۔ یکے کی سراپہ کہ  
آفریدگار ہوتا ہے حضرت خاتم الانبیا علیہ وآلہ السلام می تواند  
آفرید۔ و ایں یکے کی فرمایہ کہ مصحح ذاتی و محال ذاتی است۔ بندہ  
چوں ہمیں عقیدہ دارد نظریے درگیر بندہ بدیں مدعا سر انجام دادہ  
است۔ ہر آئینہ چشم دارد کہ سواد بہ نور نظر اصلاح روشن شود۔ زیادہ  
مذہب ادب، از غالب، نگاشتنہ بہت و یکم جمادی الاولیٰ ۱۲۷۳ھ  
(دسمبر ۱۸۵۶ء)

اے کہ ی گوئی توانا کردگار	چوں محمد و دیگرے آرد بکار
با خداوند و مکتبی آفریں	مستحق نبود تلمیذی ایں جنس
نظر حقیقی نظر تر باید حقیقت	آنکہ چندی کہ بہت اعدا نہفت
کرچہ فقر و دود آدم بود	ہم ہندو خاکیہ کم بود
صورت آرائش عالم گر	یک نہ دیک مہر و یک خاتم گر
ایکہ ی گویم جا بے پیش نیست	مہر و نہ زان جلوہ تابے پیش نیست
آنکہ مہر و ماہ و اختر آفرید	ی تواند میر و دیگر آفرید
گر دو مہر از سوسے خاں آورد	کود باد آں کو نہ پاد آورد
قدست حق پیش ازیں ہم بودہ است	ہر چہ اعینے کم از کم بودہ است
لیک در یک عالم از دوسے یقین	خود نمی سمجھد و ختم المرسلین

ایک جہاں تا بہت یک خاتم بس است  
 از دل ہر ذوق ہر آرد عالمے  
 ہر کجا ہنگام عالم بود  
 دو یکے عالم دو خاتم را مجھے  
 کثرت ابداع عالم خوب تر  
 غالب ایں اندیشہ پذیریم بھی  
 اے کہ ختم المرطین اش خواندہ  
 ایں مالف لائی کہ استغراق راست  
 غنایہ ایجاد ہر عالم یکے است  
 خود ہی گئی کہ نورش ازل است  
 اولیت را بود شانی تمام  
 جہر کل ہر حجاب حشیہ  
 تا نہ ہدی اعد اسکاں ریح و رنگ  
 ہم اسکاں اعد احو منزلت  
 سازج عالم بخش کرد اختیار  
 ایں نہ مجرست اختیارست اے فقیہ  
 ہر کرا با سایہ نہ پسندو خدا  
 ہم کہر سحر حیرش چوں بود  
 منور اعد کمال ذہینست  
 قدس حق را نہ یک عالم بس است  
 تا بود ہر عالمے را خاتمے  
 رحمۃ اللعالمین ہم بود  
 صد ہزاراں عالم د خاتم یکوے  
 یا یک عالم دو خاتم خوب تر  
 خردہ ہم بر خویش ی کیرم بھی  
 داتم از روے بخشش خواندہ  
 حکم باطن معنی بطلاق راست  
 مگر دو عد عالم بود خاتم یکے است  
 از ہمہ عالم نمودش ازل است  
 کے بہر فردے پذیرد انقسام  
 دو مجھ وہ نیاید حشیہ  
 خیر اسکاں بود ہر محل تنگ  
 چوں ز اسکاں نگوری دانی کہ چست  
 کس بعالم محل نمود زہجار  
 غریب بے ہمتا بود لایسب فیہ  
 بچو ادنی نقش کے بندو خدا  
 سایہ چوں نمود نظیرش چوں بود  
 لازم منش محال ذہینست  
 زمیں حقیقت ہر نہ گرم اسکام  
 نامہ را در ی نورم واسکام

تقریر تاریخ ۳۳ جمادی الثانی ۱۲۷۳ھ

(مطابق جنوری ۱۸۵۷ء)

غالب کے تذکرہ بالا خط کا جواب حسب ارشاد سلطان العلماء جناب مفتی صاحب نے تحریر ذیل میں دیا:

بعد اچھے سلام بالاکرام کہ طفرے و بیچارے کلام و طوہاے  
دارالسلام اسلام است۔ مشہور خاطر خاطر بان، صحیفہ مرسلہ مشتمل  
بر مسئلہ و مضمین اشعار آہدار کہ مرسلہ بند اچھا اذہان و افکار و روش  
نکلیں بازار لٹلی شاہوار ہو، رسید۔ الحق کہ داوخن داوہ اند و نافہ  
مخبط نقن کشادہ۔ سلاست مہائی بالاطلاب معانی باہم آئینہ و  
مباحث علیہ با مضامین شرعیہ در یک قالب ریختہ در قلمرو شعر و سخن  
و نظم و انتظام تمام کہ از قدیم الایام معلوم ہو۔ الحال توغل و  
مداخلت در معقول و معقول زیادہ با صحت سرور شدہ و نور علی نور لکن  
اسی مسئلہ از علم کلام است و غرض در ہی فن بر غیر خواص حرام و  
اقتحام در شہادت مظنہ اشتباہ و غلط است و از چیزے کہ شارع  
مقدس بایں تکلیف نہ داوہ سکوت احوط بہر حال بالا جمال اعتقاد  
باید کرد کہ قدرت الہیہ وسیع است و بر جمیع ممکنات و مقدورات و  
انہاد مثل جناب رسالت آب فی نفس مصحح ذاتی نیست۔ اگرچہ  
باقتبار خصائص عرضیہ مثل افضلیت و اذلیت و خاتمیت و اکسلیت  
کہ نظر بآپ کریمہ ”لکن رسول اللہ و خاتم النبین“ و حدیث ”اذل  
ما خلق اللہ نوری“ و احادیث کثیرہ دیگر مقرون بالنبین است بلکہ  
از جملہ ضروریات دین انہاد مثل و ماناے آں جناب بمولہ متفق  
ی باشد۔ لکن تقدس و حرمت ذاتی از شریک بخش جناب احدیت  
است نہ از صفات بشریت و لہذا در حق خودی فرمایید ”ولم یکن لا  
کلوا احد“ و جناب رسالت جناب خطاب فرمودہ کہ ”قل الما اتا بشر  
مسلک“ لکاتبہ ذواتی نکندہ والاف سرمدی نہ رسد۔ بحر و شان خداے

کس از خودی نہ رسد۔ و غالب کہ مفاد کلم غالب ہمیں مطالب  
است۔ والسلام خیر تمام۔

ملقبی صاحب کی ایک شہری ”خطاب فاضل“ ۱۲۳۵ء ہے۔ اس میں بہادر شاہ  
ظفر کے حکم کے قصبے کے علاوہ غالب کا بھی ذکر کیا گیا۔ چند شعر یہ ہیں:

حالا دیگرے ز قوم ذلیل      رد نوشت است بر کلام غلیظ  
گرچہ روئے سخن بہ غالب بود      لازمش دفع آں مثالب بود  
یک غالب ملاح غوثی نہ دید      در تسنن ملاح غوثی نہ دید  
زانکہ بود است او ز اہل کمال      نہ ز متساب بود و نہ از ذال  
او نہ باطلج مرد بھلی بود      تاج حکم شاہ دہلی بود  
نامہ نویس کہ او گفتہ      نیست آخیم یقیں کہ او گفتہ  
بہر نقش کلام ی ماند      راز پوشیدہ را خدا دانہ  
خاہرا بودہ است اصل سخن  
یا ز نوشاہ یا ز شاہ کہن



## حواشی

۱۵۱ مضمون کی چابی میں مرزا محمد باقر مزین لکھنؤ کی کتاب ”تجلیات ام تاریخی جارجیا مہاس“  
(۱۹۲۵-۲۶ء) مطبوعہ نکای پرنس لکھنؤ سے استعارہ کیا گیا۔ کتاب بار ہے۔ اس کا ایک کمال نسخہ پروفیسر  
عمر مسعود کے کتب خانے میں موجود ہے۔

۱۵۲ کلیات غالب میں ایک شہری ”بیان صومانی شانی نبوت و ولایت کہ در حقیقت پنج نورانی اور  
حضرت انور است“ موجود ہے۔ اس میں حضرت رسالت آپ ﷺ کی شان نبوت اور ولایت علی کی صحت  
و رسالت جان کی گئی ہیں۔ شہری میں ۱۸۸۰ء شمر چلا۔ غالب نے اس میں سے آخری ۳۰ شعر لطائف اعلیٰ کو

ارسال کیے تھے۔

۳۰۔ مفتی صاحب کی ایک مثنوی ”غلاب فاضل“ ہے۔ اس میں بہادر شاہ کے حکم کے قہقہے کے علاوہ غالب کا بھی ذکر موجود ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ بادشاہِ دہلی نے ۱۷۷۰ ہجری میں تاجپوری کے دوران اپنے عزیز حیدر شاہ سے صحت پانچ کے لیے دو گواہ حضرت عباس لکھنوی میں حکم چڑھایا اور نذر دلائی۔ بادشاہ نے دہلی میں اپنی شہیت کا اعلان کیا۔ اس تبدیلی مسلک پر حکیم حسن علی شاہ (دوبہا عظمیٰ) اور لوگوں نے بادشاہ کو سخت کہا کہ وہ ظلیے میں بادشاہ کا نام خارج کریں گے۔ اس موقع پر بادشاہ کے حکم سے غالب نے (بے نام مثنوی) اور مولوی صہبائی نے ”دعِ الہاقل“ کہی۔ دونوں مثنویوں میں بادشاہ، شہزادہ حیدر شاہ اور میر دوست علی ظلی (شاہِ کروآٹھن) کے بیان کی ترویج کی گئی۔ صہبائی نے مفتی صاحب پر الزام لگایا تھا کہ حکم کے قہقہے کے پیچھے بھی کا ہاتھ تھا اس لیے مثنوی میں مفتی صاحب کی جگہ کی گئی۔ ”غلاب فاضل“ مثنوی ”دعِ الہاقل“ کی رد میں لکھی گئی تھی۔

# دیوانِ غالب: نسخہ حمید یہ

## (بعض اہم انکشافات)

(غالب انشلی ٹیوٹ، نئی دہلی کے زیرِ اہتمام غالب سیمینار دسمبر ۱۹۸۸ء میں دیوانِ غالب میں منعقد ہوا تھا۔ یہ مقالہ ایک بڑے اجتماع میں ماہرینِ غالبیات جناب مالک رام، آل احمد سروں گوپتی چند نارنگ، قمر رحیم، ظلیق انجم وغیرہم کی موجودگی میں پڑھا گیا۔ اکبر حمیدی)

نسخہ حمید یہ کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا تھا۔ سرورق پر غالب کی اس تصویر کا ٹکس ہے جو نسخہ نظامی ہدایونی میں ۱۹۱۵ء میں چھپا تھا۔ اس صفحے میں یہ بھی درج ہے:

دیوانِ غالب جدید (المعروف بہ نسخہ حمید یہ) مرزا اسد اللہ خاں  
غالب مرتبہ مفتی محمد انوار الحق۔

کتاب کا سائز ۸/۲۰x۳۶ ہے۔ صفحہ نمبر ۱ پر نواب حمید اللہ خاں کا ”سرماتہ“

یوں درج ہے:

اوائے خاص سے غالب ہوا ہے کتب سرا  
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ دہاں کے لیے



میں دلی مسرت سے میرزا غالب کے دیوان اردو کا یہ جدید نسخہ  
 اپنے ملک کے سامنے پیش کرتا ہوں اور مجھے اپنی سعادت پر فخر  
 ہے کہ اس شہنشاہِ اہمِ سنخوری کے مجددِ شباب کی نازک خیالی اور  
 نکلتے نچنے کے یہ نقشِ اول، جو سو برس سے کچھ قبول اور گوشے  
 ڈھول میں چڑے تھے آج میرے ذریعے سے ملک میں رونما اور  
 جلوہ بھرا ہوتے ہیں۔ اردو، جو بلا اختلاف ملت ہم سب کی  
 مشترکہ زبان ہے اور جس پر ہماری ترقیوں کا انحصار ہے، اپنے  
 مجبورِ ادب میں اس بے بہا اضافے پر جتنا ناز کرے بجا ہے اور  
 اربابِ فہم و عارف جو بلا امتیاز قوم و وطن اس غلاقی معانی کی نثر  
 سراہی اور مضمونِ آفرینی کے دل دادہ ہیں، اس کی جس قدر قدر  
 کریں، زیبا ہے، کیوں کہ اس میں کلام نہیں کہ:

از نازکی بہ دہر کمر نمی شود  
 نچنے کہ کلکِ غالبِ خونین رقم کند

اس کے بعد اعر کے فاضل میں یہ عبارت ہے:

دیوان غالب جدید / المعروف بہ نسخہ جدید / مع مقدمہ دیوان / غر  
 قوم جناب ڈاکٹر عبدالرحمن مرحوم بی اے، ایل ایل بی اے، پرنسپل  
 ایٹ لا، ڈی، ہے / مرتبہ خاکسار ضیاء العلوم مفتی محمد انوار الحق  
 ایم۔ اے، مفتی فاضل / ڈائریکٹر تعلیمات، ریاست بھوپال۔

اس وقت ہمارے پیش نظر دیوان غالب نسخہ جدید کا وہ آئینہ نسخہ ہے جسے  
 ۱۹۸۲ء میں اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ نے شائع کیا تھا۔ اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر محمود  
 اعلیٰ صاحب ”پیش لفظ“ میں لکھتے ہیں کہ:

غالبیات کا مطالعہ کرنے والوں کو دیوان غالب کے نسخہ جدید کی  
 اہمیت کا علم ہے۔ دیوان غالب کا ایک خطی نسخہ مکتوبہ ۱۲۳۷ھ

(۱۸۸۱ء) سابق ریاست بھوپال کے سرکاری کتاب خانے میں محفوظ تھا۔ جس سے غالب کے غیر متداول کلام کی نکالیں بھی ہوئی تھیں۔ اس خطی نسخے کو سامنے رکھ کر مفتی محمد انوارالحق نے ”دیوان غالب جدید المعروف بہ نسخہ جدید“ مرتب کیا جس کی اشاعت ۱۹۲۱ء میں عمل میں آئی۔۔۔ ہر چند نسخہ جدید یہ اغلاط سے معصوم ہے۔ لیکن ایسی صورت میں جب کہ اصلی خطی نسخہ مفقود و باخبر ہے۔ اسی پر انحصار کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔

صفحہ ۳ سے ص ۲۳ تک مفتی محمد انوارالحق کا مضمون ”تہذیب“ کے عنوان سے درج ہے۔ اس کے بعد ص ۲۵ سے ۱۳۹ تک ڈاکٹر عبدالرحمن بکنوری مرحوم کا وہ معرکہ آرا مقدمہ شامل کیا گیا ہے جو انھوں نے حیدرآباد دیوان غالب کے لیے اپنی وفات دسمبر ۱۹۱۸ء سے قبل لکھا تھا۔ بعد مقدمہ ایک صفحہ بالکل خالی چھوڑا گیا ہے۔ اس کے بعد نئے سرے سے صفحوں کے نمبر ڈالے گئے ہیں۔ صفحہ ایک سے ۲۳۲ تک متن شامل کیا گیا ہے۔ ابتدا میں غزلیں ہیں، آخری غزل صفحہ ۲۸۸ پر ختم ہوتی ہے۔ اس میں آٹھ شعر ہیں۔ ذیل میں مطلع اور مطلع درج کیے جاتے ہیں:

میں ہوں مشتاقی جننا، مجھ پہ جننا اور سہی  
تم ہو پیداو سے خوش، اس سے سوا اور سہی  
مجھ سے غالب یہ طعانی نے غزل کھسائی  
ایک بیجا و کبر رنج فزا اور سہی

حاشیے میں یہ مہارت درج ہے:

یہ غزل غالب نے اپنے ایک خط میں لکھی ہے جو ”اردوئے معلّے“

اور دیوان غالب مطبوعہ بدایوں کے آخر میں موجود ہے۔

ذیل میں پہلی غزل درج کی جاتی ہے۔ پانچ شعر ایسی ہیں جو خارج کردیے

کئے۔ مقابلے کے لیے مطبوعہ دیوان دیکھا جاسکتا ہے۔ غزل میں پہلے اسد شمس تھا۔

بعد میں غالب ڈالا گیا:

قتل، فریادی ہے کس کی شوئی حجر کا  
کاغذی ہے پھر ہن ہر پیکر تصویر کا  
آتشیں پا ہوں، گداور دھبہ زنداں نہ پوچھ  
سوے آتش دیدہ ہے حلقہ بری زنجیر کا  
شوئی نیرنگ صبو دھبہ طاؤس ہے  
دام سبزے میں ہے پرداز چمن تنہا کا  
لقد اہوار باز، افسوس عرض ذوق قتل  
فصل آتش میں ہے تنگی یار سے فحیر کا  
کاد کاد سخت جائیہاے چھائی نہ پوچھ  
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوے شیر کا  
نشب بشب دسج مجر و قاب، آغوش دانا  
بہ ہوا ہے بل سے چاند کس تعمیر کا  
دھبہ غراب دم شور قاشا ہے آسہ  
سینہ شمشیر سے ہار ہے دم شمشیر کا  
آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچائے  
دعا عطا ہے اپنے عالم تقریر کا  
بلکہ ہوں غالب امیری میں بھی آتش زہر پا  
سوے آتش دیدہ ہے حلقہ بری زنجیر کا

صفحہ ۲۸۹ سے صفحہ ۲۹۰ تک قصائد ہیں۔ ان میں ”دور صفحہ انہ“ کی مثنوی

بھی شامل ہے۔ پہلے قصیدے کا مطلع یہ ہے:

بحر ترویج جناب دہلی یوم اصحاب  
ضامن تمہیر قمرستان دہلائے غراب

قصیدے کی ابتدا میں ”فاتحہ قاری“ جلی حروف میں لکھا ہوا ہے اور حاشیے کی مہارت یہ ہے:

یہ فاتحہ دیوانی غالب قاری مطبوعہ نوکلشور کے صلیب ۴، ۴۸، ۴۹ پر  
پر اختلاف خفیف درج ہے، لیکن چوں کہ قلمی اور مطبوعہ نسخوں میں  
حصہ و اشعار کی کمی و بیشی ہے، اس لیے یہاں قلمی نسخے کے اشعار  
کو پورا نقل کر دیا ہے اور جو شعر دو دیوانوں میں مشترک ہیں ان  
کو ”م“ سے ممتاز کر دیا ہے۔ بخلاف طوالت مطبوعہ شعروں کے  
اختلاف دکھانے کی میں نے جرأت نہیں کی۔ ارباب ذوق مطبوعہ  
دیوانوں سے مقابلہ فرما سکتے ہیں۔

آخری قصیدہ ”در مصیبتِ انہ“ ہے۔ اس میں ۳۳ شعر ہیں، پہلا اور آخری  
شعر درج کیے جاتے ہیں:

ہاں، دلِ دردِ مہِ زمزمہ ساز کیوں نہ کھولے درِ خزینہ راز  
شاد و دلِ شاد و شادیاں رکھو اور غالب پہ مہریاں رکھو  
صفحہ ۳۲۷ سے ۳۳۷ تک چھوٹے بڑے قطعات ہیں۔ پہلے قتلے کی ابتدا ذیل  
کے شعر سے ہوتی ہے:

اے شہنشاہِ فلکِ ماطر بے مثل و نظیر  
اے جہاندارِ کرم شہداء بے شہد و عدیل  
آخری قتلے کے دو شعر یہ ہیں:

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں  
دوبار دارِ لوگِ بجمِ آشنا ہیں  
کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام  
ہے اس سے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

پھر اسی صفحے سے آخری صفحے ۳۳۶ تک رباعیات ہیں۔ ان کی تعداد ۲۲ ہے۔

پہلی اور آخری رباعی پیش کی جاتی ہیں:

بعد از اتمام بزم صید الخصال کلام جوانی رہے ساغر کش حال  
آپچھے ہیں تاسواد اقلیم عدم اے عمر گزشتہ یک قدم استقبال  
ان سم کے شہوں کو کوئی کیا جانے کیجے ہیں جو ارمغانِ شہِ دلائے  
گن کر دیویں گے ہم دعا کیں سو ہار فیروزے کی تسبیح کے ہیں یہ دانے  
دیوان کے حاشی میں حصہ شعر درج ہیں۔ دوسری غزل کا دوسرا شعر متن  
میں اس طرح ہے:

مہ اختر نساں کی بھر استقبال آنکھوں سے  
تماشا کشور آئینہ میں آئینہ بند آیا  
حاشیے میں اس شعر کے پہلے مصرع کے بارے میں یہ لکھا ہے:  
پہلے یہ مصرع متن میں یوں تھا:  
بہ استقبال تماشا زہ اختر نساں شونی  
غزل کا مطلع یہ ہے:

جنوں گرم انتظار و تالہ چٹاپی کند آیا  
سویا تا بلب زنجیر سے دور پند آیا (۱۲) شعر  
مصرع چلی یوں گج ہے:

”سویا تا بلب زنجیری دور پند آیا“

ص ۳ کے متن میں شعر یوں درج ہے:

سواد چشم بسل انتخاب نقطہ آرائی غرام ناز بے پرواہی قائل پند آیا  
اس شعر پر ”لا، لا“ لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب اسے حذف  
قرار دیا ہے اور اس کے بجائے حاشیے پر یہ شعر بڑھایا گیا:

روانی ہائے موجِ خونِ بسل سے ٹپکتا ہے کہ لعل بے تماشا زہن قائل پند آیا  
نسخہ جدید کا متن پُر از غلطی ہے، ذیل میں چند غلطیوں کی نکال دی گئی ہیں

جاتی ہے:

م ۵ غزل:

عشق سے طبیعت نے ریت کا حرا پایا

غزل کا ایک شعر یوں ہے:

شب نگارہ پرورد تھا خواب میں خیال اس کا

صبح، صبحے گل کو دلقب پوریا پایا

پہلے مصرع میں خیال کے بدلے ”غرام“ درست ہے:

م ۶ غزل:

شوق، ہر رنگ رقیب سر و سماں نکلا

مصرع پہلے اس طرح تھا:

عشرت ایجاد چہ بوسے گل و گو دوو چراغ

غزل کا مطلع پہلے یوں تھا:

کارخانے سے جٹوں کے بھی میں عریاں نکلا

میری قسمت کا نہ ایک آدھ گریباں نکلا

شعر:

خود رسولی دل دیکھ کر یک نالہ دل

لاکھ پردے میں چھپا پھر وہی عریاں نکلا

مصرع ثانی یوں درست ہے: لاکھ پردے میں چھپا پر وہی عریاں نکلا

م ۱۱ شعر:

نہ ہو وحشت کشی درجی سراپ سطر آگئی

میں گرد راہ ہوں بے دعا ہے بچہ و خم میرا

مصرع ثانی یوں ہونا چاہیے:

قبار راہ ہوں بے دعا ہے بچہ و خم میرا

مقطع:

اسدِ وحشت پرستِ کوشے تہائی دل ہے  
برنگِ موج نے، خیاءِ ساغر ہے دم میرا  
مصرعِ ازل میں "ہے" کے بجائے "ہوں" گج ہے۔  
س ۱۲ مصرع:

تھائل کو نہ کر مصروفِ جنسین آزمائی کا  
یہاں "مصروف" کے بدلے "معزول" گج ہے۔ اسی طرح ذیل کا  
مصرع دیکھیے:

نظر بازیِ طلسمِ وحشتِ آباد پرستاں ہے  
گج مصرع یہ ہے:

نظر بازیِ طلسمِ وحشتِ آباد پریشاں ہے  
س ۱۷ شعر:

غربِ بدد جتہ بازگشتنِ خن ہوں، خن بر لبِ آدوگاں کا  
مصرعِ ازل میں درست ہے:  
غربِ ستم دیدہ بازگشتن  
مصرع:

وہاں کرم کو طرہِ بارش تھا حاکمِ خرام  
یہاں "عتا" کی بجائے "عتاں" ہونا چاہیے۔ یہ مصرع بھی ملاحظہ ہو:  
شوخیِ بارش سے رہ فوارہِ سیلاب تھا  
یہاں "فوارہِ سیلاب" ہونا چاہیے۔ غزل کا مقطع یہ ہے:  
وہاں جھومِ نقدِ ہائے سازِ عشرت تھا اسد  
ناخنِ غمِ ہاں سرِ تارِ نفسِ مضرب تھا

غزل کا مطلع :

شب کہ ذوقِ گفتگو سے تیری، دل بے تاب تھا  
شوئی وحشت سے انسانہ نسوں خواب تھا  
ماشے میں مطلع کے بارے میں لکھا ہے کہ:

اس غزل کا مطلع اور مقطع دونوں دیوانی غالبؔ شائع کردہ مولانا  
صرت موہانی اور دیوان غالبؔ مطبوعہ مطبع انکلی بدایونی کے آخر  
میں غیر مرتبہ اشعار کے ضمن میں درج ہیں۔

صفحہ ۳۸ میں پانچ شعر کی ایک غزل ہے، مطلع اس طرح ہے:

دردِ ام حق سے دیدارِ صنم حاصل ہوا  
رشتہٴ تسبیحِ تارِ جادۂ منزل ہوا

پہلا ہی لفظ ”درد“ غلط ہے، دراصل یہ ”درد“ ہے۔

دیوان غالبؔ نسخہ حمید یہ غالبؔ کے قلمی دیوان نسخہ بھوپال کا جدید ایڈیشن

ہے۔ مفتی انوار الحق نسخہ بھوپال کے بارے میں لکھتے ہیں:

اس نادر کتاب کو محفوظ رکھنے کا شرف کتب خانہ حمید یہ بھوپال کو  
حاصل ہے۔ یہ تحقیقی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ یہ دیوان یہاں  
کیوں کر پہنچا، لیکن تاریخ کتابت اور ممبروں وغیرہ سے اتنا پتا چلتا  
ہے کہ یہ غالبؔ رئیس وقت نواب غوث محمد خاں صاحب کے بیٹے  
میاں فوجدار خاں صاحب کے لیے لکھا گیا تھا، چنانچہ اس کے  
شروع میں ایک سطر پر یہ لکھا ہوا ہے:

”دیوانی بدایمن تصنیف مرزا نوشہ دہلوی، المخلص بہ اسد از کتب

خانہ سرکار فیض آغار عالم پناہ میاں فوجدار محمد خاں بہادر دام اقبال

قلمی خوشخط۔“



خانے پر ڈیل کا ترجمہ ہے:

”دیوان من تعینف مرزا صاحب و قبلہ الحکام بہ اسد و غالب  
سلمہ ربم علی من الخیرات الخویہ صورت اتمام یافت۔“

بعض لوگ کہتے ہیں کہ نسخہ حمید یہ کے حواشی میں جو اشعار ہیں یا جن اشعار کو غالب نے قلم زد کیا ہے، وہ غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ لیکن مرثی صاحب ان لوگوں کی آرا سے شکیں نہیں ہیں۔

مرزا غالب کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا۔ ان کے انتقال کے بعد ہی لوگوں کو ان کا کلام دریافت کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ انھوں نے اس بات کی تحقیق نہیں کی کہ یہ کلام واقعی مرزا کا ہے۔ تذکروں سے ثابت ہے کہ مرزا غالب سے پہلے اور ان کے زمانے میں کئی لوگ اسد اور غالب کے قصص سے لکھتے تھے۔ ہماری رائے میں ان لوگوں کا کلام مرزا اسد اللہ خاں غالب کے نام سے عام پہلی مرتبہ ”مجمع الاشعار“ مطبوعہ مطبعہ فولکلور لکھنؤ میں ۱۸۷۲ء میں چھپنا شروع ہوا۔ ہمارے پاس اپریل ۱۸۷۷ء کا تیسرا ایڈیشن ہے۔ اس کے صفحہ ۴۴ اور ص ۸۳ میں ”غزل غالب“ کے عنوان سے دو غزلیں چھپی ہیں۔ پہلی غزل میں ۷ اور دوسری میں ۶ شعر ہیں۔ دونوں غزلوں کے مقطع درج کیے جاتے ہیں۔

(۱) آگے اپنے یار کے غالب ہمیں معیوب ہیں

دوست ہے اس کو اسی صیب و ہجر کا امتیاز

(۲) لیکن کر ہووے گا خوش حال دو شاہ کوئی

ہم بھی ہیں شاد اے غالب اسی مرثیائی میں

پہلی غزل دیوان جہاں جہی میں کرم العدل بہادر بیک خاں قصص غالب کے نام منسوب ہے۔ ”مجموعہ تنقید“ (سال کتابت ۱۲۲۳ھ) میں اس غالب کا سال انتقال ۱۲۱۸ھ دکھایا گیا ہے۔ ”معین بے نظیر“ میں بھی یہ غزلیں غالب کے نام سے شامل ہیں۔ یہ غزلیں بعض لوگوں نے اسد اللہ خاں غالب مرزا نوشہ سے منسوب کر کے غلطی

کی ہے۔

”مخزن“ لاہور کے اہلئ پرچوں میں بھی غالب کے نام سے دوسروں کا کلام چھپنے لگا۔ یہ سلسلہ ”الہلال“ کلکتہ میں چاہی رہا۔ ۱۹۱۹ء میں غالب کے انتقال کے پورے پچاس سال کے بعد دیوان غالب نسخہ بھوپال منواریا کیا گیا اور اس پر ۱۳۳۷ ہجری (۱۸۸۲ء) کا ترقیہ دکھایا گیا۔ کس نے لکھا، کہاں لکھا گیا اور بھوپال کیسے پہنچا؟ آج تک تھکے تحقیق ہے۔ ترقیے کے پورے ایک سو سال کے بعد ۱۹۲۱ء میں شائع کیا گیا۔ اشاعت سے پہلے ڈاکٹر عبدالحق ”اردو“۔ ماسی، انجمن ترقی اردو ہند، کے شمارے باہت جنوری ۱۹۲۱ء (صفحہ ۹) میں لکھتے ہیں:

انجمن ترقی اردو کا ایک مدت سے ارادہ تھا کہ مرزا غالب کے اردو دیوان کا ایک نئیس جج، جدید ایڈیشن طبع کرے۔ چنانچہ بڑی کوشش اور تحقیق سے یہ دیوان مرتب کیا گیا۔ میری درخواست پر ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم نے اس کے لیے ہلوہ مقدمہ غالب کے کلام پر تہرہ لکھنا شروع کیا۔ اسی اثنا میں اتفاق سے بھوپال کے سرکاری کتب خانے میں مرزا صاحب کے قدیم دیوان کا مکمل نسخہ نکل آیا، جس میں وہ تمام نظمیں درج تھیں جو بعد میں خارج کردی گئی تھیں۔ علمی لحاظ سے یہ ایک بڑی نعمت اور بیش بہا خزانہ تھا۔ مرحوم نے انجمن کے لیے اسے ترتیب دینا شروع کیا۔ لیکن انیسویں، اہل نے اتنی سہلت نہ دی کہ اس کی تکمیل ہو جاتی اور یہ ہنہار نوجوان، جو علم و اخلاق کا پتلا تھا بے وقت اس دنیا سے کوچ کر گیا۔

نسخہ جدید کے پورے دس سال کے بعد مولوی عبدالباری آسی مرحوم کے یہاں ایک اور ”نسخہ“ کا ظہور ہوا، جس میں مرزا غالب کا غیر مطبوعہ کلام مافر تعداد میں دکھایا گیا۔ اردو کے مشہور ناقد جناب نیاز فتح پوری صاحب نے اپنے مشہور ماہ نامے

”پکار“ لکھنو، پابت فروری ۱۹۳۱ء شمارہ ۲، (صفحہ ۶۱ تا ۶۶) میں ”نواور ادب: غالب کا غیر مطبوعہ کلام“ کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا۔ اس میں آرتھی صاحب کے اختراع کردہ غالب کے غیر مطبوعہ کلام کو نزع و طبع سے آراستہ کیا۔ انتخاب میں ۹ غزلوں کے ۷۶ شعر درج کیے۔ نیاز صاحب نے غالب کے ان نام نہاد فرضی اور جعلی اشعار کو قطعیت اور یقینی محکم کے ساتھ کلام غالب قرار دیا، فرماتے ہیں:

اس وقت غالب کے اردو کلام کے دو مجموعے ملک میں نظر آتے ہیں۔ ایک وہ عام اور متداول نسخہ جس کے مصنف کہا جاتا ہے کہ مولانا فضل حق خیر آبادی کے مشورے سے غالب نے مرتب کیا تھا اور جس میں سے زیادہ نقل اور دشار اشعار نکال دیے تھے۔ دوسرا وہ جو نثر محمدیہ کے نام سے معروف ہے، اور جس کو ڈاکٹر بجنوری مرحوم نے کتب خانہ بھوپال کے ایک قدیم نسخے کے موافق مرتب کیا اور انجمن ترقی اردو نے شائع کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نسخے میں تمام وہ اشعار موجود ہیں جن کے حذف کرنے کے لیے بعد متداول نسخہ مرتب کیا گیا تھا۔ اس لیے خیال کیا جاتا تھا کہ اب کوئی حصہ کلام غالب کا ایسا نہیں ہے۔ جو شائع ہونے سے رہ گیا ہو۔ لیکن حال ہی میں ایک علمی بیاض صدیق بک ڈپو کو دستیاب ہوئی ہے جس میں حصہ و غزلیں غالب کی ایسی درج ہیں جو نہ متداول نسخے میں پائی جاتی ہیں نہ نثر محمدیہ میں۔ اب یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ غزلیں واقعی غالب کی ہیں یا نہیں اور دوسرا یہ کہ اگر غالب ہی کی ہیں تو اس نسخے میں کیوں نہیں پائی جاتی ہیں جو بھوپال بھیجا گیا تھا۔ ہر اول کے مصنف گفتگو فضول ہے، کیوں کہ غالب کا رنگ سخن ایسا نہیں جو چھپا رہے اور جس پر دو رائیں قائم

ہوئیں۔ رہ گیا ہر جانی، سو یہ ہو سکتا ہے کہ بھوپال والے نسخے کی ترتیب کے بعد غالب نے اور غزلیں کہی ہوں اور ان میں سے بعض کسی نے اس بیاض میں نقل کر لی ہوں یا پھر یہ وہ غزلیں ہیں جو مختلف اوقات میں غالب نے بغیر مسودہ رکھے ہوئے کسی کو سنائی ہوں اور اس نے محفوظ کر لیا ہو۔ بہر حال، بیاض زیر بحث میں چھٹی غزلیں پائی جاتی ہیں وہ یقیناً غالب کی ہیں۔

ایک اور معروف نقاد جناب بھٹوں گورکھ پوری اپنے رسالے ”ایمان“، بابت جنوری ۱۹۳۱ء میں لکھتے ہیں:

میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی جب کہ میں پچھلے ہفتے لکھڑا گیا اور اپنے مکرم دوست جناب مولانا عبدالہادی آسی کے پاس ایک گھٹی بیاض جس میں علاوہ اور شعرا کے غالب کی بھی چند غزلیں ہیں۔ ان میں ایک یا دو ایسی ہیں جو نسخہ عہدہ اور دیوانہ غالب متداولہ دونوں میں موجود ہیں۔ باقی سب غیر مطبوعہ ہیں۔ بیاض یقیناً اب سے چالیس بیچاس سال پہلے کی لکھی ہوئی ہے۔ یہ غزلیں واقعی غالب کی ہیں یا نہیں، اس کا ثبوت ہوں تو ایک یہ بھی ہے کہ ان میں ایک دو غزلیں غالب کی ہیں۔ وہی بدش الفاظ، وہی اختصار و بلاغت، وہی دقت نظر، وہی شاعرانہ جلال جس نے غالب کو غالب بنادیا ہے۔ ان غزلوں کی امتیازی شان ہے۔ یہ غزلیں قطعاً غالب کے درمیانی دور کی ہیں، جب کہ ان میں توازن اور احتمال آپکا تھا اور جب کہ ان کے ہنکے میں دوسروں کو بھی حرا آنے کا تھا، یعنی جب کہ ان کی پیچیدہ خیالی اور مشکل بیانی میں سلاست اور کشش کی رونما ہو چکی تھی۔

دراصل اس جہلی اور فرضی ”غالب کا غیر مطبوعہ کلام“ کے خالق آسی تھے۔

موصوف نے اس سے قبل غالب کا الحاقی کلام مرثیہ کر کے دیوان غالب (اردو) کا ایک نیا ایڈیشن ۱۹۲۵ء میں شائع کیا۔ اس کے بعد ایک ضخیم کتاب ”مکمل شرح دیوان غالب“ مرثیہ کی۔ اس میں اپنا کلام غالب کے نام سے شامل کیا۔ کتاب ”مکمل شرح غالب اور غالب کا غیر مطبوعہ کلام“ کے نام سے ۱۹۳۱ء میں صدیقی بک ڈپو سے شائع ہوئی۔ اس میں غالب کی جو تصویر بھی ہے وہ بھی جعلی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ جناب امتیاز علی خاں عرشی نے بھی دیوان غالب نسخہ عرشی مطبوعہ ۱۹۸۷ء (انجمن ترقی اردو، ہند) میں آجی کے مرثیہ کردہ ان جعلی اشعار کو شامل کیا۔

مرزا غالب کی وفات کے پورے ایک سو سال بعد ”بیاض غالب علیہ السلام“ کا ایک اور قلمی نسخہ معرض وجود میں آیا گیا۔ فروری ۱۹۶۹ء میں جشن صد سالہ غالب سرکاری طور پر ملک کے طول و عرض میں منایا گیا۔ بیاض غالب، جسے نسخہ توفیق بھی کہا جاتا تھا، جناب اکبر علی خاں عرشی زاوہ نے ہندوستان میں شائع کیا تھا۔ اس کی نقل لاہور پچھائی گئی اور ”نقوش“ کے ایڈیٹر جناب محمد طفیل نے اسے بڑے اہتمام سے ”نقوش، غالب نمبر“ کے نام سے شائع کیا۔ مرثیوں کا دہائی تھا کہ اس میں غالب کا وہ کلام شامل ہے جو انھوں نے ۱۹ سال کی عمر میں ۱۲۳۱ھ (۱۸۱۶ء) میں ترتیب دیا تھا۔ پروفیسر کے ماہرین قابلیت جناب امتیاز علی عرشی، پروفیسر آل محمد سرور، مالک رام، عرشی زاوہ، غلام رسول مہر اور ڈاکٹر گیان چند وغیرہ نے اس کے مستحضر ہونے کی توثیق بھی فرمائی تھی۔ ہماری زبان انجی دہلی اور دوسرے رسائل میں اس کی مخالفت اور حمایت میں حصہ و مضامین شائع ہوئے۔ یہ مضامین ”نقوش“ لاہور غالب نمبر کے تیسرے صفحے میں موجود ہیں۔ بیاض غالب نسخہ لاہور ڈاکٹر شام احمد فاروقی کے مقدمے کے ساتھ پہلے شائع ہوا تھا۔ اس میں میر لانی قصص اسد کی ایک غزل ”مہم چہ، غم چہ“ بھی شامل کی گئی، جب کہ یہ غزل غالب کی حیات میں تذکرہ خوبصورتی میں میر لانی اسد کے نام سے چھپ چکی تھی۔ اس زمانے میں کمال احمد صدیقی نے ”بیاض غالب علیہ السلام“ کی رو میں ایک ضخیم کتاب ہمارے قلموں سے ”بیاض غالب کا ایک تنقیدی

جائزہ“ کے نام سے شائع کیا۔ اس میں موصوف نے نسخہ عرشی زاوہ کو جعلی قرار دیا۔ کتاب کی قیمت پانچ سو روپے رکھی تھی۔ کمال صاحب کا کمال دیکھیے کہ انہوں نے غالب کے ربک میں ایک غزل اختراع کی اور اسے ولی کے کسی کاتب سے خط غالب لکھا کر اس کا فوٹو اترا دیا۔ جب یہ فوٹو راقم نے کسی مصلحت کے تحت پروفیسر آل احمد سرور اور جناب مالک رام کو دکھایا تو انہوں نے اسے کلام غالب خط غالب تسلیم کر لیا۔ یہ غزل کمال صاحب نے کتاب کے آخر میں شامل کی۔ تصویر کے نیچے صفحہ ۴۸۷ میں کمال کا یہ جملہ لکھا ہوا موجود ہے:

”غزل کمال احمد صدیقی خط اسد اللہ خاں غالب“

یہ بات کھلی ذکر ہے کہ بھوپال کے سرکاری کتب خانے میں دیوان غالب نسخہ بھوپال عرصہ دراز سے غائب کیا گیا ہے۔ اس میں حمزہ تنجہ اور تذکرہ ذکا کے وہ اشعار غائب ہیں جو ترجمہ غالب میں درج ہیں۔ نسخہ عرشی زاوہ کے بارے میں اکبر علی خاں اور توفیق احمد چشتی امردہوی کے درمیان بھوپال کی عدالت میں مقدمہ بھی چل رہا تھا اور دوران مقدمہ یہ نسخہ بھی غائب کر دیا گیا۔ تھیلڈت ”نفوذ“ لاہور غالب نمبر کے تیسرے صفحے میں موجود ہیں۔ راقم الحروف کو دیوان غالب نسخہ جدید اور نسخہ عرشی زاوہ یا نسخہ غالب (لاہور) کے خط غالب ہونے میں اختلاف ہے۔ دونوں نسخوں میں جو اشعار غالب سے منسوب کیے گئے ہیں وہ بھی مشکوک ہیں۔ نسخہ جدید بھی غالب نیاز اور آسمی کی کارستانی کا نتیجہ ہے۔ نیاز اس زمانے میں بھوپال ہی میں مقیم تھے۔ قصہ کہنا کہ جب تک یہ دونوں صفحے (حمیدہ اور عرشی زاوہ) اصل حالت میں باز برآمد نہیں کیے جاتے اور تحقیق کی کسوٹی پر نہیں پرکھائے جاتے اس وقت تک راقم حروف ان کو غیر مستحضر قرار دیتا رہے گا۔ ان دونوں نسخوں میں غالب کے شخص سے سجدہ غزلیں ملتی ہیں۔ جب کہ مولوی محمد حسین آزاد ”آب حیات“ (ص ۵۰۰) میں لکھتے ہیں کہ غالب نے ۱۳۳۵ھ (۱۸۲۸ء) میں اسد اللہ کی رعایت سے غالب شخص اختیار کیا۔ یہ سچ ہے

کہ غالب نے اپنے دیوان کا انتخاب کیا تھا، اس کا ذکر ایک خط میں یوں کرتے ہیں:  
 چندہ برس کی عمر سے مجھیں برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا  
 گیا... وہی برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب قیڑ آگئی تو  
 اس دیوان کو دور کیا۔ اوراق یک قلم چاک کیے۔ وہی چندہ شعر  
 واسطے نمونے کے دیوانِ حال میں رہنے دیے۔

اس خط سے واضح ہوتا ہے کہ غالب نے اس قلمی دیوان کو پہاڑ کے پینکا  
 تھا۔ وہ اپنے کلام کو صاف و پاک رکھنے کے فکر مند رہتے تھے۔ کسی نے ان کے سامنے  
 میر لانی اسد کا مقلع پڑھا تو انھوں نے کہا، ”اگر یہ مقلع میرا ہو تو مجھ پر ہزار لعنت۔“  
 ایک خط میں مرزا شہاب الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں کہ:

واسطے خدا کے، یہ تم نے اور حکیم غلام نجف خاں نے میرے  
 دیوان کا کیا حال کر دیا ہے۔ یہ اشعار جو تم نے بیچے ہیں، خدا  
 جانے کس ولد اثر نے داخل کر دیے ہیں۔ دیوان تو چھاپے کا  
 ہے، متن میں اگر یہ شعر ہوں تو میرے ہیں اور اگر حاشیے پر ہوں  
 تو میرے نہیں ہیں۔ بالفرض اگر یہ شعر متن میں پائے بھی جاویں  
 تو یوں سمجھنا کہ کسی لطوون زن جلب نے اصل کلام کو جھیل کر یہ  
 خرافات لکھ دیے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جس مسئلہ کے یہ شعر ہیں اس  
 کے باپ پر اور دادا اور پردادا پر لعنت اور وہ بختاؤ پشت تک  
 ولد الخروم۔ اس کے سوا اور کیا لکھوں؟

مضمون کے اختتام پر اس واقعے کا ذکر کرنا مناسب ہے کہ کمال احمد صدیقی  
 جن صدر سالِ غالب منصفہ ۱۹۶۹ء کے دوران ریڈیو تعمیر سری نگر سے وابستہ تھے۔ خواجہ  
 غلام محمد صادق وزیر اعلیٰ غالب کبھی کے صدر اور کمال صاحب نیکرٹری تھے۔ انہی دنوں  
 خواجہ صاحب کا انتقال ہوا اور کمال صاحب غالب کبھی کے مالک ہو گئے۔ انھوں نے  
 مجھ سے غالب پر پانچ سو روپے کے عوض ایک کتب اس شرط پر لکھوائی کہ کتاب  
 اشاعت پزیر ہوگی۔ عرصہ گزر جانے کے بعد کمال صاحب نے مجھے ۱۴ اپریل ۱۹۹۶ء

کو مطلع کیا کہ:

آپ کو یاد ہوگا کہ سری نگر میں غالب پر اپنے مضامین کا مجموعہ  
آپ نے دیا تھا۔ میرے پاس محفوظ ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ  
(جس کے ساتھ کمال صاحب وابستہ تھے) اسے شائع کرے، تو  
اس پر آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا۔

میں نے کتاب کی اشاعت کے لیے اپنی رضامندی سے آگاہ کیا۔ جون  
۱۹۹۸ء میں کمال صاحب سے میری ملاقات سری نگر میں ہوئی۔ کتاب کے بارے میں  
انہوں نے فرمایا کہ ”مسودہ چوری ہو گیا ہے۔“

میں نے یہ کتاب بڑی عرق ریزی سے لکھی تھی۔ اس کے تلف ہونے پر جو  
صدمہ مجھے ہوا وہ ناقابلِ بیان ہے۔ بجز اس کے اور کیا کہا جائے:  
”آں دفتر را گاو خوروں گاؤ را قصاب بدو و قصاب دوراہ نرو۔“



مضمون کی تیاری کے لیے درج ذیل کتابوں اور رسالوں سے استفادہ کیا گیا:

- (۱) ”آپ حیات“، مولوی نور حسین آزاد
- (۲) سہ ماہی ”ممدو“، پابند، جنوری ۱۹۳۳ء
- (۳) سہ ماہی ”ممدو“، پابند، جولائی ۱۹۳۵ء
- (۴) ”اندلس سے ملے“، مطلع، لکھنؤ، دہلی، ۱۸۹۹ء
- (۵) تذکرہ ”گلشنِ حسنہ بہار“، شریلی
- (۶) دیوانِ غالب نسخہ مرتبی، ۱۹۵۸ء
- (۷) دیوانِ غالب نسخہ مرتبی زادہ
- (۸) ”یواش غالب علیہ السلام غالب بھیدی جامعہ“، کمال احمد مدنی
- (۹) دیوانِ غالب نسخہ جدید (مطبوعہ اردو اکادمی، لکھنؤ)
- (۱۰) شرح دیوانِ غالب، مرتبہ آسی
- (۱۱) ”تاریخ الشعراء“، مطلع، لکھنؤ، ۱۸۷۲ء
- (۱۲) ”نقوش“، لاہور، غالب نمبر، ۳
- (۱۳) ”گلزارِ لکھنؤ“، پابند، فروری ۱۹۳۶ء



# مخطوطہ دیوانِ غالب (نسخہ سری نگر) اور مطبوعہ نسخے بحیاتِ غالب

شکیر یونیورسٹی اقبال لائبریری میں دیوانِ غالب کا ایک نامور الوجود قلمی نسخہ میری نظر سے گزرا۔ اگرچہ اس میں کہیں سالِ کتابت درج نہیں تاہم داخلی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ڈیڑھ سو سال سے بھی زیادہ پرانا ہے۔ کاغذ دیرِ کشمیری ہے جو جابجا نثرِ بچہ کی جگہوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ مخطوطہ مشہور تاجر کتب فروش احمد قاری مالک نیشنل بک ڈپو امرتسر ضلع مراد آباد کے پاس (جنہوں نے ۱۹۶۹ء میں غالب کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر متنازع فیہ دیوانِ غالب خطِ مصنف مکتوبہ ۱۳۳۱ ہجری بمطابق ۱۸۱۶ء پیش کیا تھا) موجود تھا۔ موصوف نے مخطوطے کی ابتدا میں پندرہ تقریریں درج کی ہیں۔ جن کے اقتباس انہی کے الفاظ میں پیش کیے جاتے ہیں:

(۱) یہ دیوانِ دہلی میں لکھا گیا ہے۔ ۲۳ جگہ اسدِ شخص لکھا ہے۔ اس کی کوئی غزل غیر مطبوعہ نہیں ہے۔ ایسی ترتیب میں فرق ضرور ہے۔ قلم بھی اچھا نہیں۔ محض قلم سے محروم ہے۔ صرف قدیم ہونے کے ناتے کچھ اہم ہے۔

مخطوط دیوان غالب (نسخہ سری محم) اور مطبوعہ نسخے عبارت غالب

(۲) حسان الہند علامہ محمد حسن علوی کا کوردی مرحوم و معذور سابق وکیل میں پوری الفت تھی ۱۳۲۳ء کے حقیقی پوتے جناب طاہر حسن علوی صاحب سے خریدے۔ اس کی مرمت میں نے خود کی۔ بڑی نری حالت میں اس کو خریدے۔ میں ۱۰ جنوری ۱۹۷۲ء کو لکھنؤ کے لیے چلا۔ ۱۱ کو لکھنؤ پہنچا، ۱۲ جنوری کو قصداً کاکوری گیا۔ میں نے سنا تھا کہ اس قصبے کے مشہور شاعر جناب حسن کاکوردی گزرے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے گھر کچھ مخطوطات ملیں۔ حسن اتفاق سے یہ مخطوط مجھے ملا۔ جو میں نے مبلغ پندرہ روپے میں خریدا۔ ۱۳ جنوری ۱۹۷۲ء کو اس کی اطلاع ”ہماری زبان“ کو دے دی گئی۔ ”ہماری زبان“ میں اس کو خطِ غالب لکھ دیا۔ صرف اس وجہ سے کہ ایک (انصار اللہ) نظر صاحب اور چند اشخاص نے پچھلے نسخے (عرشی زادہ) خطِ غالب کو خطِ غالب ہونے سے انکار کیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی نظر اس کو خطِ غالب تسلیم کر لے، حالاں کہ میں اس کو خطِ غالب نہیں مانتا ہوں۔ (دست خط توفیق احمد چشتی۔ اس کے بعد انگریزی حروف میں مہر ثبت ہے) <sup>۱۳۱</sup>

راجم حروف نے مخطوطے کا مطالعہ بجا کر نظر کیا۔ یہ ۳۳ ابواب (۶۶ صفحات) پر مشتمل ہے۔ پورا دیوان تیل و لکھت اور آمیزی میں لکھا گیا جس کا پڑھنا انتہائی مشکل ہے۔ کاتب کا نام معنود ہے۔ اشعار کی تعداد ۱۰۶۷ ہے۔ ورق ۱ الف میں کسی نے چند نام یادداشت کے طور پر لکھے ہیں۔ جیسے ”محمد عبدالرشید علی من، محمد عبداللہ خاں قبلہ و کعب“ پہلا نام کئی مرتبہ لکھا گیا ہے۔

میں نے مخطوطے کا مقابلہ دیوان غالب نسخہ عرشی سے کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ مخطوط دیوان غالب کے پہلے ایڈیشن مطبوعہ ۱۸۳۱ء سے بھی زیادہ پرانا ہے۔ دیا ہے اور ترمیم اشعار میں قدرے اختلاف بھی ہے۔ اس میں صرف غالب کا دیباچہ ہے۔ اس سے میرے موقف کی تائید ہوتی ہے کہ مخطوط پہلے ایڈیشن سے قبل کا ہے۔ جناب کالی داس گپتا رخصاء دیوان غالب نسخہ رضا پارسم ۱۹۹۵ء کے صفحہ ۸۶ میں نکالی بدایونی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

غالب نے اپنے اردو دیوان کے پہلے ایڈیشن کا دیباچہ ذی قصہ

مخطوطہ دیوان غالب (نثر مری نگر) اور مخطوطہ نئے عیادت غالب

۱۲۳۸ ہجری (مطابق ۱۶ اپریل ۱۸۲۳ء) کو جنم کیا۔ تقریباً چھ سال بعد نواب ضیاء الدین احمد خاں نے ۱۲۵۲ ہجری (۱۸۳۹ء-۱۸۳۸ء) میں لکھی۔ دیوان اکتوبر ۱۸۴۱ء میں ... چھاپا۔<sup>۲۵</sup>

اس حساب سے زیرِ نظر مخطوطہ تقریباً ۱۷۰ سال پرانا ہے۔ اس کی ابتدا میں دیباچہ غالب ہے۔ دیباچے کے بعد اور اشعار سے پہلے ”یا اسد اللہ الغالب“ لکھا ہے۔ اس کے بعد ورق ۲ ب پر غالب کی پہلی غزل یوں درج ہے:

لش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا کاغذی ہے بھر میں ہر تیکر تصویر کا  
کاد کاو سخت جابجائے تنہائی نہ پوچھ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوے شیر کا  
جذبہ ہے اختیار شوق دیکھا چاہیے سینہ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا  
آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچائے مدعا عطا ہے اپنے عالمِ تقریر کا  
بکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش در پا

سوے آتش دیدہ ہے حلقہ مری و نگر کا

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ غزل کا پہلا اور چوتھا شعر ”گلِ رعنا“ (احکام کلام غالب، سال ترتیب ۱۸۴۸ء) مرثیہ مالکِ دام، ۱۹۷۰ء میں بھی موجود ہیں۔ ورق ۳ الف میں یہ غزل بھی ہے:

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروے کار ۶ شعر

غزل کے تین شعر ۱۔ تھا طواب میں... ۲۔ لیتا ہوں، منکبِ غم... ۳۔ ڈھانپا کفن... ”گلِ رعنا“ میں درج ہیں۔ مخطوطے میں غالب کی مشہور غزل ہے۔ مطلع تا مقطع، یعنی ساتوں شعر، ”ہوتے تک“ کی مدنیف میں ہیں:

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہوتے تک کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہوتے تک  
غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگِ علاج شمع ہر رنگ میں جلتی ہے عمر ہوتے تک  
مخطوطے کی قدامت کا ایک اور ثبوت یہ بھی ہے کہ اس میں غالب کی بعض

مشہور غزلیں نہیں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایسا کلام بعد میں تصنیف کیا گیا تھا۔ چند غزلوں کے مطلع یہ ہیں:

- ۱۔ بزم شہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا  
دیکھو یارب، یہ در عجیبہ کوہر کھلا
- ۲۔ جوڑ سے باز آئے، یہ باز آئیں کیا  
کہتے ہیں، ہم تجھ کو منہ دکھائیں کیا
- ۳۔ ملتی ہے غم سے باز سے ہر التباب میں  
کافر ہوں مگر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
- ۴۔ ہے بسکہ ہر اک ان کے اشارے میں نکلاں اور  
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے کہاں اور
- ۵۔ لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور  
تجا کئے کیوں؟ اب رہو تجا کوئی دن اور
- ۶۔ سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں  
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پہاں ہو گئیں
- ۷۔ کچھ تھیں ہے، غم دل اس کو سنائے نہ بتے  
کیا بتے بات، جہاں بات بتائے نہ بتے
- ۸۔ نفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو  
برا ہوتا بُرا کیا ہے، لوا سخاں کشن کو
- ۹۔ پازچہ اظہال ہے دنیا مرے آگے  
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
- ۱۰۔ کسی کو دے کے دل کوئی لوا سخ فغاں کیوں ہو  
نہ ہو جب دل ہی بتے میں تو پھر منہ میں زبان کیوں ہو

ہم نے مخلوط دیوان غالب (نثری نگر) کے دیباچہ غالب کا مقابلہ نئے

مخلوطہ پانی غالب (نسخہ سری مگر) اور مخلوطہ نسخہ عبات غالب

آکرہ سے کیا۔ دونوں ایک جیسے ہیں اور کوئی اختلاف نہیں ہے۔ غالب نے مٹی  
شیونرائن کو دیوان کے نسخے ایڈیشن کی اشاعت کے لیے ۱۸۵۵ء کا مخلوطہ رام پور بھیجا  
تھا۔ اس لیے دونوں نسخے اغلاط سے پاک ہیں۔ ذیل میں نسخہ سری مگر سے دیا چہ  
غالب درج کیا جاتا ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مشام شبیم آشپایاں را صلا و ہوا و انجمن نعتیاں را حزدہ کہ لبتی از  
سامان عمرہ گردانی آمادہ و دامن از عود ہندی دست بزم دادہ  
است۔ نہ چوبہائی سنگ ژوپ خوردہ پہ بخار نا طبعی شکستہ بے  
انعام تراشیدہ بلکہ پہ صیر فلکاف بکار و ریح ریح کردہ بسوہان خراشیدہ۔  
ایں دن نفس گداختگی شوق پہ جتوے آتش پاری است نہ آتشی کہ  
در گنچہاے ہند افسردہ و خاموش۔ و از کب خاکستر بر برگ خودش  
یہ پرش بینی، چہ بروے مسلم است از ناپاکی باحتوان مردہ تبار  
فلکستن و از دیوانگی بر شیشہ شمع حزار کشتہ آویختن، ہر آئینہ بدل  
گداختن نیزد و بزم افروختن را نکاید۔ رہن آتش پہ ضعیف  
برافروزدند و آتش پرست را بیاد افراہ ہم و آتش سو زندہ نیک  
میداد کہ چو ہندہ در ہوائے آں رخشندہ آذر فعل در آتش ست کہ  
چشم روشنی ہو شک از سنگ بروں تافتہ و در ایوان لہر سپ نشو و نا  
یافتہ۔ خس را فروغ ست و لالہ را رنگ و تیغ را چشم و کدہ را  
چراغ۔ بخندہ، یزداں و دین انجمن بر افروز را سپاسم شرارے از اس  
آتش تاب تاک بخاکستر خویش یافتہ، بکا و کاو سینہ شتافتہ ام و از  
نفس دہر بر ماں نہادہ۔ نو کہ در اندک مایہ روزگار ان آں مایہ فراہم  
تواند آمد کہ عمرہ را فر روشنی چراغ و راتخ عود را بال شمسائی  
دماغ تواند کشید۔ ہا تا نگارندہ این نامہ را آں دہرست کہ پس

از انتخاب دیوانی ریختہ یہ گرد آوردن سراپے دیوان غازی بر خیزد و  
 باستفاضہ کمال این فرید فن پس زانوے خویشتن نشیند۔ امید کہ  
 سخن سراپان خنور ستائی پرانگندہ ایما تے را کہ خارج ازین اوراق  
 یابند۔ از آثار تراوشی رگ کلکب این نامہ سیاه نقشنا سند و چارہ  
 گرد آورد را در ستایش و تکمیل آں اشعار ممتون و مانورز نگارند۔  
 یارب اینا بوسے هستی ناشنیدہ از نیستی بہ پہلے نارسیدہ یعنی قتل  
 بہ خمیر آمدہ نقاشی کہ بہ اسد اللہ خاں موسوم و بہ میرزا نوشہ  
 معروف و بہ غالب مخلص است۔ چنانکہ اکبر آبادی مولد و دہلی  
 مسکن است، فرجام کار نجفی مدفن نیز باد۔

نصیری مگر سے مطبع نظر ہم نے راجا صاحب محمود آباد کے بے نظیر کتب  
 خانے میں دیوان غالب کے کئی ایڈیشن دیکھے ہیں۔ ان میں پہلا ایڈیشن مطبع دہلی اور  
 مطبع فولکسور لکھنؤ کے کئی ابتدائی نسخے چھپ چکے ہیں۔ غالب نے ۱۸۳۳ء میں اپنا  
 دیوان مع دیباچہ مرتب کیا۔ اس کے پانچ سال کے بعد ۱۸۵۲ء بھری (۲۹-۱۸۴۸ء)  
 میں اس پر نواب نیاہ الدین احمد خاں نے تقریباً لکھی۔ پھر تین سال کے بعد ۱۸۵۷ء  
 مطابق اکتوبر ۱۸۴۶ء میں پہلی مرتبہ سید محمد خان بہادر کے مطبع دہلی میں علیہ مطبع سے  
 آراستہ ہوا۔ دوسرا ایڈیشن مئی ۱۸۴۷ء میں مطبع دارالسلام دہلی واقع محلہ حوض کاظمی سے  
 چھپا۔ تیسرا ایڈیشن مطبع احمدی باہتمام امیر جان ۱۸۴۷ء بھری مطابق  
 جولائی ۱۸۶۱ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس نسخے سے اکثر و بیشتر ماہرین غالبیات للہ خاں  
 کا شمار ہو گئے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہی نہیں۔  
 پروفیسر گیان چند صاحب اپنے مضمون ”نصیری مگر“ (مطبوعہ کلاں کے لیے کچھ معروضات) ”  
 مظلوم“ ”نقوش“ غالب نمبر، مئی ۱۸۷۷ء، بابت فروری ۱۹۶۹ء میں لکھتے ہیں:

۱۔ غالب نے مطبع احمدی ایڈیشن ۱۸۶۱ء مطبع سوم کی ایک کاپی کی اپنے ہاتھ سے تصحیح  
 کی۔ یہ جیس بھ کاپی کس خانہ آصفیہ حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ اسے مسٹر حلیم

مخطوطہ دیوان غالب (لکھنؤ سری نگر) اور مطبوعہ نئے حیات غالب

کرتا چاہیے۔

۲۔ ۱۸۶۲ء کا چوتھا ایڈیشن مطبوعہ "دی کان پور" جو متعدد جہاں بالا کاپی غزوہ حیدرآباد سے چھاپا گیا۔

۳۔ کان پور ایڈیشن غالب کا صحیح کردہ آخری متن ہے۔ مالک رام صاحب نے اپنے مرتبہ دیوان کی بنا ہی پر رکھی ہے۔ کان پور ایڈیشن میں قیاحت یہ ہے کہ اس میں غلط طبعیت ہیں۔ جن کی درستی کتب خانہ آصفیہ کی کاپی سے کی جاسکتی ہے۔

پروفیسر صاحب "نقوش" (۱۹۳) میں مزید دہرای کرتے ہیں کہ:  
 احمدی ایڈیشن ۱۸۶۱ء کی غالب کے ہاتھ کی صحیح کردہ کاپی ہے جو  
 کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں محفوظ ہے اور جس سے نکالی  
 ایڈیشن تیار کیا گیا۔ مالک رام صاحب نے دیوان کی ترتیب میں  
 اس سے کہیں کہیں استفادہ کیا ہے۔

میں پہلے دثوق اور ذنن دہری کی بنا پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ پروفیسر جین  
 صاحب نے مطبوعہ احمدی کا ایڈیشن دیکھا ہی نہیں۔ انھوں نے اس بارے میں جو  
 انکشاف کیا ہے، درست نہیں۔ اس نسخے کی اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ نادر و کم یاب  
 ایڈیشن کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں مخطوطہ نمبر ۹۸۸ کے تحت محفوظ ہے۔ یہ ہرگز مخطوطہ  
 نہیں، بلکہ مطبوعہ نسخہ ہے۔ اعداد و شمار کے رجسٹر اور فہرست مطبوعہ میں بھی اسے مخطوطات  
 کے تحت درج کیا گیا ہے اور کیفیت خانے میں "صحیح شرف غالب" لکھا گیا ہے۔ اصل  
 میں یہ دیوان غالب کا تیسرا (مطبوعہ) ایڈیشن ہے۔ جو غالب کی حیات میں ۱۲۰۰ عرم  
 ۱۲۷۸ ہجری (مطابق آخر جولائی ۱۸۶۱ء) کو مطبوعہ احمدی دہلی میں اموجان کے اہتمام  
 سے شائع ہوا تھا۔ سرورق کی چوٹی پر ہاریک فلم سے ذیل کی عبارت سیاہ روشنائی سے  
 درج ہے:

از ملک بچ میرز خاکسار دوزا بے مقدمہ سید حسن عرف بدھمن

مطلوبہ دیوان غالب (نندری محم) اور مطلوبہ نئے عبارت غالب

سوزخوان ابن سید علی رضا ابن سید مولوی احسان محمد صاحب  
المتخلص بہ: مقام مرحوم و مغفور بگلرامی۔

اس کے بعد اور بھی کچھ الفاظ تھے جو قلم زد کیے گئے ہیں۔ سرورق صفحہ اول پر ہے۔ اس پر تین طرف سے خوب صورت نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔ اس کے سچ میں علی حروف میں ”دیوان غالب“ لکھا گیا اور اس کے بعد مطبع کا نام اس طرح ہے۔ ”مد مطبع احمدی باہرام اسوہان مطبوعہ۔“ دیوان کی تفصیلات یہ ہیں:

ساز ۱۱x۱۱ انچ۔ متن ۹x۵ انچ، سطر ۲۵، کل صفحات ۸۸۔

صفحہ ۲-۱۰۰۲ سنی میٹر میں لوح کے بعد ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ پھر دیباچہ غالب شروع ہوتا ہے جو ۱۵ سطروں میں صفحہ ۳ کی پہلی تین سطروں میں ختم ہو جاتا ہے۔ اسی سطر میں پہلی غزل ”نقش، فریادی۔“ شروع ہوتی ہے۔ صفحہ ۷۰ میں دیوان غزلیات ذیل کی غزل پر ختم ہوتا ہے:

نویں ان ہے بیداد دوست جاں کے لیے ری نہ طرز ستم کوئی آساں کے لیے  
بہر اسی سنے میں بغیر عنوان کے قصائد ہیں، انہی میں ایک مثنوی بھی ہے۔

تفصیلات یہ ہیں:

ص ۷۰ (۱) ساز یک وزہ نہیں فیضی جہن سے بے کار ۱۸ شعر

ص ۷۱ (۲) دہر جز جلوۂ یککائی معشوق نہیں ۲۳ شعر

ص ۷۲ (۳) ہاں، مہ نوسین ہم اس کا نام ۵۸ شعر

ص ۷۵ (۴) صبح دم دوازاۃ خاور نکلا ۲۳ شعر

ص ۷۸ (۵) مطلع: ہاں، دل دودند دحرہ ساز

کھوں نہ کھولے درختہ راز ۳۳ شعر

مطلع: شاد و دل شاد و شادماں رکھو

اور غالب پہ صبریاں رکھو

نندری محم میں نمبر ۵ کا عنوان ”مثنوی“ ہے جب کہ دیوان غالب کے چوتھے



مطبوعہ دیوان غالب (نئی سری گھر) اور مطبوعہ نئے صحافت غالب

ایڈیشن مطبوعہ نقاشی کان پور ۱۸۶۴ء میں اس کا عنوان ”دو صفتِ ربّ“ دیا گیا۔ پانچویں ایڈیشن نئی آگرہ مطبوعہ ۱۸۶۳ء میں بھی ”مثنوی“ ہی لکھا ہے۔ صفحہ ۷۸ میں مثنوی کے اختتام پر قطعات شروع ہوتے ہیں۔ کسی قلمیے کے اوپر کوئی عنوان نہیں موجود ہے۔ یہ سلسلہ ص ۸۳ تک ہے۔ چھوٹے بڑے قطعات کی تعداد ۱۶ ہے۔ صفحہ ۸۱ میں ذیل کا قطعہ ۱۱ شعر کا ہے:

اے شاہ جہاں کبر جہاں بخش جہاں دار ہے نسیب سے ہر دم مجھے صد گونہ بشارت  
دیوان کے سبھی مطبوعہ نسخوں میں (جو غالب کی زندگی میں چھپے ہیں) اس قلمیے کا کوئی عنوان نہیں ہے۔ غالب کے شاگرد مثنوی شیونرائن آرام نے باعایت مثنوی محمد حکیم الدین دہلوی سید غلام حسنین قدّر بکراہی ”مجموعہ سخن“ حصہ دوم مطبع نوکلشور ۱۸۷۳ء میں اس قلمیے کا عنوان ”مدح شاہ جہانیت نوروز“ لکھا ہے۔ یہ پہلی مرتبہ نئی مطبع احمدی میں چھپا تھا۔ صفحہ ۸۴ سے رباعیات شروع ہوتی ہیں۔ ان کی تعداد ۱۶ ہے۔ آخری رباعی کے دو مصرع صفحہ ۸۶ میں ختم ہوتے ہیں۔ پہلی اور آخری رباعی ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

(۱) بند از اتمام بزم عبود الخصال کام جوانی رہے ساغر کش حال

آپہنچے ہیں تا سواد اللہیم عدم اے عمر گزشتہ یک قدم استقبال

(۲) ان سب کے بچوں کو کوئی کیا جانے بھیجے ہیں جو ارمغانِ حق دلائے

کن کر دیویں کے ہم دعا کیں سو بار فیروزہ کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

رباعیوں کے بعد صفحہ ۸۶ میں ”خاتمہ“ کے تحت نواب محمد ضیاء الدین خان

بہادر کی تقریب ہے۔ صفحہ ۸۸ کی تیسری سطر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی تقریب ہے جو

پہلے ایڈیشن میں شامل کی گئی تھی، یہاں صرف تاریخ ۱۲۷۱ ہجری دلائے نسخے کی تاریخ

ذاتی گئی۔ یہ نسخہ رام پور میں تھا۔ سطر ۶ میں اشعار کی تعداد ۱۶۹۵ ہے۔ یہ بات

ظاہری ذکر ہے کہ نسخہ رام پور میں عرشی صاحب کے مطابق اسے ہی اشعار تھے۔

مطلوبہ دیوان غالب (نثری نمبر) اور مطلوبہ نئے عبارت غالب

نثر احمدی کا یہ جملہ ہے:

۱ ۶ ۹ ۵

”ہنگی اشعار غزل و قصیدہ و قطعہ و رہائی یک ہزار و شش صد و نو و بیچ آمد۔“  
 بعد میں لفظ ”بیچ“ قلم زد کیا گیا، لیکن ۱۶۹۵ اعداد جیسا کہ ہم نے لکھا ہے  
 ان کو جوں کا توں رکھا ہے۔ ہم نے اس نسخے کا ایک ایک شعر مگر لیا۔ اصل تعداد  
 ۱۷۹۶ ہے۔ صفحہ ۸۸ میں بارہویں سطر سے نواب محمد ضیاء الدین بہادر، شخص نیر بخش  
 اور مرزا یوسف علی خاں شخص عزیز کے دو تاریخی قطعات بعنوان ”قطعہ تاریخ اطہار  
 دیوان“ اور قطعہ تاریخ اطہار دیوان طبع زاو“ بالترتیب نثری طرح ہوی ہے ترتیبی سے  
 اور بلا فصل اس انداز سے شامل کیے گئے ہیں کہ طبیعت مکذّر ہو جاتی ہے۔ یہ دونوں  
 قطعات بعد کے ایڈیشنوں سے حذف کیے گئے ہیں۔ اس لیے ہم ذیل میں ترتیب سے  
 درج کرتے ہیں:

”قطعہ تاریخ اطہار دیوان — از نیر بخش“

ہوا ہے حضرت غالب کا مطلع دیوان صلاے فیض بہ گویدگان رنختہ ہے  
 یہی کتاب ہے جس میں کہ اوستادان بیان رنختہ ہے اور زبان رنختہ ہے  
 ”بنائے رنختہ“ استاد ہی نے ڈالی ہے اسی سے قائم اسباب جہان رنختہ ہے  
 زمین شمر میں اتر ہے لکھڑا ایات سو یہ رسالہ نامی نشان رنختہ ہے  
 ”بنائے رنختہ“ ایک اور دوسری تاریخ

بدین نیر بخش ”بیان رنختہ“ ہے  
 ۱۲۷۸ ہجری

”قطعہ تاریخ اطہار — مرزا یوسف علی خاں عزیز“

مرزا ریاض فضل محمد حسین خاں ہیں روایت بہار گلستان رنختہ  
 کہتے ہیں شعر خوب، سمجھتے ہیں شعر خوب تحسین شخص اور زبان دان رنختہ  
 چھاپا انھوں نے حضرت غالب کا کلیات وہ کلیات جس سے بڑھی شان رنختہ

مطلوبہ دیوان غالب (لکھنؤ سری گز) اور مطلوبہ خط عبارت غالب

غالب کا میرزا اسد اللہ خاں ہے نام ہے واقعی وہ شیر نیتان ریختہ  
 لکھی عزتِ خستہ نے تاریخِ انطباع  
 حاسد کے سر کو کاٹ کے ”دیوان ریختہ“

(۱۲۸۹ھ = ۱۸۸۹ء - ۱۲۷۸ھ بمطابق)

اسی صفحہ ۸۸ میں عزت کے علاوہ تاریخ ”دیوان ریختہ“ کے ساتھ ہی اہل مطلع  
 نے ہائیکسویں سطر میں جلی قلم سے ”عبارتِ خاتمہ دیوان“ کے تحت غالب کے خط کو  
 شامل کیا۔ غالب پرپس والوں کے نامعلوم طریقہ عمل سے اتنا برہم ہو گئے کہ انھوں نے  
 عبارتِ خط کی تمام سطر، جو حوض اور حاشیے کے ارد گرد تھیں، کاٹ دیں جیسا کہ کس  
 سے ظاہر رہتا ہے۔ آخر میں غالب نے اپنی مہر ثبت کر دی۔ مہر میں یہ عبارت ہے۔ نجم  
 الدولہ دیر الملک اسد اللہ خاں نظام جنگ بہادر۔ ۱۲۶۸ھ  
 قلم زدہ خط کی عبارت یہ ہے: ۳۵۲

”داد کا طالب غالب گزارش کرتا ہے کہ یہ دیوان اردو تیسری بار  
 چھاپا گیا ہے۔ تخلص و داد آئین میر قمر الدین کی کار فرمائی اور  
 خاں صاحب الطاف نشان محمد حسین خاں کی دانائی مقتضی اس کی  
 ہوئی کہ دس جزو کا رسالہ ساڑھے پانچ جزو میں منقطع ہوا۔ اگرچہ  
 یہ انطباع میری خواہ سے نہیں، لیکن ہر کاپی میری نظر سے گزرتی  
 رہی ہے اور الغلط کی تصحیح ہوتی رہی ہے۔ یقین ہے کہ کسی جگہ  
 حرف غلط نہ رہا ہو، مگر ہاں، ایک لفظ میری منطق کے خلاف نہ  
 ایک جگہ، بلکہ سو جگہ چھاپا گیا ہے۔ کہاں تک بد؟ ناچار جا بجا  
 یوں ہی چھوڑ دیا، یعنی ”کسو“ بکاف کمسور و سبنا مضموم و  
 داد معروف۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ لفظ گج نہیں، البتہ فصیح نہیں۔  
 قافیے کی رعایت سے اگر لکھا جائے تو صیب نہیں، ورنہ فصیح بلکہ  
 اصح ”کسی“ ہے۔ داد کی جگہ یاے تختانی۔ میرے دیوان میں

مکتبہ دیوان غالب (نقصہ سری گل) اور مطبوعہ نسخے عبارت غالب

ایک جگہ کافی "کسو" یہ واو ہے اور سب جگہ "کسی" یہ یاے حتمائی ہے۔ اس کا اکتھار ضرور تھا۔ کوئی یہ نہ کہے کہ یہ کیا آشتت حیاتی ہے؟ اَللّٰہُ بس باہوی ہوں۔

اس عبارت کے بعد اسی صفحے (۸۸) کے حاشیے کی دائیں طرف یہ لکھا ہے: مطبع احمدی میں واقع دہلاے اموجان کے اجتام سے خصوصاً محرم الحرام ۱۲۷۸ ہجری کو مطبوع ہوا۔

اس کے بعد یاروہم ۱۸۳۵ء ایکٹ کے تحت سید قمر الدین کی جانب سے بغیر اجازت دیوان ہذا چھاپنے کی ممانعت اشتہار کے تحت درج ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ غالب نے اپنی تحریر قلم زد کرنے کے بعد ص ۸۸ کے دہائی طرف کا حاشیہ ڈیڑھ انچ کا خط چپکا کر اوپر سے نیچے تک بڑھا دیا اور پھر اس پر ذیل کا خط اپنے جلی قلم سے لکھا ہے:

جناب محمد حسین خاں کو میرا سلام پہنچے۔ دو رات دن کی محنت میں میں نے اس نسخے کو صحیح کیا۔ غلط نامہ بھی اس میں درج کر دیا ہے۔ گویا اب غلط نامہ بے کار محض ہو گیا ہے۔ خاتمے کی عبارت کیا۔ میرا بیان کیا۔ میر قمر الدین کا اکتھار اب کچھ ضرور نہیں۔ کس واسطے کہ اب یہ کتاب اور مطبع میں چھاپی جائے گی۔ یہ جملہ گویا مسودہ ہے۔ اسی کو بھیج دیجیے۔ غالب ۱۲۔

دیوان غالب کے اس نسخے میں کوئی غلط نامہ نہیں ہے۔ ہم نے اس کا بغاؤ نظر مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس میں غالب نے اصلاح نہیں کی۔ معلوم نہیں کہ مرثی صاحب کے پاس وہ کون سا نسخہ تھا جس میں غلط نامے کے کاتب کا نام محمد قصود چھپا ہے۔ کاش مرثی صاحب اس کے بارے میں مزید تفصیلات بیان فرماتے۔ میرے خیال میں غالب نے جس نسخے میں غلط نامہ مرتب کیا تھا وہ غلط کے برابر ہے اور اس کا کہیں نام و نشان نہیں مل رہا ہے۔ راقم کو مرثی مرحوم

والشراء يتبعهم الثمن ۝

CHANDLER 1943



وطني محمد علي باقمام اموجان طبع

فہم ہیں کہ خسر کی ہم چروئی کریں ایں ساکنان کو بچہ دلدار و بچہنا	جا اگر ایک نندہ گہن ہنہ ملے نکر ہمیں جو غالب آشتہ سرلی
--	---

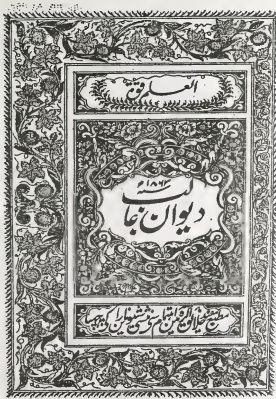
کوئی دن گزرتا کانی اور ہے آتش و خون میں یہ گرے کہاں بار اچھکے ہیں اونکی رنجشیں ریکی خط نہ دیکھتا ہی تاہم ہر قانع احمد ہیں اکشر نجوم ہر حکیم غالب ملائیں ب تمام	اپنی ہمیں اپنی بھائی اور ہے سوز مہنای بھائی اور ہے پر کہہ اب کی سرگانی اور ہے کہہ تو پیغام زبانی اور ہے وہ بلا ہی آسا نے اور ہے ایک روگیا ناگانی اور ہے
---	--

کوئی امید پر ہمیں آئے سوت کا ایک بن سہیں ہے اگل آئی تھی حال دل ہر جانتا ہوں ثواب عاصمت و زہ ہی کہہ ایسی ہی بات جو چہ ہوں کہوں تجھ کو کہ یاد کرتے ہیں دراخ دل کو نظر نہیں آتا ہم وہ ان ہیں جان فیجہ جگہ ہی موتی ہیں اور وہ ہیں مرنے کے کہیں نہیں جی جاو کی غالب	کوئی صورت نظر نہیں آئے نہیں کہوں رات پر نہیں آئے اب کس بات پر نہیں آئے ہر طبیعت اور ہر نہیں آئے ور نہ کیا بات کہ نہیں آئے ہری آواز کہ نہیں آئے جو بھی اسی چارہ کہ نہیں آئے کہہ چارہ ہی خبر نہیں آئے سوت آئی ہی پر نہیں آئے شرم نگر کہ نہیں آئے
---	---

دل نادان بھی ہر اکبا ہے ہم جن مشتاق اور وہ بیزار ان ہی خند میں زبان دیکھنا ہوں بلکہ نہیں ہیں کہ نے سوچو	آخر اس درد کی دو اکبا ہے یا وہی بہ ماجرا اکبا ہے کاش جو چہ کہہ جا کیا ہے پر یہ بکار دسی خد اکبا ہے
--	---

دعای غالب نعلی احوال کا ایک صفحہ







کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ:

بکمان غالب میرزا صاحب نے القاط کی درستی جس نسخے پر کی تھی  
از دلوں کو رقتہ اس پر نہیں لکھا بلکہ کسی اور بغیر صحیح شدہ نسخے پر  
لکھ دیا۔

وہ بغیر صحیح شدہ نسخہ وہی ہے۔ جو کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ مجھے  
جناب مرثی مرحوم سے اس بات پر اختلاف ہے کہ جب غالب کو "اس پر شبہ ہوا تو وہ  
رقتہ صحیح شدہ پر لکھ کر بھیجا۔" (نوسری مرثی، ص ۱۴۰)

مطلع احمدی نوسر آصفیہ کے صلوٰۃ میں چھٹا اور ساتواں شعر یوں ہیں:

(۶) بخشے ہے جلوۂ گل ذوق تماشا غالب

چشم کو چاہے ہر رنگ میں دا ہو جانا

(۷) تاکہ تجھ پر کھلے اعجاز ہوائے بھقل

دیکھ برسات میں سبز آئینے کا ہو جانا

حاشیہ میں شعر نمبر ۶ کے دہائی طرف "ح" (حاشیہ) اور شعر نمبر ۷ کے ساتھ  
"سم" (متن) لال روشنائی سے لکھا گیا ہے یہ غالباً غالب نے لکھا ہے۔ صلوٰۃ میں  
قصیدہ "ساز یک ذوق نہیں فیض بہن سے بے کار" کے مطلع ثانی جو اس مصرع سے  
شروع ہوتا ہے "فیض سے تیرے ہی اے شمع شبتان بہار" کے سبکی اشعار کے آخری  
الفاظ چھپنے سے رہ گئے تھے۔ یہ القاط غالباً مرزا صاحب نے لال روشنائی سے اپنے  
ہاتھ سے لکھے ہیں:

گلزار، گوہر دار، اسرار، خم خار، آئینہ دار، دیوار، سرشار

اسی طرح قصیدہ "دہر جو جلوۂ یکسانی معشوق نہیں" کے دوسرے اور تیسرے  
شعر کے مصرعوں کے القاط (کافیے) "خود ہیں" اور "تہ دیں" غالب ہی کے ہاتھ کے  
لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

جناب مالک رام صاحب نے دیوان غالب کا جو صدی ایلمین جٹن غالب

مخلوط دیوان غالب (نصیری مکر) اور مخلوط نئے حیات غالب

کی صد سالہ تقریبات پر ۱۹۶۹ء میں صد سالہ یادگار کمیٹی کی طرف سے شائع کرایا اس کے متن کی بنیاد موصوف نے مطبع نکھائی کان پور ۱۸۶۲ء پر رکھی ہے۔ فرماتے ہیں:

جب غالب نے مطبع احمدی کا متن دیکھ کر اسے درست کر کے، دیوان مطبع نکھائی میں بچھوایا، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ انھوں نے متن ہمیشہ کے لیے خود طے کر دیا۔ اب اس سے پہلے کے ایڈیشنوں کو ہم نہ صرف متن میں استہمال نہیں کر سکتے بلکہ وہ شاید اختلاف نسخ کے تحت بھی نہیں آئیں گے۔<sup>۳۵</sup>

مالک رام صاحب کی تردید میں جناب رشید حسن خاں نے ایک مضمون لکھا جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ مطبع نکھائی کان پور کا نسخہ دیوان غالب مستند نہیں ہے۔ جناب عرشی صاحب کی بھی یکساں رائے ہے۔ مجھے یہ نسخہ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا، اس لیے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔<sup>۵۵</sup>

نسخہ مطبع احمدی (آمنیہ) کی خاص بات یہ ہے کہ غالب نے جس جلی قلم سے صفحہ ۸۸ میں مالک مطبع محمد حسین خاں کو خط لکھا اسی قلم سے پورے دیوان کے سچ میں نئے صفحوں کے اعداد ڈالے ہیں۔ صفحہ ۸۳ میں ذیل کی مبالغہ آمیزی ہے:

آتش باری ہے جیسے شعلہ اطفال ہے سورجگر کا بھی اُسی طور کا حال  
تو مویہ عشق بھی قیامت کوئی لڑکوں کے لیے گیا ہے کیا کھیل نکال  
رباعی کے بعد حاشے میں ۱۰۲ کا نمبر ڈالا گیا۔ اس طرح دیوان تک ۱۰۴ صفحوں کے نمبر ڈالے گئے ہیں اور یہ سب نمبر غالب ہی نے لکھے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ نسخہ کان پور میں بھی اتنے ہی صفحات ہیں۔ یہ بات قرین قیاس ہے کہ غالب نسخہ آمنیہ ہی کو درست کرنا چاہتے تھے۔ لیکن سوا دوسرے نسخے کی تصحیح کی اور محمد حسین خاں کے نام غلطی سے خط نسخہ آمنیہ کے آخر میں چپکا دیا۔ اس نسخے میں غالب نے جن صفحات کے نمبر اپنے قلم سے لکھے ہیں وہ یہ ہیں:

۵، ۷، ۹، ۱۰، ۱۲، ۱۳، ۱۷، ۱۸، ۲۲، ۲۳، ۲۷، ۳۲، ۵۸، ۶۰، ۶۲، ۶۳، ۶۵،

ظہود و دیوان غالب (نسروری نگر) اور مطبوعہ نئے عیادت غالب

۸۶، ۸۵، ۸۴، ۸۳، ۸۲، ۸۱، ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱۔

اوپر یہ بیان ہو چکا ہے کہ مطبع احمدی کے نئے سے غالب بہت کبیدہ خاطر رہے تھے۔ اس کی اشاعت کے کوئی ایک ہفتے کے بعد انھوں نے میر مہدی بخروں کے نام پر ۱۸۶۱ء مطابق ۳۰ محرم ۱۲۷۸ء کو ذیل کا خط لکھا:

دیوان اردو چھپ چکا۔ ہاے! لکھنؤ کے چھاپے خانے نے جس کا دیوان چھاپا، اس کو آسمان پر چڑھا دیا۔ حسن خط سے الفاظ کو چمکادیا۔ دلی پر اور اس کے پانی پر اور اس کے چھاپے خانے پر لعنت! صاحب دیوان کو اس طرح یاد کرتا، جیسے کتے کو آواز دے۔ ہر کاپی دیکھتا رہا ہوں۔ کاپی نگار اور قلم۔ محتسب، جو کاپی میرے پاس لایا کرتا تھا، وہ اور تھا۔ اب جو دیوان چھپ چکے تھے تصدیق ایک بھگ کو ملا۔ غور کرتا ہوں کہ وہ الفاظ غلط جوں کے توں ہیں، یعنی کاپی نگار نے نہ بتائے۔ ناچار غلط نامہ لکھا۔ وہ چھپا۔ بہر حال خوش و ناخوش کئی جلدیں مول لوں گا۔ اگر خدا چاہے تو اسی ہفتے میں تین جلد اصحاب غلط کے پاس پہنچ جائیں۔ نہ میں خوش ہوا ہوں نہ تم خوش ہو گے۔ مطبع احمدی کے مالک محمد حسین خان، مہتمم مرزا اسو جان، مطبع شاہدرے میں... غلط ڈاک میں بھجوا دو، کتاب ڈاک میں پہنچ جائے گی۔

غالب نے اس دیوان کا ایک نسخہ اشاعت کے ایک ماہ بعد آخر اگست ۱۸۶۱ء (آخر صفر ۱۲۷۸ء) کو نواب میر تراب علی خاں علی الملک بہادر سالار جنگ اڈل (موتی) (۱۳۰۰ء) کو حیدرآباد بھیجا تھا۔ یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ نسخہ آصفیہ بھی ہو۔

نسخہ آصفیہ کے بارے میں ماہرین غالبیات کو غلط فہمیاں اس لیے پیدا ہو گئی تھیں کہ انھوں نے اسے دیکھے بغیر ہی یہ رائے قائم کی تھی کہ اس کی تصحیح غالب نے کی

خلو و دھن غالب (لمبہ سری گل) اور مطلوبہ نئے حیات غالب

اور یہ مستحکم لہو ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ غالب اس کی طباعت، املا اور افلاط کی کثرت سے بہت رنجیدہ ہو گئے تھے۔ ذیل میں چند غزلیں نمونے کے طور پر درج کی جاتی ہیں:

دردِ منت کشی روا نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا برا نہوا  
 جمع کرتی ہو کیوں رقیبوں کو اک تماشا ہوا گلا نہوا  
 ہم کہاں قسمت آزمائے جائیں تو ہی جب صخرِ آزما نہوا  
 کتنی شیریں ہیں تیری لب کہ رقیب گالیاں کہا کے نہوا  
 ہی خیر گرم ان کی آنکھ آج ہی گھر نہیں پورے نہوا  
 کہا وہ غرور کی عداوتی ہے بندے میں میرا بھلا نہوا  
 جان دی، دی ہوئی آنکھ تھی حق تو ہیں ہی کہ حق ادا نہوا  
 دھم کر دپ گیا ہو نہ سمجھا کام کر رگ گیا روا نہوا  
 رہبرنی ہی کہ دل ستانی ہے لیکے دل دلتاں روا نہوا  
 کچھ تو پڑھتی کہ لوگ کہتی ہیں

آج غالب غزل سرا نہوا (صفحہ ۱۱)

(۲)

آہ کو سپاہی ایک عمر اثر ہوتی تک  
 کون جیتا ہی تری دلف کے سر ہوتی تک  
 دامن ہر موج میں ہے ملتے صد کام تنگ  
 دیکھیں کیا گزری ہی قطرہ پہ گھر ہوتی تک  
 عاشقی مبر طلب اور تما چناب  
 دل کا کیا رنگ کروں خون بکر ہوتی تک  
 مہنی مانا کہ تھافل نہ کرو گے لیکن  
 خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خیر ہوتی تک

خلوط دیوان غالب (نہری عمر) اور مکتوب نئے عہدات غالب

ہر تو خود ہی ہی شبنم کو فنا کی تعلیم  
میں بھی ہوں ایک عہدات کے نظر، دتی تک  
نکھر پیش نہیں فرصت سے ناقل  
گرمی بزم ہی اک رقص شرر ہوتی تک  
غم سے کا اندکس سے ہو ہر مرگ طلاج  
شع ہر رنگ میں جلتی ہی سحر ہوتی تک (صفحہ ۳۵)  
(۳)

نہری گرمی مریسی تپتے نیسے  
خار خار الم حسرت و عیار تو ہے  
ی ہرستان غم ہی ہند سے لگائی ہی ہے  
نفس قیس کہ ہی چشم و چراغ صبرا  
ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گمر کی روئی  
نہ ستائش نہ صلے کی پروا  
عشرت صحبت خواہاں ہی نصیحت کھو  
نہری غالب اگر مر طیبی نسبی (صفحہ ۵۲)

دیوان غالب نسخہ آگرہ۔ اس سے مراد غالب کا وہ دیوان ہے جو آگرہ  
میں غالب کے نہایت معتبر شاگرد غنی شیو نرائن تخلص آرام (۱۸۳۳ء، ۱۸۹۸ء) کے  
نہرہ اہتمام انجی کے مطبع مطبوعات غنی میں ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا۔ ”اردوئے معلّے“ میں  
ان کے نام غالب کے ۳۰ خلوط درج ہیں۔ ان میں بعض خلوط غیر معمولی اہمیت کے  
حامل ہیں۔ غنی صاحب کی فرمائش سے ہی مرزا نے لارڈ ایلن ہرون کی تعریف میں  
۱۸۵۸ء میں ۲۱ شعر کا قصیدہ تصنیف کیا۔ دو شعر قابل ذکر ہیں:

آسیدوار عہدات شیو نارائی  
یہ چاہتا ہے کہ دنیا میں عز و جاہ کے ساتھ  
تھیں اور اس کو سلامت رکھے سدا اللہ

حلولہ، جان غالب (سنو مری گز) اور معلوم نے حمایت غالب

فشی صاحب چندہ روزہ گلدستہ ”معیار اشعرا“ شائع کرتے تھے۔ ایک شمارے میں انھوں نے لکھا تھا کہ کوئی امیر اپنی غزلیں بھیجتے ہیں۔ جب تک ان کا نام و نشان معلوم نہ ہوگا ہم ان کے اشعار نہ چھاپیں گے۔ غالب نے فشی صاحب کا یہ بیان ”معیار اشعرا“ میں دیکھا تو انھوں نے یکشنبہ ۱۲ جون ۱۸۵۹ء کو ان کے نام ایک خط میں لکھا:

امیر میرے دوست ہیں اور امیر احمد ان کا نام ہے اور امیر تھکس کرتے ہیں۔ لکھنؤ کے ذی عزت باشندوں میں ہیں اور وہاں کے بادشاہوں کے خوشامیاس اور مصاحب رہے ہیں اور اب وہ رام پور میں نواب صاحب کے پاس ہیں۔ میں ان کی غزلیں تمھارے پاس بھیجتا ہوں۔ میرا نام لکھ کر ان غزلوں کو چھاپ دو، یعنی ”غزلیں غالب“ نے ہمارے پاس بھیجیں اور اس کے کھینے سے ان کا نام اور حال معلوم ہوا۔ نام اور حال جو میں اوپر لکھ آیا ہوں اس کو آپ ”معیار اشعرا“ میں چھاپ کر ایک دو ورقہ یا چھار ورقہ رام پور ان کے پاس بھیج دو۔

ایک مرتبہ شیونائن نے غالب کے نام کے ساتھ نواب اور میرزا لکھا تھا۔

انھوں نے جواب میں لکھا:

سنو میری جان! نوابی کا مجھ کو خطاب ہے ”نجم الدولہ“ اور اطراف و جوارب کے امرا سب مجھ کو ”نواب“ کہتے ہیں، بلکہ بعض انگریز بھی۔ چنانچہ صاحب کشتربہادر دہلی نے جو ان دنوں میں ایک روپکاری بھیجی ہے تو لکھنے پر ”نواب اسد اللہ خان“ لکھا۔ لیکن یہ یاد رہے، ”نواب“ کے لفظ کے ساتھ ”میرزا“ یا ”میر“ نہیں لکھتے، یہ خلاف دستور ہے۔ یا ”نواب اسد اللہ خان“ لکھو یا ”میرزا اسد اللہ خان“ لکھو اور ”بہادر“ کا لفظ

مطلوبہ دیوان غالب (نسخہ سری نگر) اور مطبوعہ نئے عہد غالب

دونوں حال میں واجب اور لازم ہے۔

غشی شیونرائں غالب کے خطوط چھاپنا چاہتے تھے۔ انھوں نے چھاپنے کے لیے اجازت مانگی۔ غالب نے ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء کے خط میں چھاپنے سے منع کیا کہ ”ان رقعات کا چھاپنا میرے خلاف طبع ہے۔“ یہ وہی شیونرائں ہیں جن کے خط کے جواب میں غالب نے لکھا تھا کہ ”اگر یہ مطلع میرا ہو تو مجھ پر لعنت۔“

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے کہ شیونرائں نے آگرہ میں ایک مطلع مفید خاکئی کے نام سے قائم کیا۔ اس میں غالب کی دو کتابیں ”دھند“ (۱۸۵۸ء) اور ”دیوان غالب“ (۱۸۶۳ء) شائع ہوئیں۔ لوگوں کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ دیوان غالب مطبوعہ نظامی کان پور (۱۸۶۲ء) ایک محترم اور مستند نسخہ ہے اور وہ نسخہ آرمینہ کا صحیح شدہ ایڈیشن ہے۔ غالب پہلے سے ہی اس نسخے یعنی نسخہ مطلع احمدی سے بیزار تھے۔ وہ غلط سے بُرے تھا۔ اس کے بعد انھوں نے نسخہ کان پور سے کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ اس کی اشاعت سے بھی غائب خوش نہ تھے۔ اس میں تیر رخس کی تقریباً شامل نہیں کی گئی۔ غالب نے مطلع احمدی کے نسخے (۱۸۶۱ء) سے قبل اپنے دیوان کے قلمی نسخے کی نقل غشی شیونرائں کو بھیجی تھی جو خود سے پہلے ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء) کا مکتوبہ رام پور میں موجود تھا۔ غالب نے اس کی اشاعت میں دلچسپی دکھائی تھی۔ شیونرائں صاحب نے ایک خط میں مرزا صاحب سے خواہش کی تھی کہ وہ دیوان غالب چھاپنا چاہتے ہیں، اس لیے انھیں مکمل دیوان فراہم کیا جائے۔ مرزا نے اس کے جواب میں ۱۹ اپریل ۱۸۵۹ء کے خط میں مطلع کیا:

اردو کے دیوان چھاپے کے ناقص ہیں۔ بہت غزلیں اس میں نہیں ہیں۔ قلمی دیوان جو اتم اور اکمل تھے، وہ لٹ سکے۔ یہاں سب کو کہہ رکھا ہے کہ جہاں پکنا ہوا نظر آئے لے لو۔ تم کو بھی لکھ بھیجا، اور ایک بات اور تمہارے خیال میں رہے کہ میری غزل پندرہ سولہ بیت کی بہت شاذ و نادر ہے۔ بارہ بیت سے زیادہ اور نو شعر سے کم نہیں۔ جس غزل کے تم نے پانچ شعر لکھے ہیں، یہ نو

مطلوبہ دیوان غالب (انٹرنیٹ) اور مطلوبہ نئے حواشی غالب

شعری ہے۔

اس قول کا مطلع یہ ہے:

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ ٹو کیا ہے      قصیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے  
 فشی صاحب نے ایک اور خط میں دیوان جیسے کی فکر مندی ظاہر کی۔ مرزا اس  
 کے جواب میں لکھتے ہیں:

دیوان ریختہ ام و اکمل کہاں تھا۔ ہاں، میں نے خدر سے پہلے  
 (۱۸۵۵ء) نکھوا کر نواب یوسف علی خان بہادر کو رام پور بھیج دیا  
 تھا۔ اب جو میں دہلی سے رام پور جانے لگا تو بھائی ضیاء الدین  
 خاں نے مجھ کو تاکید کردی تھی کہ نواب صاحب کی سرکار سے  
 دیوان اردو لے کر اس کو کسی کاتب سے نکھوا کر مجھ کو بھیج دیتا۔  
 میں نے رام پور میں کاتب سے نکھوا کر بسنیل ڈاک ضیاء الدین  
 خاں کو دہلی بھیج دیا تھا۔ ان کو نکھسا ہے کہ اگر چھاپا شروع نہ ہوا تو  
 نہ چھاپا جائے اور دیوان جلد میرے پاس بھیجا جائے۔ اگر دیوان  
 آگیا تو فوراً تمہارے پاس بھیج دوں گا۔

غالب کے ایک اور خط مؤرخہ ۱۰ جنوری ۱۸۶۳ء سے معلوم ہوا کہ وہ اپنی  
 تصویر اور دیوان غالب نسخہ رام پور فشی شیونائن کو اشاعت کے لیے بھیج چکے تھے۔  
 مؤرخہ ذکر نے دیوان ۱۸۶۳ء میں اپنی نگرانی میں شائع کیا۔ اس کی اشاعت میں فشی  
 صاحب کو غالب کا پورا تعاون حاصل رہا۔ راقم حروف کو ہندوستان میں اس کا کوئی نسخہ  
 دستیاب نہ ہو سکا۔ اس کا ایک کھل اور عمدہ نسخہ نئی دہلی کی لاہری میں موجود ہے۔  
 اس کا کس میرے کرم فرما ڈاکٹر سید تقی عابدی صاحب ایم ڈی نے (جن کا مطلب  
 نئی دہلی میں ہے) مجھے حیات فرمایا۔ دیوان کی ابتدا میں دیباچہ غالب کے اوپر  
 لاہری کی صہ ہے جس میں 579120 A نمبر لکھا ہے۔ میں نے اس کا بنور مطالعہ  
 کیا اور یہ دے قائم کر لی ہے کہ غالب کی زندگی میں دیوان کے چھ ایڈیشن شائع



مخلوط دیوان غالب (نثری نثر) اور مخلوط نثری عبارت غالب

ہوئے ہیں ان سب میں یہ نثر مستند، معتبر اور علمی حروف میں لکھا ہوا خوب صورت ہے۔ کہیں کوئی قریش قریش نہیں یا دیکھ لے نہیں چاتا ہے۔ آغاز میں غالب کا دیباچہ ہے۔ اس کے بعد غزلیں شروع ہوتی ہیں جو صفحہ ۱۳۲ میں اس رباعی پر ختم ہوتی ہیں:

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالب      دل رک رک کر بند ہو گیا ہے غالب  
وہلے کہ شب کو غیر آتی ہی نہیں      سوتا سوکند ہو گیا ہے غالب

رباعی کے بعد اسی صفحے میں نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر بخش کی تقریر شروع ہوتی ہے جو صفحہ ۱۳۶ میں اختتام پذیر ہوتی ہے۔ آخر میں لکھا ہے کہ:

اشعار مغزی شعار غزل و قصیدہ و قطعہ و مثنوی و رباعی یکجا اور

بمقصد و نودواحد۔

یعنی اس میں ۱۷۹۲ اشعار ہیں۔ چوں کہ یہ دیوان نادر ہے اس لیے نیر بخش کی تقریر اور انتخاب غزلیات کا عکس شامل مضمون کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دیوان غالب مطبع احمد دہلی ۱۳۶۱ھ ہجری کا سرورق اور غالب کی دوسری اہم تحریریں شامل کی جاتی ہیں تاکہ محفوظ رہ سکیں۔



## حوالے اور حاشیہ

- ۱☆ دیوان غالب مطبع جاتی، نثری نثری
- ۲☆ دیوان غالب نثری نثری داس گپتا رتھ، بار سوم، ۱۹۹۵ء
- ۳☆ حسرت موہانی (شرح دیوان غالب) اور کالی داس گپتا رتھ (دیوان غالب کامل) "مبارت نائن دیوان" کے بارے میں نامعلوم ہیں۔
- ۴☆ دیوان غالب مرتبہ مالک رام، مخلوط آراء و کتاب گھر، دہلی، ۱۹۶۹ء
- ۵☆ ادبی تحقیق: سہاس اور گجری، ایم کیو ایس ایک پبلیشرز، علی گڑھ، ۱۹۷۸ء

# مرزا غالب کی تاریخ گوئی

مرزا دھامل غزل کے شاعر ہیں۔ دیگر اصنافِ سخن کے ساتھ ساتھ انھوں نے تاریخیں بھی کہیں۔ لیکن یہ تاریخیں تاریخ یا سوتیں وغیرہ کی تاریخوں کے ہم پلہ نہیں ہیں۔ تاریخ گوئی سے انھیں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ البتہ بعض احباب کے کہنے پر مجبوراً تاریخیں لکھتے تھے۔ ان کے لیے یہ فن قدرے مشکل تھا اور وہ اس سے عاجز تھے۔ ان کی تاریخوں کے مادے زیادہ تر قصبے اور کھڑبے میں ہیں۔ ایک خط میں میاں داد خاں سیاح کو لکھتے ہیں:

بھائی تھمادی جان کی اور اپنی ایمان کی قسم کہ میں فنِ تاریخ گوئی  
اور سمجھا سے بیگانہ محض ہوں۔ اردو زبان میں کوئی تاریخ میری نہ  
سنی ہوگی۔ فارسی دیوان میں دو چار تاریخیں ہیں۔ ان کا حال یہ  
ہے کہ مادہ اوروں کا ہے اور اشعار میرے ہیں۔ تم کہے کہ میں  
کہتا ہوں۔ حساب سے میرا جی گھبراتا ہے اور مجھ کو جڑ لگانا نہیں  
آتا ہے۔ جب کوئی مادہ بناؤں گا، حساب درست نہ پائوں گا۔ دو  
ایک دوست ایسے تھے کہ اگر حاجت ہوئی تو مادہ تاریخ وہ مجھے

ڈھونڈ لادیتے ہیں۔ موزوں میں کرتا اور اگر آپ میں نے  
 مازے کی فکر کی ہے تو یہی حساب جمل منظور رکھا ہے۔ تو ایسے  
 ایسے تمہیے اور تحزبے آگئے ہیں کہ وہ تاریخ فنی کے قابل ہوگئی  
 ہے۔ کلکتے میں قاضی القضاۃ سراج الدین علی خاں مرحوم کی قبر پر  
 مسجد بنی ہے۔ ان کے بیٹے مولوی ولایت حسین خاں نے  
 استدعاے تاریخ کی۔ میں نے لکھی پتاں چہ وہ قاری دیوان میں  
 موجود ہے:

معنی محل از پو تاریخ بنا  
 ایما ہوے من ز رہ احرام کرد  
 کفتم ہوے بدید خوشا خاند خدا  
 شد شکستین دے کہ نظر در کلام کرد  
 خاشاک زلفت و پایے ادب در قند و رعت  
 ایہام را بہ تحزب معنی تمام کرد

واسطے خدا کے غور کرو۔ ”خوشا خاند خدا۔“ ماڈہ۔ پھر اس میں  
 خاشاک<sup>۱۵</sup> کے عدد دور کرو۔ نو سو اکیس ۹۲۱ کا تحزب، پھر بھی دو  
 اور زیادہ رہے۔ پایے ادب توڑ۔ بھلا یہ کوئی تاریخ ہے۔ مگر  
 ہاں، حساب کے قاعدے سے باہر۔ کچھ معنی سگالی کے طور پر میرا  
 ایجاد ہے اور وہ لطف رکھتا ہے۔ ایک شخص ۱۲۳۸ھ میں مرا۔ اس  
 کی تاریخ میں نے لکھی:

ز سال واقعہ میرزا مسیح یک  
 مات راست شمار امر ایجاد  
 صحیفہ ہائے سادہ مبین از عشرت  
 حدیقہ ہائے پیشی متخص از اتحاد

اتھ بارہ یعنی بارہ سو۔ پھر کتب سادی چار۔ دہا کے چار، یعنی چالیس۔ بہشت آٹھ۔ چالیس اور آٹھ اڑتالیس۔

۱۲۳۸۔ دوسری تاریخ بارہ سو ستر کی:

از بروج پھر جوے کات

عشرات از کواکب سیار

برج بارہ، سات دہا کے ستر... وہ دوست جو ماؤہ و محوطہ دینے تھے وہ جنت کو سدھارے۔<sup>۲۵</sup>

غالب کا ایک خط کتاب "مناظر معنی و ذہنی" میں شامل ہے۔ اس کے ساتھ حالی اور رعشاں خیر کے ہاتھ کی تحریریں بھی درج ہیں۔ غالب کا خط بھی انہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا مہر کے ساتھ درج ہے۔ ان تحریروں کا ٹکس ہمارے مضمون "میرزا غالب اور تاریخ کوئی" مطبوعہ "نقوش" لاہور "غالب نمبر" (۳) شمارہ ۱۱۶ بابت ۱۹۷۱ء میں دیکھا جاسکتا ہے۔ غالب اپنے خط میں میرزا امینا بیگ کی تاریخ وفات اور دوسری تاریخ ۱۲۷۰ھ کے بارے میں لکھتے ہیں:

یہ سب دنیا، کہ اسد کہلاتا ہے اور ٹھکس اپنا غالب بتاتا ہے، قول الماسود معذور کا پاس کرتا ہے اور حضرات انجمن فیض سے التماس کرتا ہے کہ میں استلکا کے سزاوار نہ تھا اور اب جو پوچھا گیا تو سچ بچ کہتا ہوں کہ میں ثنی تاریخ و معما سے بیگانہ ہوں۔ دہان میں جو چار نہیں مندرج ہیں۔ بیشتر ماؤے اوروں کے، قلعے فقیر کے ہیں۔ کبھی کوئی ماؤہ بھی حامیانہ کہہ دیا ہوگا۔ ہاں حضرت، مہدہ فیاض نے گنجینہ معنی سے بہت مجھ کو دیا۔ میں نے سراسر قصیدہ و غزل و مثنوی و رباعی میں صرف کیا البتہ بزور قوت ابداع بلائے تاریخ میں نیا شیوہ نکالا:

د سال واقعہ میرزا صبیح

کات راست ظاہر آٹھ امجاد

مجھ پر ہے سداوی مستین از عشرات  
صدیقہ ہے بہشتی شخص از افتاد

ایضا

از بدوچ سپر جوے مکت  
عشرات از کواکب ستار

یہ دونوں قلمیہ کلیات فارسی مطبوعہ ”ادبہ اخبار“ لکھنؤ میں چھاپے گئے ہیں اور وہ مجلہ مجموعہ بلاد ہند میں پہنچ گئے ہیں۔ اشرف البلاد حیدرآباد میں اگر دو چار نہ ہوں گے تو ایک نسخہ میرا بھیجا ہوا جناب غشی حبیب اللہ خان ڈکا کے پاس ضرور ہوگا۔ اس میں مشاہدہ کیا جائے۔ اب یہ اشعار حکم احباب جس فن کو نہیں جانتا اس کے خصوص میں عرض کرتا ہوں کہ میں نے مسائل اس سنیے کے سوا کبھی نہیں دیکھے۔ اب جو دیکھے تو بالکل اس سے زیادہ نہیں سمجھا کہ ایک گروہ ”تائے دراز“ کے چار سو عدد اور ”تائے مستقیمہ“ کے پانچ عدد لیتا ہے جس نہ جناب نواب وجیہ الدین بہادر مفتی اپنے دعوے میں منفرد ہیں اور نہ حضرت سید صاحب میر محمد دکنی اپنے دعوے میں تھا ہیں۔ جو ایک جہت اختیار کروں تو دوسرے جہت والوں کو کہ وہ بھی انھماں کثیر اور سب قاضی و صاحب تحریر ہیں۔ کیا جواب دوں اور ان کے دلائل کو کن دلائل سے رد کروں۔ امید کہ حضرات طرفین بموجب مضمون ”کلیف اللہ قضا لا دسما“ اس پر ہتکار و شش سالہ ضعیف انھماں کو حق فرمادیں۔

مرزا فنی تاریخ کوئی کو لہر اور پست درجے کی شاعری سمجھتے تھے۔ میرزا تقی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

فنی تاریخ کو دونوں مرحلہ شاعری جانتا ہوں اور تصحاری طرح سے

یہ بھی میرا عقیدہ نہیں ہے کہ تاریخ وفات کہتے سے اداے حق  
میت ہوتا ہے۔ بہر حال، میں نے ٹیٹی نی پٹل مرحوم کی تاریخ  
رحلت میں یہ قلعہ لکھ بھیجا۔ ٹیٹی قرالدین صاحب نے ٹاپنند کیا۔  
قلعہ یہ ہے:

شیخ نی پٹل کہ با حسن عقل  
داشت لغات سخن و فہم تیز  
سال وفاتش ز پہ یادگار  
با دل زار و حزن و دہلہ رنج  
حواشم از غالب آشفند سر  
گفت مدہ طول و بحر "ترخیز"  
(۱۲۷۷ھ)

ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ کوئی لفظ چارچ اعداد ٹال لیا کرتے ہیں،  
بلکہ قید معنی دار ہونے کی بھی مرتفع ہے۔ جیسا کہ یہ مصرع ہے:

دو سال غریب ہر آنکہ نامہ بیند

انوری کے قصاید کو دیکھو، دو چار جگہ ایسے الفاظ قصیدے کے آغاز  
میں لکھے ہیں جس میں اعداد سال مطلوب نکل آتے ہیں۔ اور معنی  
کچھ نہیں ہوتے۔ لفظ "ترخیز" کیا پاکیزہ معنی دار لفظ ہے اور پھر  
واقع کے مناسب۔ اگر تاریخ ولادت یا تاریخ شادی میں یہ لفظ  
لکھتا تو بے شبہ نا مستحسن تھا۔ قصہ مختصر اگر تاریخ کی فکر موجب  
اداے حق موقوف ہے تو میں حق دوستی ادا کر چکا۔ \*

نواب ملائالدین احمد خاں طائی کا لڑکا فوت ہو گیا۔ انھوں نے مرزا سے  
تاریخ کہنے کی فرمائش کی۔ مرزا اس کے جواب میں کہتے ہیں:

سبحان اللہ! میں نے اس کی صورت بھی نہیں دیکھی یا ولادت کی

تاریخ سنی، یا اب رحلت کی تاریخ لکھنی پڑی۔ پروردگار تم کو جیتا رکھے اور رحم المہدل عطا کرے۔ میاں، اس کو سب جانتے ہیں کہ میں مازہ تاریخ ٹکالے میں عاجز ہوں۔ لوگوں کے ہاتھ دیے ہوئے قلم کر دیتا ہوں اور جو مازہ اپنی طبیعت سے پیدا کرتا ہوں وہ بیشتر لچر ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ اپنے بھائی کی رحلت کا مازہ ”دلیخ دیوانہ“<sup>۱۸۵۴</sup> نکلا۔ پھر اس میں سے ”آجے“ کے عدد گھٹائے۔ تمام دوپہر اسی فکر میں رہا۔ یہ نہ سمجھتا کہ مازہ وضو اور حمام سے پہلے کیا کرنا چاہیے۔ ہمارے ٹکالے ہوئے دو لفظوں کو تاکا کیا کہ کسی طرح سات اس پر بڑھاؤں۔ بارے ایک قطعہ دست ہوا، مگر تمھاری زبان سے یعنی گویا تم نے کہا ہے۔ پانچ شعر میں تین شعر ڈالیں۔ دو موشعہ مدعا، لیکن میں نہیں جانتا کہ قصیدہ اچھا ہے یا برا ہے۔ ہاں، اتفاقاً قافیہ ہے قائل سے کچھ میں آتا ہے اور شاید لوریح حزار پر کھدوانے کے قائل نہ ہوں:

دو گرہ اگر دھواں ہم چھٹی ما کرد  
بچی کہ شود بو بہاری بچل از ما  
ناچار بکریم شب و روز کہ اس بیل  
باشد کہ بد کلاہ آب و گل از ما  
گفتی کہ نگہدار دل از کشمکش غم  
خود کرد بر آورد غم جاں مسل از ما  
بچی شد د از شطہ سوز غم ہجرش  
چوں شمع دوزد دود بر فصل از ما  
غم دیدہ نیسے بچہ تاریخ و قافل  
بوشت کہ در تاریخ پیر سوخت دل از ما

”ا“ کے عدد ۴۱، ”ذ“ کے عدد ۳۳، ”ب“ میں سے ”ذ“ گیا  
گو یا ۴۱ میں سے ۳۳ گئے، باقی رہے سات وہ ”تاریخ پھر“ پر  
بڑھائے۔ ۱۲۷۴ ہجری آئے۔<sup>۵۵۲</sup>

نواب علاء الدین احمد خاں کے یہاں لڑکا پیدا ہوا۔ مرزا سے فرمائش کی گئی  
کہ وہ قطعاً ولادت اور تاریخی نام کہہ دیں۔ مرزا نے اس کے جواب میں جو عذر بیان  
کیا، اس سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ تاریخ کے گورکھ دھندے سے انہیں کس قدر الجھن  
اور طبعی بھد تھا۔ لکھتے ہیں:

مولانا تھکی! کیوں تھا ہوتے ہو؟ ہمیشہ سے اسلاف و اخلاف  
ہوتے چلے آئے ہیں۔ اگر تیرے ظلیہ اژول ہے، تم خائفہ جاتی ہو۔  
اس کو عمر میں تم پر کھڑم رمانی ہے۔ جائیں دونوں۔ غریب اژول  
ہے اور ایک جاتی ہے۔ شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا  
ہے۔ طریق سیدانگلی سکھلاتا ہے۔ جب وہ جوان ہو جاتے ہیں  
آپ شکار کر کھاتے ہیں۔ تم سخور ہو گئے۔ حسن طبع خدا داد رکھتے  
ہو۔ ولادت فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو۔ اسم تاریخی کیوں نہ  
ٹکالو۔ کہ مجھ پر غم زدہ، دل مردہ کو تکلیف دو۔ علاء الدین خان!  
تیری جان کی قسم، میں نے پہلے لڑکے کا اسم تاریخی لکھ کر دیا اور  
لڑکا نہ جیا۔ مجھ کو اس دہم نے گھیرا ہے میری خوشحال طالع کی  
تاثر تھی۔ میرا ممدوح جین نہیں۔ نصیر الدین حیدر اور احمد علی شاہ  
ایک ایک قہیدے میں جل دیے۔ واجد علی شاہ تین قہیدوں کے  
مقتل ہوئے پھر نہ سنبھل سکے۔ جس کی مدح میں دس ہیں  
قہیدے کہے گئے، وہ عدم سے بھی برے جا پہنچا۔ صاحب، دہائی  
خدا کی! میں نہ تاریخ ولادت کہوں گا نہ نام تاریخی  
اصولوں کا۔<sup>۵۵۳</sup>



منشی شیونرائی آرام نے مرزا سے تاریخ کہنے کی فرمائش کی۔ اس کے جواب میں مرزا لکھتے ہیں :

کل آپ کا خط آیا۔ رات بھر میں نے خون ہجر کھایا۔ ۲۱ شعر کا قصیدہ کہہ کر تمہارا حکم بجا لایا۔ میرے دوست، خصوصاً مرزا تقی، جانتے ہیں کہ فنی تاریخ کو نہیں جانتا۔ اس قصیدے میں ایک روش خاص سے اظہار ۱۸۵۸ء کا کر دیا ہے۔ خدا کرے، تمہارے پسند آوے۔ تم خود قدردانِ فن اور تین استاد اس فن کے تمہارے یار ہیں۔ میری محنت کی دوا مل جائے گی۔ ۷۷

۱۲۷۳ھ میں مرزا کے ایک دوست کے بیٹے کا انتقال ہو گیا۔ اس نے مرزا سے تاریخ لکھنے کی فرمائش کی۔ چوں کہ میرزا اس فن کے داؤں بیچ کو مشکل سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے میرزا تقی کو خط لکھا کہ وہ اس لڑکے کی تاریخِ وفات ایک مثنوی میں لکھ دیں۔ چنانچہ روزِ جمعہ ۲۰ اپریل ۱۸۵۸ء کو تقی کے نام لکھتے ہیں :

ایک امر ضروری باعث اس تحریر کا ہے کہ جو میں اس وقت روانہ کرتا ہوں۔ ایک میرا دوست اور تمہارا ہمدرد ہے۔ اس نے اپنے حقیقی بھتیجے کو بیٹا کر لیا تھا۔ اظہارِ انیس برس کی عمر، قوم کا کھتری، خواہصورت، وضعدار نوجوان ۱۲۷۳ھ میں بیمار پڑ کر مر گیا۔ اب اس کا باپ مجھ سے آرزو کرتا ہے کہ میں ایک تاریخ اس کے مرنے کی لکھوں۔ ایسی کہ وہ تاریخ نہ ہو، بلکہ مرثیہ ہو کہ وہ اس کو پڑھ پڑھ کر رویا کرے۔ سو بھائی اس سائل کی خاطر مجھ کو عزیز اور کبرِ شعر متروک۔ مع ہذا یہ واقعہ تمہارے حسبِ حال ہے۔ جو خرچہ اس شعر تم کالو گے وہ مجھ سے کہاں نکلیں گے۔ بطریقِ مثنوی میں میں شعر لکھ دو۔ مصرع کے آخر میں ملاء تاریخ ڈال دو۔ نام اس کا برہمن تھا اور اس کو ”ہاہو، ہاہو“ کہتے تھے۔ چنانچہ

میں بحرِ سندس مخیوں میں ایک شعر تم کو لکھتا ہوں۔ چاہو  
اس کو آغاز میں رہنے دو اور آئندہ اسی بحر میں اشعار لکھ لو۔ چاہو  
کوئی اور طرح نکال لو۔ لیکن یہ خیال رہے کہ سائل کو متوہی کے  
نام کا ادب ہونا منظور ہے اور ”بابو برہمچاری“ سوائے اس بحر کے  
یا بحرِ رمل کے اور بحر میں نہیں آسکتا۔ وہ شعر میرا یہ ہے:

برم چوں نامِ بابو برجِ موہن  
چمکد غولِ دلِ ریش از لبِ من <sup>۸۵۶</sup>

مذکورہ بالا اقتباسات سے واضح ہو جاتا ہے کہ فنِ تاریخ گوئی میں مرزا  
مخصوص اور واضح نظریات رکھتے تھے۔ انھوں نے غزل کی طرح روٹا عام سے ہٹ کر  
تاریخیں لکھی ہیں۔ اور یہ عمدت انہی کی ایجاد ہے۔ یہ تاریخیں ان کی جدت طرازی اور  
طبیعت کی دشوار پسندی سے ہم آہنگ تھیں۔ ان کی طبیعت معمولی تاریخیں کہنے کی متحمل  
نہیں تھی۔ ذیل کی تاریخیں ملاحظہ ہوں:

## تاریخِ وقایعِ مولانا فضل امام

### (والدِ مولانا فضل حق خیر آبادی)

اے دریا قدوہ اربابِ فضل  
کرو سوے جہدِ المادئی خرام  
کارِ آگاہی ز پیکارِ اوقاد  
مشتِ دارالملکِ معنی بے نظام  
چوں اراکت از پہ کسبِ شرف  
ہست سالِ فوتِ آں عالی مقام  
چہرہ ہستی خورشیدِ نعت  
تا بے تخریجِ کردِ تمام

کفتم احمد "سایہ الطیب نئی"  
 باد آرمشک "مفضل امام"  
 ۹۹۲+۲۵۷-۵=۱۲۴۳ ہجری

### تاریخ تعمیر امام بازار سراج الدین علی خان

چوں شد بھمن مدفن خاں بزرگوار  
 طرح امام بازار عالی پیر سا  
 رضاں ز غلہ نور بریں بام و در فضا  
 تا گشت سنگ و تخت چو آئینہ زوفا  
 رحمت ہے بساط دلاں بزم تقویت  
 آورد اطلس یہ از سایہ جا  
 رقم نیازمند ہے پیش سروش فیض  
 کفتم کہ پردہ از زرخ تاریخ برکشا  
 ہ "تقویت سرائے" بزرگ "تاریخ" و کفتم  
 لخصہ ساز تخریخ تاریخ ایں بنا  
 ۱۱۵۸+۸۶=۱۲۴۳ ہجری

### تاریخ تھری نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ

(۲۵ شعر)

شاہ عالم نصیر دی کہ بود  
 دویختن اکین از گزیر زوال  
 بطراز رقم سلیمان چاہ  
 ہ نکاح اثر تاجیں قال

اسد اللہ خاں کہ خواجہ  
 در غنّی غالب لطیف کمال  
 یہ اوائے گزارش تاریخ  
 ریخت بر گوشے بساط آل  
 بحر ترمیم این تہاویں جشن  
 کہ بہ خسرو بخش باد بقال  
 زو رقم ”ہزیم عشرت پرویز“  
 دیں کہ مکتوم بود زوے وصال  
 در تو خواسی کہ آشکار شود  
 نقش اندازہ سبکی سال  
 ”شاید غنّی بادشاہ“ نویس  
 دیکھش بر فزائے ”حسنی کمال“  
 ۲۰۹ + ۲۶۲۵ = ۱۸۳۳ء

### تاریخ وفات میر فضل علی مغفور (اعتماد الدولہ)

چو ”میر فضل علی“ را نمائندہ است وجود  
 تو روے دل بغزش اے اسیر رنج و محن  
 چو شد وجود گم و روے ”دل“ خراشیدہ  
 شود ز اسم خوش سال و مکتش روشن  
 سال وفات اس طرح تھمے سے نکلا ہے: ۱۲۷۰ - ۱۲۷۳ = ۱۲۷۳ ہجری

### قطبہ (حمام بنا کردہ احرام الدولہ)

احرام الدولہ فرماں داد تا  
 دل کشا گرماہ انجام یافت

باندھاواں رفت آنجا بھر فصل  
آنکہ در گفتار قالب نام یافت  
قطعه تاریخ آں فرخ بنا  
ہم در آنجا صورت ارقام یافت  
شت پاچہ راحت و آرام بخت  
ہر دو را در گوشہ خام یافت

یہ تمام احرام الدولہ حکیم حسن اللہ خاں نے اپنی عربی کے احاطے میں  
نویا تھا جو دہلی میں لال کنویں سے اجیری دروازے تک پھیلی ہوئی تھی۔ تمام ۱۲۶۸ھ  
(۱۸۵۱-۵۲ء) میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس قطعہ تاریخ میں ”گوشہ خام“ کے اعداد ۳۲۰  
میں ”راحت“ کے اعداد ۶۰۹، اور ”آرام“ کے ۲۳۲ کا قیہ اور تقریب ”شت“ لفظ ”پا“  
کے اعداد ۳ کا تخرجہ ہے جس سے سالِ تعمیر ۱۲۶۸ھ حاصل ہوتا ہے۔

### قطعه تاریخ وفاتِ ہالوے شاہ اودھ

در ہزار و دوصد و شصت و شش از نیا گذشت  
ہالوے شاہ اودھ مریم مکانی نام او  
آنکہ چوں ہالائے ہام کاغِ شصتے روئے غولش  
آپ حیواں رختے از ناہواں ہام او  
نزدیش ہم بر کمالِ حسن او آمد دلیل  
چوں مہ کمالِ بدر از نور نہ شد جام او  
در نور و رہروے شد سامرہ ۹۵۰ منزل کش  
خود اساسی آں زمین بود از چہ آرام او  
گفت قالب سالِ خوش لیکن از دے نیاز  
بانہ یا بیت رسولِ ہاشمی انہام او

## قطعہ تاریخ تعمیر چاہ

میر سعادت علی کرد در اجیر طرح  
 مسجد و چاہ کہ بہت چہرہ آب چاہ  
 زانکہ ز باقر علی تا پہ علی ی رسد  
 حلقہ بخلہ بجم سلسلہ اش مرجا  
 ساختہ شد چوں مکان کرد بدل اجر آں  
 از رو صدق و منا عذر رسولی خدا  
 از پہ ایں سال نیک گنت ہمایوں سرودش

چہرہ از موم صفت مسجد کعبہ بنا

میر سعادت علی دہلوی نے اجیر میں ایک مسجد اور اس سے متصل ایک کنواں

۱۲۶۹ ہجری مطابق ۱۸۵۲ء میں بنوایا تھا۔

## قطعہ تاریخ ولادت فرزند فتح الملک

با خود کفتم کہ فرزند فتح الملک را  
 خود چہ گویم، گنت فجر دودہ آدم بگو  
 کفتم از را تو نہالے رستہ در بارخ مراد  
 کفتم کش سرد روان کشن عالم بگو  
 کفتم از خوبی ریش مانا بخشیدست، گنت  
 سال ایں فرخ ولادت نیر اعظم بگو  
 کفتمش دیکہ چہ کوئی؟ دیر لب خودیہ و گنت  
 ہائے زایہ باجہ انگندہ از "کچو" ایں ہم بگو

فتح الملک یعنی مرزا غلام قمر الدین عرف مرزا فقرو ولی محمد بہادر شاہ ظفر۔ فقرو

کے یہاں شاہزادہ خود شید عالم کی ولادت اس قطعے کے ۱۵۴ تاریخ کے مطابق ۱۲۶۹ھ

(۵۳-۱۸۵۴ء) میں ہوئی۔ ”تذکرہ اعظم“ کے اعداد ۱۲۷۱ ہیں جن میں سے حرف ”ب“ کے دو عدد اگلے شعر کے مطابق خارج کر کے ۱۲۶۹ حاصل ہوتے ہیں۔ اس تخمینے میں ستم یا کم میں سے کم ابہام ضرور ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حرف ”ب“ کے تخمینے نے بعد ”کو“ کے ”۲۶“ عدد ”تذکرہ اعظم“ کے اعداد ”۱۲۷۱“ میں جوڑے جائیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ ”تذکرہ اعظم“ کے اعداد سے ”ب“ کے اعداد کا تخمینہ مقصود ہے۔

### قطعہ در تاریخ تعمیر در

نہادہ بنا احسن اللہ خاں  
سر رہ بدائیں در دل کشا  
کہ غالب پہ سال تعمیر او  
رقم زد در دل کشا جدا

حکیم احسن اللہ خاں دہلوی نے ”در دل کشا“ دروازہ ۱۲۷۰ ہجری میں بنوایا۔ یہ دروازہ اس سڑک پر ہے جو حوض کاغذی سے لال کوتوں اور مسجد فتح پوری کی طرف جاتی ہے۔ اور اس مکان کا دروازہ ہے جو حویلی بدل بیگ خاں کا ایک حصہ تھا جسے بعد میں حکیم صاحب نے خرید لیا تھا۔

### قطعہ تاریخ وفات مائے بیچ مل

کوچہ مائے بیچ مل شیریں کلام مرد  
دیرینہ دوست رفت ازیں شکلا دربیچ  
گفتم کہ ز سال وفاتش نکلاں وہ  
غالب شنید و گفت چہ گویم ”بہا دربیچ“

مائے بیچ مل کھتری، خواہر شکلا جوہر اور میرا شکلا درد کے باپ، غالب کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ جوہر کے نام ”بارغ و در“ کے ایک فارسی خط میں غالب نے کہا ہے، ”بیچ مل میرے دیرینہ دوست ہیں۔ ہر دفعہ دو مہینہ دفتر میرے پاس آتے ہیں اور بہت بیٹھے ہیں۔ میرے فن کے درمیان اگر کوئی جھگڑا تھا تو قمار بازی میں تھا

مرزا غالب کی تاریخ کوئی

اور اب وہ بساطِ انجمن کی قربت ہی محبت ہے، کوئی نزاع نہیں۔ ان کا انتقال ۱۲۷۷ھ میں ہوا۔ ”بہارِ تاریخ“ ماخذِ تاریخ ہے۔

### قطعہ تاریخ کامیابی سید غلام بابا خاں

فتح سید غلام بابا خاں

خود نشانِ دوامِ اقبالست

ہم ازیں رہو بود کہ غالب گفت

کہ ظفر بندۂ ابوِ سلامت

یہ قطعہ غالب نے نواب میر غلام بابا خاں بہادر سوہی کی ایک مقدمے میں کامیابی کا حال بھٹی کے ایک اخبار میں پڑھ کر نظم کیا تھا۔ ”ظفر بندۂ ابو“ ماخذِ تاریخ ہے جس سے سالِ ہجری ۱۲۸۳ھ حاصل ہوتا ہے۔

### قطعہ تاریخ وفاتِ ناصر وحید الدین

کہو چہ ناصر وحید الدین ز دنیا انتقال

کنفتم، آیا بر کدھام آئیں بود سالِ وفات

گفت غالب کز سر زاری اگر تامل برہ

خود ہمیں ”ناصر وحید الدین“ بود سالِ وفات

ناصر وحید الدین سے مراد ہیں سرسید کے بڑے ماموں نواب مختار الدولہ وحید الدین احمد خان بہادر جو نواب دہلیہ الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خان بہادر مصلح جنگ و دہلی اکبر شاہ جانی کے خلیفہ اکبر تھے اور مرزا جہاں گیر کے بیٹے تیمور شاہ کی سرکار میں مختار تھے۔ وحید الدین احمد کے بھائی صرف وحید الدین بھی کہہ سکتے ہیں۔ ماخذِ تاریخ میں ”ناصر وحید الدین“ کے اعداد ۱۲۷۴ھ سے ”سر زاری“ یعنی ”۵“ کے ۷ عدد کا تجزیہ جس کا قریدہ ہے ”بزمِ غم“ اس طرح سالِ وفات ۱۲۶۷ھ حاصل ہوتا ہے۔



## قطعہ تاریخ ولادتِ فرزند کے

اندازہ اسم و سال مولود  
معلوم کن از بختِ فرزند  
چوں یک صد و بست و چار ماند  
ایست شہر عمر دل بند

یہ سورت کے نواب سید ابراہیم علی خاں دقا کے فرزند ارشاد حسین خاں کی ولادت کا قطعہ تاریخ ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ۱۲۸۵ھ ہے۔ جب ”بختِ فرزند“ کے اعداد ۱۳۰۹ کے اعداد میں سے ۱۲۸۵ لیے جائیں تو ۱۲۳ بچتے ہیں۔

## تاریخ اختتامِ نگلشنِ بنگار

غالب ایں رنگیں کتاب ”نگلشنِ بنگار“ نام  
دو گنہ جہاتِ تجری تھما الانہار ہست  
گر کے لب کھنڈ تاریخِ اتماش بود  
”جوے ہاے آب“ ہم در نگلشنِ بنگار ہست

”جوے ہاے آب“ کے ۲۸، نگلشنِ بنگار کے ۱۲۱۳ کے ساتھ جمع کر کے ۱۲۵۱

نکلے ہیں۔

## تاریخ دقاسو ذوق

گویند رفتِ ذوقی ز دنیا، ستم بود  
کاں گوہر گراں بہ نہ نشت و گل نہند  
تاریخِ فوتِ شیخ بود ”ذوقِ جنتی“  
بر قول منِ رداست کہ احبابِ دل نہند

۱۲۶۹+۲=۱۲۷۱ھ

☆۱۰ تاریخ وفات میر حسن ابن علی

حسین ابن علی آمیڈے علم و عمل  
کہ سید العلماء نقشب خانمش بودے  
نماء و ماعے اگر بودے بیچ سال و گر  
”مہم حسین علی“ سال نامش بودے

۱۲۷۸-۵ = ۱۲۷۳ = ۱۲۷۳ ہجری

### تاریخ خدر

چوں کرد سپاہ ہند در ہند  
با انگلیاں سنجہ بے جا  
تاریخ وقوع این واقع  
واقع شدہ ”رسنگیو بے جا“

۱۲۷۷-۳ = ۱۲۷۳ = ۱۲۷۳ ہجری

☆☆ تاریخ وفات نواب میر جعفر علی خان بہادر ☆☆

گردید نہاں سر جہاں تاب دروغ  
شد حیرہ جہاں چشم احباب دروغ  
این واقعہ را از روی زاری غالب  
تاریخ رقم کرد کہ ”نواب دروغ“

۱۲۷۷-۱۲۸۰ = ۱۲۷۳ = ۱۲۸۰ ہجری

☆۱۲ تاریخ ولادت ارشاد حسین خاں پسر سید ایما جیم علی خاں ☆۱۲

### زباغی

حق داد بہ سید ز بے اعراض  
فرخ پرے کہ واجب است اگر اعراض

تاریخ ولادت ہجری ۱۲۸۵ء  
 "ارشاد حسین خان" کہ باشد ہجری  
 ۱۲۸۵ ہجری

### تاریخ ولادت فرزند ارجمند بخاں

نواب میر غلام بابا خان بہادر

میر بابا یافہ فرزندے کہ ماہ چارہ  
 بر فراز لوح کردہ تھال اوست  
 فرقی بنی و یابی بہرہ از تاز و طرب  
 از سر تاز و طرب "فرزند فرخ" سال اوست  
 ۱۲۸۰ = ۱۲۳۱ + ۹ + ۵۰ ہجری

### تاریخ کھلی میرزا جعفر

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی  
 ہوا بزم طرب میں رقص تابد  
 کہا غالب ہے، تاریخ اس کی کیا ہے  
 تو بولا "اشرح جشن جہشہ"  
 ۱ ۲ ۳ ہجری

ایضا

غیر انجمن طوے میرزا جعفر  
 کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے ہی محفوظ  
 ہوئی ہے ایسے ہی فرشتہ سال میں غالب  
 نہ کہوں ہو ملا سال ہجری  
 ۱۲۵۳ ہجری

## ایکٹا

پورا وہ فرزند احمد کو ملا ہے  
رحمت باری کا جو گنجینہ ہے  
سال تاریخ ولادت میں لکھا  
"راحت جاں ہے سرور جید ہے"  
تاریخ طباعت تذکرہ سراپا سخن  
اس کتاب طرب نصاب نے جب  
آپ و تاب انطباع کی پائی  
تکبر تاریخ سال میں مجھ کو  
ایک صورت جی نظر آئی  
ہندسے پہلے سات سات کے دو  
دیے ناگاہ مجھ کو دکھائی  
اور پھر ہندسہ تھا بارہ کا  
با ہزاراں ہزار دریائی  
سال بھری تو ہو گیا معلوم  
بے شمول مہارت آرائی  
تکر اب ذوق بذلہ نئی کو  
ہے جداگانہ کارفرمائی  
سات اور سات ہوتے ہیں چودہ  
بہ اسو سعادت افزائی  
فرض اس سے ہیں چارہ محسوم  
جن سے ہے چشم و جاں کو زیبائی

اور بارہ امام ہیں بارہ  
جن سے ایمان کو ہے توانائی  
ان کو غالب یہ سال اچھا ہے  
جو ائمہ کے ہیں توانائی ۱۳۵۶  
۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶

### قطعہ تاریخ اہتمام "تکلیفِ حکت" ۱۳۵۶

سلیم خاں کہ وہ ہے نور چشم واصل خاں  
حکیم حادق و دانا ہے وہ لطیف کلام  
تمام دہر میں اس کے مطلب کا چمچا ہے  
کسی کو یاد بھی لقمان کا نہیں ہے نام  
اسے فضائلِ علم و ہنر کی افزائش  
ہوئی ہے مبدعِ عالم سے اس قدر انعام  
کہ عجبِ علم میں اطفالِ ابھری اس کے  
ہزار بار قلاطوں کو دے چکے الزام  
عجب نسو نادر لکھا ہے ایک اس نے  
کہ جس میں حکت و طب ہی کے مسئلے ہیں تمام  
نہیں کتاب ہے، اک متبعِ نثارِ بدیع  
نہیں کتاب ہے اک معدنِ جہاںِ کام  
کل اس کتاب کے سالِ تمام میں جو مجھے  
کمالِ فکر میں دیکھا، غور نے بے آرام  
کہا یہ جلد کہ ٹ اس میں سوچا کیا ہے  
"لکھا ہے نسو تھو" یہی ہے سالِ تمام

## قطعہ تاریخ وفاتِ محترمہ الدولہ محبوب علی خاں

چوں محترمہ الدولہ ہواں میرتِ خوب

مستقی مُرد و شد میرا از دلوب

محبوب علی خاں بچیاں آسمش بود

تاریخ وفات شد: "دریغنا محبوب"

۱۲۷۳ ہجری

۱۵۶۶  
قطعہ

ہر شب ہدیجِ رختے ہارۂ گلنام

آرے ز دوسی سال مرا قاعدہ ایں بود

شش روز شد، ایک کہ بے دسزم نیست

شد غمزہ تر دل کہ ازیں پیشِ حزیں بود

امشب چہ سراپم کہ شبِ ازل گور است

شش روز بہ چٹائی و کواسہ جہیں بود

نامہ در آن وقت کہ در قلعہ رو مر

از من در قدم تا دمِ باز پیمیں بود

یک رہ دو تن از شربِ نیم منع نوشید

ہاں منع نہ از بغض، بل از غیرتِ دہیں بود

ہر چند ہاں منع، من از سے نگرشتم

لغا دم کیوے عزیزاں بہ کسیں بود

دانی کہ چہ شد؟ شد در سوداگر صہیا

شش داد و شد با من ویرانہ نقییں بود

گذشت ز اعزازۂ ہایست، من گشت

دیکر محرم ہارہ کہ محمول نہ ایں بود

با کاسے خالی چہ کند کیسے خالی  
 باخواست و خواست دل صبر گزریں بود  
 گر زر بود از جائے دگر می طلبیدم  
 کو نقد دہاں دست کہ پیشش بزمیں بود  
 در غرقہ شعبان چو ز من بادہ گرھہ  
 خود "غالب" چسودہ "نکاتی ز سنیں بود  
 رو شش بدر آ از سر شعبان کہ دریں جا  
 قصد من از تخرج البتہ ہمیں بود  
 ۱۲۹۱ - ۶ = ۱۲۸۵ھ

## حوالے اور حواشی

- ۱۵۱ "کاشانک" کے اعداد ۹۱ نہیں بلکہ ۹۲۲ ہوتے ہیں۔
- ۱۵۲ "مکتوبے مطبوعہ" ص ۳۵-۳۶، حلقہ دوم۔
- ۱۵۳ "مکتوبے مطبوعہ" ص ۸۵، حلقہ اول، مطبع کجیائی، دہلی، ۱۸۹۹ء۔
- ۱۵۴ میرزا یوسف بیگ: غالب کے چھوٹے بھائی تھے۔ جنہوں نے غالب، وہ ہمیں برس تک دیوانہ رہے اور آخر کار ۲۹ صفر ۱۲۵۷ھ مطابق ۱۸ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو انتقال کیا۔ لیکن اردو میں سن ۱۸۵۷ء کی بجائے "۱۸۵۸ء" لکھی گئی ہے۔ میرزا یوسف خاں جو عدلیہ دار سے جانتے نہیں ہیں تھے۔ گولہوں کی آواز سن کر بے ایک باہر نکلے اور مارے گئے۔ مرزا نے تاریخ لکھی:
- ۵ سال مرگ حتم ویدہ میرزا یوسف  
 کہ زبیرے بہ جہاں وہ ز غولیں بچاؤ  
 بکے وہ انجمن در میں میں چوہاں کرد  
 کلیدم "آپتے" و کلیم "تاریخ دیوانہ"  
 ۱۲۹۰-۱۲۹۱ھ = ۱۸۷۴ء تقریبی
- ۵۵۱ "مکتوبے مطبوعہ" ص ۳۷۔
- ۶۵۱ "تاریخ غالب" جلد اول ص ۳۳۳۔
- ۷۵۱ اہلہ، ص ۳۳۳

۸۵۴ اردوئے معلیٰ: "ص ۱۳۸، حصہ اول۔

۹۵۴ سامراجِ بھارت سے تقریباً ۷۵ میل کے فاصلے پر دریائے وچل کے مشرقی کنارے چھوٹا سا قصبہ ہے۔ یہاں حضرت علی قلی اور جناب درجس خاتون زوجہ امام حسین عسکری، جناب علیہ خاتون غفور امام علی قلی کے حواری ہیں اور وہ بیت الشرف بھی ہے جس میں ان بزرگوں کا قیام تھا۔ قبیلے میں مریم سکانی سے مراد بادشاہ حکیم لہجہ قازی الدین حیدر سے ہے۔ ان کا انتقال ۱۳۲۶ھ میں ہوا تھا۔ ("تاریخ اہلحد" جلد چہارم، ص ۳۲۶ میں ۱۳۳۳ھ کی تاریخ درج ہے)۔

۱۰۵۴ میر حسین ابن علی، خیراں باب مولوی سید ولید علی کے گھر ۱۳۱۳ھ رجب الثانی ۱۳۱۱ھ (اکتوبر ۱۷۹۶ء) کو ولادت ہوئی۔ "غزالیہ کابل" ص ۱۵۴ تاریخ ہے۔ مشرقِ طوم خیراں باب اور اپنے بڑے بھائی سید محمد سلطان اہلبا سے حاصل کیے۔ ۱۷۹۸ء ۱۳۷۳ھ (اکتوبر ۱۸۵۶ء) کو انتقال کیا۔ غالب نواب انوارالملک سعادہ بن خاں قلی کو کہتے ہیں:

آپ کو معلوم ہوگا کہ میرزا صاحب نے انتقال کیا۔ یہ چھوٹے بھائی تھے  
بھتیجا ناصر (سلطان اہلبا) کے۔ نام ان کا سید حسین اور خطاب  
سید اہلبا۔ "مقتضیٰ نگینا میر حسین ابن علی" میں نے رحلت کی تاریخ پائی۔  
اس میں پانچ جڑتے ہیں۔ یعنی ۸۰۰۰۰ جڑتے تھے۔ قزاق ہی روایت کا  
میرے خیال میں آیا۔ میں تو ہانا ہوں، اچھا ہے۔ دیکھو، آپ ہند  
فرماتے ہیں، کہ نہیں۔ ("اردوئے معلیٰ: ص ۳۳۷)

تھوڑے تاریخ کے علاوہ غالب نے ایک اور انگیز ترکیب بند قاری میں لکھا جو نکات غالب میں موجود ہے۔

۱۱۵۴ نواب میر جعفر کے بارے میں مرزا ایک خط میں نواب میر نظام بابا خان بہادر کو ۱۳۱۱ھ رجب الاول ۱۳۱۰ھ کو کہتے ہیں:

ہے کہ نواب میر جعفر علی خاں جیسا امیر روشن گھر نام اور مددگار امیرانی  
ہند و انگلیٹ وچ بھائی یعنی ۳۶ برس کی عمر میں ہیں مریاے: "نقل  
جسٹس سرور کی انکو دیا جائے۔" کج تو ہیں ہے کہ یہ دہر آشوب تم ہے۔  
بھروسہ علی بند نام دار و سگوار ہوں تو بھی تم ہے۔ اگرچہ میں کیا اور  
میری دعا کیا۔ مگر اس کے سوا کہ مہفرت کی دعا کروں اور کیا کروں؟  
تھوڑے سال پہلے نواب خیراں باب... اور دوے "قاری" دے دے اور  
کے حد بڑھائے جائیں تو ۱۳۸۰ھ پیدا ہوتے ہیں۔ ("اردوئے معلیٰ: ص  
۵۵، حصہ اول)

۱۲۵۴ مرزا ایک خط میں نواب سید احمد علی خاں کو کہتے ہیں:

ہند ہند کی سرور ہے۔ حضرت سید احمد حسین خاں صاحب دیکھو اعلیٰ  
کی قزاق سے معلوم ہوا کہ آپ کے گھر مولود مسعود پیدا ہوا۔ ایک مہارت  
دیکھی مہرب کر کے اکل اظہار میں میں نے پچھادی ہے اور ایک رہائی  
اور ایک تھوڑا اور ایک تھوڑا سید صاحب ممدوح کا جو انہوں نے یہاں  
بچھا تھا وہ بھی پچھادیا اور میں قبیلے جہنگلی بہاری لال حکیم اور میر قزاق



الہی ختم مطبع نے جو یہاں تاریخیں لکھی تھیں، وہ چھپا دیے۔ یہاں چھاپی گئی ہوئی رہائی اور قصہ مرض کرتا ہوں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ۱۸۸۵ء ہے۔ جب ”غزوہ فرزد“ کے اعداد میں سے ۱۸۸۵ لے لیے تو ۱۳۳ بچے ہیں۔ ان کو میں نے دہائے عمر فوسلوا قرار دیا۔ (”اردو سے ملے“)

”مکمل الاخبار“ دہلی میں ”جہیت“ کے عنوان کے تحت یہ عبارت موجود ہے:

بھصل الہی ۲۶ ربیع الثانی ۱۲۸۵ء روز یکشنبہ نکلتا ہجر دہائی ہے۔  
 کتاب مطبعہ القاب نواب میرزا ابوالکلام خان بہادر دہلی اعظم سہولت کے گھر چھاپا ہوا۔ گوکہ نواب صاحب چاہتے تھے اور یہ چاہ کے پاس ایک روشن ستارہ چکا۔ حق سبحان تعالیٰ اس با درخشندہ اور اختر تابندہ کو اورج عزت و اقبال پر تا طلوع آفتاب قیامت پر نور فیاض مقرر رکھے۔  
 کتاب مستطاب نظم اللغات نواب اسد اللہ خان بہادر غالب دہلی نے ایک دہائی اور ایک قلعہ جہیت فی طرہ کا، کہ دیکھنے والے شہرہ دیو و لمہدی اس کا لطف ادا نہیں کئے، اور شاد فرمایا ہے۔ ہم یہ انواریں دہلی اخبار وہ دہائی و قصہ لکھتے ہیں۔

(”مکمل الاخبار“، دہلی، مؤرخہ ۲۴ جبر ۱۸۹۸ء)

۱۳۵۱۔ یہ اعداد ”تذکرہ سراپا خن“ مطبعہ ۲۴۳ پر ”قصہ تاریخ میرزا اسد اللہ خاں صاحب دہلی“ کے عنوان کے تحت درج ہیں۔ ”سراپا خن“ کے مؤلف سید محسن علی محسن ہیں۔ وہ سید شاہ حسین جہیت کے بیٹے سید عرب شاہ کے پوتے اور سید میرک شاہ کے پوتے تھے۔ محسن کے اجداد غوث نواح خور (الغانستان) سے فرخ سیر کی طلب پر لاہور آئے تھے۔ محسن کے والد آٹھ کتابوں کے مصنف تھے۔ محسن نے ”سراپا خن“ نام اور مرتبہ قاری اور اردو تذکروں سے ہٹ کر لکھا ہے۔ یعنی اس میں شعرا کے حالات زندگی اور نمونہ کلام درج نہیں کیا گیا بلکہ قصا سے لے کر اپنے معاصرین تک ملت سوسے ذائقہ شعرا کی ایسی فہرستیں جمع کی ہیں جو سر سے لے کر گونوں تک مختلف اصناف کی تھیں۔ محسن نے یہ تذکرہ شاہ ابی بخش عطی کی فرمائش سے عرب کیا اور ۱۳۶۷ھ میں تمام کیا۔ تذکرہ پہلی بار ۱۳۷۷ھ (۱۸۹۱ء) میں مطبعہ فولکلور راجہ محلہ رکاب سنج لکھنؤ سے ۴۰۲ سطروں میں شائع ہوا تھا۔ اب یہ تہا ہے۔ اور ہے۔ مرصع ہوا کہ ڈاکٹر سید سلیمان حسین نے اس کی تعلیم کی تھی وہ بھی اب کیا ہے۔ محسن کا انتقال ۱۳۸۸ھ (۱۸۷۱ء) سے قبل ہوا۔ (”مجموعہ خن“ ص ۴۰۲)

۱۳۵۲۔ یہ قصہ حکیم محمد سلیم خاں بن محمد سلیم خاں بن مہدالغیظ خاں دہلی کی کتاب موسوم بہ ”تکلیف نکتہ“ کے اختتام کی تاریخ ہے۔ اس کے بارے سے ۱۳۷۹ھ (۱۸۹۲ء) کے اعداد ملتے ہیں۔ کتاب کئی بار ۱۳۸۵ھ (مارچ ۱۸۹۹ء) میں اور دوسری بار جولائی ۱۸۸۵ء میں مطبعہ فولکلور سے چھپی تھی۔

۱۳۵۳۔ اس قصے کے بارے میں ڈاکٹر یحییٰ عابدی ”ہائے دور“ ص ۲۷۰ ”تحقیق ہائے ۱۹۳۷-۱۹۰۷ء میں لکھتے ہیں:

یہ قصہ دائم الحروف نے رسالہ ”آج کل“ دہلی شہر ۱۵۱۱ھ میں ایک خودی پناہشت کے ساتھ شائع کیا تھا۔ جس کی باز نوشت دہلی میں درج کی جاتی ہے۔ اس تحریر کے ضمن کا عارفی میں کوئی تبدیلی

نہیں کی گئی ہے:

غالب نے ترک شراب کی کئی دہائیوں کی، مگر یہ قویہ فوجی رہی، کبھی روز اور میں، کبھی شب، کبھی صبح میں، کبھی  
 وہیں میں سے ہاتھوں، کبھی بھائی فوتہ جی کی سکنوں کی خاطر، کبھی ایک کو دے دے خودی کی غرض سے، کبھی دوسری  
 احباب کا تم ملنے کرنے کے لیے۔ کبھی تم تھی کو گوارا جانے کے لیے۔ چنانچہ اس میں مزاج کو اس کے محتاس  
 ضمیر نے خود جان کیا ہے:

یک روز بہ ترک پادہ گوئی غالب  
 دس روز دگر بہ پادہ شولی غالب  
 زنی قویہ ہے چہ چہ جولی غالب  
 قویہ صبح قویہ است گوئی غالب

(یہ رہائی خط غالب کا قلمیہ فارسی، مسمی، سال ۱۸۶۶ء، کتب خانہ رام پور میں محفوظ ہے۔)

مگر کم شعبان ۱۲۸۵ھ (سرخندہ مارنوسبر ۱۸۶۸ء) کی قویہ جس کو اس نے خود اپنی اہلیت دی کہ ایک خطے کے  
 کامیاب پیریز پر اس قویہ کی تاریخ لکھی، نتیجتاً تا دم مرگ قائم رہی ہوگی۔ یہ اس کی آخری حالات کا زمانہ تھا  
 اور اکثر یہ شعر درد زبان رہتا تھا:

دم دہائیں بہ سر رہا ہے  
 مروجہ اب قلذہ ہی قلذہ ہے

یہ قلمیہ تاریخ غالب نے سرخندہ کم شعبان ۱۲۸۵ھ (مطابق شب است دوم نومبر ۱۸۶۸ء) کو قلم کیا تھا۔ یہ  
 منظور و صرف اس لیے اہم ہے کہ غالب کی زندگی کے ایک انتہائی نقطہ کا پتا دیتا ہے۔ بلکہ اس لیے بھی اہم  
 ہے کہ قلم میں اس عظیم شاعر کی یہ آخری تلاش ہے۔ اس کے بعد کی کوئی تلاش حد سے قلم میں نہیں۔ اس قلمیہ  
 کا ہاتھ "نہد بارغ وود" ہے جو غالب کی قادی قلم و نثر کے ہندو اٹھارے پر مشتمل ہے۔ میرے پاس اس  
 مجموعے کا اصل نسخہ ہے جس کی کتابت مہاراجہ کی غرض سے مصنف کی زندگی میں ۱۲۸۳ھ (مطابق  
 ۱۸۶۶ء-۱۸۶۷ء) میں شروع ہوئی تھی اور مصنف کی وفات کے ایک سال چار مہینے یا پچیس دن بعد، یعنی  
 ۱۲۸۷ھ (مطابق مارچ ۱۸۷۰ء) کو قلم ہوئی، مگر اس مجموعے کے طبع ہونے کی قوت نہیں آئی۔

"نہد بارغ وود" غالب کا لکھا ہوا تاریخی نام ہے جس سے آغاز کتابت کا سال ۱۲۸۳ھ حاصل ہوتا ہے۔  
 جیسا کہ غائب کی مہاراجہ میں درج ہے۔ کتاب نے یہ نسخہ غالب کے شاگرد مثنوی ہیرا سنگھ کھنڑی کی فرمائش پر لکھا  
 تھا۔ یہ مثنوی ہیرا سنگھ جیانی کے قریب کھنڑی گل میں رہتے تھے۔ خطے میں بعض امارات سے قلمیہ ۱۲۸۷ھ  
 کو اس کا بیشتر حصہ غالب کی نظر سے گزرا تھا۔



☆ ☆ ☆ "قلمیہ غالب فارسی" (جلد اول)، مرشد سید مرتضیٰ حسین ناظم کھنڑی، مجلس ادبی لاہور،  
 طبع اول جون ۱۹۶۷ء، ص ۵۰۶، میں اس قلمیہ کا عنوان ہے: "تاریخ وفات نواب میراجعلی خان" جو ظاہر  
 قلم کی غلطی ہے۔ (ادارہ)



## عالب کے آخری ایام

مرزا غالب عرصہ دراز سے امراض مختلفہ کا مجموعہ تھے۔ آخری ایام میں وہ زندگی سے بیزار تھے اور اپنے کو مردوں میں شمار کرتے تھے۔ ہمیشہ کافور و کنکن کی پڑی رہتی تھی۔<sup>۱۲۶</sup> ۸ مئی ۱۸۴۷ء کو جب انھیں قمار بازی کی پاداش میں سزا ہوگئی تو اس وقت بھی عرصے سے طویل تھے اور سوائے پریشانی غذا قلیہ چھاتی کے اور کوئی چیز نہیں کھاتے تھے۔<sup>۱۲۷</sup> ۱۸۵۲ء کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۵۵ برس کے سن میں وہ بہرے اور بوڑھے ہو گئے تھے، دانت گر گئے تھے، چہرے پر ٹھنڈیاں اور ہاتھ میں ریشہ پڑ گیا تھا اور پادر رکاب تھے۔ انوارالعدلہ شفیق کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

آکھون کہ داندان فرور بخت و کوش کراں گشت۔ سوسے پیدہ است و  
روے پر آؤنگ، دست بلرزہ اندرست و پائے در رکاب۔<sup>۱۲۸</sup>

۱۸۵۵ء (۱۲۷۲ھ) میں ان کی یہ حالت تھی:

طاقت سلب، حواس مفقود اور امراض مستولی تھے۔<sup>۱۲۹</sup>

۱۸۵۷ء (۱۲۷۳ھ) میں مرزا کا سامانہ مر گیا تھا، قوتِ ہامہ میں ضعف آ گیا تھا اور جتنی قوتیں انسان میں ہوتی ہیں وہ سب مضمحل تھیں۔ حواسِ سراسر مفلج تھے۔

مرزا غالب کے آخری ایام

حافظ کوپا کبھی نہ تھا اور شعر کے فن سے کوپا کبھی مناسبت نہ تھی۔<sup>۶۵\*</sup> ۱۸۵۸ء میں ان پر پہلی دفعہ قویج کا دورہ پڑا تھا۔ اس بارے میں ۲۳ مئی ۱۸۵۸ء کو مرزا تقی کو اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

وہ غلط پہلا تم کو بھیج چکا تھا کہ بیمار ہو گیا۔ بیمار کیا ہوا قویج زیست کی نہ رہی۔ قویج اور پھر کیسا شدید کہ پانچ پہر مرغ نیم ہل کی طرح تڑپا گیا۔ آخر حصارہ ریوند اور ارغزی کا قیل پیا۔ اس وقت قویج کیا مگر قصہ قطع نہ ہوا۔ مختصر کہتا ہوں، میری غذا تم جانتے ہو کہ تھوڑی سی کیا ہے۔ دس دن میں دوبار آدمی آدھی غذا کھائی۔ کوپا دس دن میں ایک بار غذا تناول فرمائی۔ گلاب اور املی کا پچا اور آلو تھارے کا افشردہ، اس پر مدار رہا۔ کل سے غائب مرگ گیا ہے اور صورت زیست کی نظر آئی ہے۔<sup>۶۶\*</sup>

مرزا اپنے ضعف، ناتوانی اور بھری کے بارے میں ۳۱ دسمبر ۱۸۶۰ء کو کہاں داد خاں بہادر کو لکھتے ہیں:

ناتوانی زور پر ہے۔ بڑھاپے نے کھما کر دیا ہے۔ ضعف، سستی، کاہلی، گراں جاتی، گرائی، رکاب میں پاؤں ہے، باگ پر ہاتھ ہے، بڑا سطر دورودان درخشاں ہے۔ زاو راہ موجود نہیں۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں، اگر تپہ سیدہ بخش دیا تو خیر، اور اگر باز پرس ہوئی تو سطر مقرر ہے اور ہادیہ زوایہ ہے۔ دوزخ جاوید ہے اور ہم ہیں۔<sup>۶۷\*</sup> مرزا کی حالت ۱۸۶۳ء میں تشویش ناک تھی۔ لکھتے ہیں:

ایک برک سے عوارض فساد خون میں مبتلا تھا۔ بدن پھوڑوں کی کثرت سے سر و چراغاں اور لال زار ہو گیا تھا اور یہ پھوڑے ایسے تھے جیسے انگارے سلگتے ہیں۔ طاقت مفلوہ ہو گئی تھی۔<sup>۶۸\*</sup> جتنا خون تھا بے مبالغہ آدھا اس میں سے چھپ ہو کر نکل گیا۔<sup>۶۹\*</sup>

پرست سے ہڈیاں صواور، اعضا پر دس جگہ پھائے گئے ہیں۔<sup>۱۱۶</sup>  
 غلام حسین قدر بکرا می<sup>۱۱۷</sup> کو ۲۳ شعبہ ۲۳ نومبر ۱۸۶۳ء کو لکھتے ہیں:  
 برس دن صاحب فرماں رہا ہوں۔ چھوٹے بڑے دھم بارہ اور ہر دھم  
 خوں چکاں۔ ایک درجن پھائے لگ جاتے تھے۔ جسم میں پھتا ہوا  
 تھا چھپ ہو کر نکل گیا۔ تھوڑا سا جو جگر میں باقی ہے وہ کھا کر بیٹا  
 ہوں۔ کبھی کھاتا ہوں، کبھی پیتا ہوں۔ مرض کے آثار میں سے  
 اب بھی یہ نشان موجود ہے کہ دونوں پاؤں کی دو دو انگلیاں میڑھی  
 ہو گئی ہیں، مع ہڈا حوزم ہیں۔ جوتا نہیں پہتا جاتا۔ ضعف کا تو  
 بیان ہو ہی نہیں سکتا۔<sup>۱۱۸</sup>

مرزا علاء الدین خاں طائی کو لکھتے ہیں:

میری حقیقت سنو، مینا بھر سے زیادہ کا عرصہ ہوا۔ ہائیں پاؤں  
 میں دم، کب پا سے پھوٹ پا کو گھیرتا ہوا پھڑکی نکلا۔ کھڑا  
 ہوتا ہوں تو پھڑکی کی رگیں پھٹنے لگتی ہیں۔ خیر نہ اٹھا، روٹی کھانے  
 کل سرا نہ گیا، کھانا پیئیں منگالیا، بیٹاب کو کیوں کر نہ اٹھوں، حاجتی  
 رکھ لی۔ بغیر اکڑو بیٹھے بات نہیں فنی، پاخانے کو اگرچہ دوسرے  
 تیسرے دن جاؤں، مگر جاؤں تو سکی۔ یہ سب موقع خیال میں  
 لا کر سوچ کر لو کیا گزرتی ہوگی۔ آغاز فتن، مزید علیہ یا مستزاد:  
 جیڑی دمد مدیب، چنیں گفتہ اند۔

اپنا یہ مصرع بار بار چکے چکے پڑھتا ہوں:

اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

مرگ اب ناگہانی کہاں رہی۔<sup>۱۱۹</sup>

نواب انوارالعدلہ فتح کو دو شعبہ ۲۶ رمضان ۱۲۸۰ھ (مطابق ۱۵ فروری

۱۸۶۳ء) کو لکھتے ہیں:

سال گزشتہ مجھ پر بہت سخت گزرا۔ ۱۲، ۱۳ مئی صاحب فرماں رہا۔

الٹا دشوار تھا۔ چلتا، پھرنا کیسا۔ نہ چپ، نہ کھانسی، نہ اسہال، نہ فالج، نہ قہقہہ۔ ان سب سے بدتر ایک صورت بڑھ کر دورت، یعنی احتراق کا مرض۔ مختصر یہ کہ سر سے پاؤں تک ۱۲ پھوڑے، ہر پھوڑا ایک دھم، ہر دھم ایک غار، ہر روز بے مبالغہ ۱۲، ۱۳ پھائے اور پاؤں بھر سرخ و دھواں، تو وہی سینے بے خور و بے آب رہا ہوں اور شب و روز بے تاب۔ راتیں یوں گزری ہیں کہ اگر کبھی آنکھ لگ گئی، وہ گھڑی غافل رہا ہوں گا کہ ایک آدھ پھوڑے میں نہیں اٹھی۔ جاگ اٹھا، تشہا کیا، پھر سو گیا پھر ہوشیار ہو گیا۔ سال بھر میں سے تین تھیں جسے دن یوں گزرے۔ پھر تخفیف ہونے لگی۔ وہ تین سینے میں لوٹ پٹ کر اچھا ہو گیا۔ نئے سرہ روح غالب میں آئی۔ اہل نے میری سخت جانی کی قسم کھائی۔ اب اگرچہ سندھت ہوں، لیکن ناتواں اور ست ہوں۔ حواس کھو بیٹھا۔ حافظے کو رو بیٹھا۔ اگر الٹا ہوں تو اتنی دیر میں الٹتا ہوں کہ جتنی دیر میں ایک قد آدم و پیار اٹھے۔<sup>۱۳۶</sup>

میر غلام بابا خاں نے ۱۸۶۶ء میں غالب کو بھیجی آنے کی دعوت دی تھی، لیکن وہ بھری، ضعف اور ناتوانی کے سبب وہاں نہ جاسکے۔ ایک خط میں ان کو لکھتے ہیں:

پاؤں سے اپانچ، کانوں سے بہرا، ضعف بصارت، ضعف و ماخ، ضعف دل، ضعف معدہ، ان سب ضعفوں پر ضعف طالع، کہیں کر قصہ سز کروں۔ تین چار شبانہ روز قفس میں کس طرح بسر کروں۔ کھٹے بھر میں وہ بار پیشاب کی حاجت ہوتی ہے۔ طاقت جسم میں، حالت جان میں نہیں۔ آٹا میرا سورت تک کسی صورت خیر امکاں میں نہیں۔<sup>۱۳۷</sup>

مر کے آخری تھے میں غالب کا ضعف نہایت کو پہنچ گیا تھا۔ رشتہ دور پر

تھا۔ قلم لڑکوں سے بنالیتے۔ بینائی زائل ہو چکی تھی اور حواس بھی حقل ہو گئے تھے۔<sup>۱۶۵</sup>  
 اشعار کی اصلاح لینے لینے دیتے تھے۔ بعد میں جو اشعار اصلاح کے واسطے آتے تھے وہ  
 بکس میں دھرے رہتے تھے۔<sup>۱۶۶</sup> نہ آنکھ کام کرتی تھی اور نہ ہاتھ ہی۔<sup>۱۶۷</sup>  
 کوئی فضل نہیں تھا۔ کوئی اختلاط، کوئی جلب، کوئی مجمع پسند نہ تھا۔ کتاب، شعر،  
 جسم اور روح، سب سے نفرت اور روح سے نفرت تھی۔<sup>۱۶۸</sup> سامنے کا یہ حال تھا کہ ایک  
 حقہ کاغذ مع دوات و قلم سامنے دھرا رہتا تھا۔ جو دوست آتے تھے پرسش مزاج کے سوا  
 اور کچھ کہتا ہوتا تھا، لکھ دیتے تھے اور ان کی تحریر کا جواب زبانی دیتے تھے۔<sup>۱۶۹</sup>  
 مثنوی حبیب اللہ خاں ڈکا کو ۱۰ شوال ۱۲۸۳ھ (۱۵ فروری ۱۸۶۷ء) کو  
 لکھتے ہیں:

سزا بھرا اردو میں ترخہ پیر عرف ہے۔ میری تہتر برس کی عمر  
 ہے۔ پس میں اعراف ہوں۔ حافظ گویا تھا ہی نہیں۔ سامع باطل  
 بہت دن سے تھا۔ رفتہ رفتہ وہ بھی حافظے کی مانند معدوم ہو گیا۔  
 اب صیحا بھرے یہ حال ہے کہ جو دوست آتے ہیں رکی پرسش  
 مزاج سے بڑھ کر جو بات ہوتی ہے وہ کاغذ پر لکھ دیتے ہیں۔ غذا  
 مفقود ہے۔ صبح کو قند اور شیر، بادام خشک، دوپہر کو گوشت کا پانی،  
 سرشام تلے ہوئے چار کباب، سوتے وقت پانچ روپے بھر شراب  
 اور اسی قدر گلاب۔ عرف ہوں، پوچھ ہوں، فاسق ہوں، رویا  
 ہوں۔ یہ شعر میر تقی میر کا میرے حسب حال ہے:

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم  
 الغرض نہ دوپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم<sup>۱۷۰</sup>

میاں داو خاں سیاح کو ۱۱ جون ۱۸۶۷ء کے خط میں اپنی ضعیفی اور بے بسی کا

لکھ ان الفاظ میں سمجھتے ہیں:

بہائی! میرا حال اسی سے جانو کہ اب میں خط نہیں لکھ سکتا۔ آگے

لینے لینے لگتا تھا۔ اب رشتہ و غلبہ بصارت کے سبب سے وہ بھی نہیں ہو سکتا۔ جب حال یہ ہے تو کب صاحب میں اشعار کو اصلاح کیوں کر دوں اور پھر اس موسم میں کہ سر کا بیجا پگھلا جاتا ہے۔ دھوپ کے دیکھنے کی تاب نہیں۔ رات کو گھن میں سوتا ہوں۔ صبح کو وہ آدمی ہاتھوں پر لے کر دالان میں لے آتے ہیں۔ ایک کوفری ہے، اندھیری، اس میں ڈال دیتے ہیں۔ تمام دن اس گوشہ تاریک میں پڑا رہتا ہوں۔ شام کو پھر وہ آدمی بدستور لے جا کر پلنگ پر گھن میں ڈال دیتے ہیں۔ اور کیا کہوں، کس کس کی غزلیں، یہ سب ایک جگہ دھری ہوئی ہیں۔ اگر کوئی دن زندگی اور ہے اور یہ گری خیر سے گزر گئی تو سب غزلوں کو دیکھوں گا۔<sup>۳۵</sup>

حبیب اللہ خاں ڈکا کو ۲۲ شوال ۱۲۸۳ ہجری مطابق ۱۸۶۸ء لکھتے ہیں: میں کیا لکھوں۔ ہاتھ میں رشتہ، انگلیاں کہنے میں نہیں۔ ایک آنکھ کی دھانی ڈال۔ جب کوئی آجاتا ہے تو اس سے خطوط کا جواب لکھوا دیتا ہوں۔ مشہور ہے یہ بات کہ جو کوئی کسی عزیز کی فاتحہ دلاتا ہے، موتی کی روح کو اس کی بونہیختی ہے۔ ایسے ہی میں سگھ لیتا ہوں خدا کو۔ پہلے مقدار خدا کی قولوں پر حصر تھی، اب ماشوں پر ہے۔ زندگی کی توقع آگے مسخوں پر تھی اب وہوں پر ہے۔ بھائی، اس میں کچھ مبالغہ نہیں ہے۔ بالکل میرا بچی حال ہے۔ انا اللہ داتا الیہ راجعون۔<sup>۳۶</sup>

چهار شنبہ ۱۲ اپریل ۱۸۶۸ء کو میر تقی میر کو لکھتے ہیں: امراض جسمانی کا بیان اور اعصاب ہم دیکھ کی شرح کے بعد ہجوم غم بے نہانی کا ذکر کیا کروں۔ جیسا جو سیاہ جما جاتا ہے یا بخاری دل آتا ہے۔<sup>۳۷</sup>



وراصل مرزا کو کلکتے کے معزز مشین کی ناکامی نے اتنا مایوس اور ناامید کیا تھا کہ وہ اپنی زندگی سے ہمیشہ کے لیے عاجز آچکے تھے اور دنیا کے آلام اور تک و تنگی نے انہیں اس قدر آن گھیرا تھا کہ انہوں نے مرنے سے تقریباً بیس سال قبل اپنی موت کی پیش گوئی ۱۲۷۷ھ کے لیے کی تھی۔ چنانچہ اس پیشین گوئی کے بارے میں دو شنبہ ۱۳ جنوری ۱۸۵۹ء کو خواجہ غلام غوث بے خیر<sup>۲۵۶</sup> کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

اب اس سے زیادہ داس کیا ہوگی کہ یہ انسید مرگ جیتا ہوں۔ اس راہ سے کچھ مستثنی ہوتا چلا ہوں۔ دو اضعائی برس کی زندگی اور ہے۔ ہر طرح گزر جائے گی۔ جاتا ہوں کہ تم کو فنی آئے گی کہ یہ کیا بتا ہے۔ مرنے کا زمانہ کون بتا سکتا ہے۔ چاہے الہام کچھ چاہے اوہام کچھ۔ میں برس سے یہ قطعہ کھ رکھا ہے:

من کہ ہاشم کہ جاوداں ہاشم  
چوں نظیری تمامہ د طالب مرد  
در جگہ دو کدائی سال  
نرد غالب بگو کہ "غالب نرد"  
۱۲۷۷ھ

اب بارہ سو پچاس ہیں اور "غالب نرد" کے بارہ سو ستر (۱۲۷۷) ہیں۔ اس مرے میں جو کچھ مسرت پہنچی ہو پہنچ لے دوں پھر ہم کہاں۔<sup>۲۵۷</sup>

چنی عبد الباقی جنون بریلوی نے اس مصرع کے بارے میں دریافت کیا تھا۔

کھیت من کہ تا اب ۲۷  
اس کے جواب میں غالب نے بیچ شنبہ ۱۸ ستمبر ۱۸۵۹ء کو لکھا کہ:  
لا حول ولا قوۃ! یہ مصرع میرا نہیں۔ "تا اب ۲۷" یہ قاری لاہ قلیل

کی ہے۔ میرا قطعہ یہ ہے:

کیستہ من کہ جاوداں ہاشم  
چوں نظیری نثار و طالبِ نرد  
در بگویند در کدائیں سال  
نرد غالب؟ بلکہ کہ ”غالبِ نرد“

یہ ماؤۃ تاریخِ وفات از روئے نجوم نہیں، بلکہ از روئے کشف ہے۔  
اللہ واثا الیہ راجعون۔<sup>۲۷۵</sup>

مرزا کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ ۱۲۷۷ھ میں مرجا نہیں گئے۔ چہاں شنبہ  
۶ جون ۱۸۶۰ء کو میر مہدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

اب کے ایسا پتہ ہو گیا تھا کہ مجھ کو خود افسوس تھا۔ پانچویں دن غذا  
کھائی۔ اب اچھا ہوں، جلد رست ہوں۔ ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ تک کچھ  
کھانا نہیں ہے۔ محرم کی پہلی تاریخ سے اللہ مالک ہے۔<sup>۲۷۶</sup>

یوسف مرزا کے نام دو شنبہ دوم جمادی الاول ۱۲۷۶ھ مطابق ۲۸ نومبر  
۱۸۵۹ء کو ۱۲۷۷ھ میں مرنے کے بارے میں لکھتے ہیں:

میں تو جنس کے باب میں حکمِ اخیر سن لوں۔ پھر رام پور چلا  
جاؤں گا۔ جمادی الاول سے ذی الحجہ تک ۸ مہینے اور پھر محرم سے  
۱۲۷۷ھ سال شروع ہوگا۔ اس سال کے دو چارہ حد دس کیا رہ  
مہینے غرض کہ انیس مہینے ہر طرح بسر کرنے ہیں۔ اس میں رنج  
و راحت و لذت و محنت جو مقوم میں ہے وہ پہنچ جائے اور پھر حق  
علق کہتا ہوا ملکِ عدم کو چلا جاؤں گا۔ جسمِ رام پور میں اور روح  
عالمِ نور میں۔ یا علی یا علی یا علی۔<sup>۲۷۷</sup>

بقولِ حالی جب مرزا نے نئی جہاز پر سوار ہو کر<sup>۲۷۸</sup> سے اپنے ماؤۃ تاریخِ وفات  
”غالبِ نرد“ کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ حضرت ابنِ شہاب اللہؒ یہ ماؤۃ بھی غلط ثابت

ہوگا۔ مرزا نے کہا ”دیکھو صاحب! تم ایسی قال منہ سے نہ نکالو۔ اگر یہ ماڈہ مطابق نہ لگتا تو میں سر پھوڑ کر مرجاؤں گا۔“<sup>۳۱۵</sup>

آخر کار بڑی آرزوؤں اور تمناؤں کے بعد ۱۴۷۷ھ کا سال اچھی گونا گوں دل فریبوں اور تباہ کاریوں کے ساتھ آئی گیا۔ اس سال دلی میں پیسے کی وبا پھوٹی اور سخت قہر پڑا۔ جس کے نتیجے میں بے شمار چائیں تکف ہو گئیں، لیکن اتفاق سے غالب نہیں مرے۔ انھیں اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ ماڈہ تاریخ غلط لکھا، اب لوگ کیا کہیں گے۔ چوں کہ طبیعت میں شوخی تھی اس لیے دوستوں سے کہا کہ میں اتنا ارزاں نہیں تھا کہ وبا میں مرجاتا۔ میرا اس سال مرنا میری شان کے خلاف تھا۔ میر مہدی بخروج کو جمعہ ۱۴۷۸ھ ہجری، مطابق ۲۶ جولائی ۱۸۶۱ء کو لکھتے ہیں:

دبا کو کیا پوچھتے ہو؟ قدر انداز تھا کے ترکش میں بھی ایک حیر باقی  
تھا۔ نقل ایسا عام، لوٹ ایسی سخت، کال ایسا بڑا۔ دبا کیوں نہ ہو،  
لسان الغیب<sup>۳۱۶</sup> نے دس برس پہلے فرمایا ہے:

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام  
ایک مرگ ناکہانی اور ہے

میاں ۱۴۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی مگر میں نے دباے عام میں مرنا  
اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسر شان تھی۔<sup>۳۱۷</sup>

ایسا ہی ایک اور غلط حکم ۱۴۸۰ھ مطابق ۱۹ جون ۱۸۶۳ء کو قاضی عبدالجلیل  
جوتوں بریلوی کے نام لکھا تھا:

میں زندہ ہوں، لیکن نیم مردہ۔ آٹھ پیر پڑا رہتا ہوں۔ اصل  
صاحب فراش میں ہوں۔ میں دن سے پاؤں پر دوم ہو گیا ہے۔  
کعب پا دیوچ پا سے نوبت گزر کر پنڈلی تک آس ہے جو تے  
میں پاؤں ساتا نہیں۔ بیل و براڑ کے واسطے المنا دشوار۔ یہ سب  
باتیں ایک طرف، درو بھٹل روح ہے۔ ۱۴۷۷ھ میں میرا نہ مرنا

صرف میری تکذیب کے واسطے تھا۔ مگر اس تین برس میں ہر روز مرگ نو کا مزہ چکھتا رہا ہوں۔ حیران ہوں کہ کوئی صورت زیست کی نہیں، پھر میں کیوں جیتا ہوں۔ روح میری اب جسم میں اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر نفس میں۔ کوئی شغل، کوئی اشتغال، کوئی جلد، کوئی بچھ پنہ نہیں۔ کتاب سے نفرت، شعر سے نفرت، جسم سے نفرت، روح سے نفرت۔ یہ جو کچھ لکھا ہے بے مبالغہ اور بیان واقع ہے۔<sup>۳۳۵</sup>

آخر وہ منہوس دن بھی آگیا جس کے لیے مرزا برسوں سے مشتاق تھے اور جس دن عربی، غلہ پوری، طالب، قسیم اور نظیرتی کے شاگرد معنوی اور سب سے بڑے ہندوستانی، قاری اور اردو کے ممتاز ترین غزل گو شاعر کا چراغ زندگی موت کے بھونکے سے دوشنبہ ۲۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ (۱۵ فروری ۱۸۶۹ء) کو ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔<sup>۳۳۶</sup>

بقول حالی، مرنے سے چند روز پہلے بے ہوش ہو گئی تھی۔ پھر پھر، دو دو پہر کے بعد چند منٹ کے لیے افات ہو جاتا تھا، پھر بے ہوش ہو جاتے تھے۔ جس روز افات ہوا، اس سے شاید ایک دن پہلے میں ان کی عیادت کو گیا تھا۔ اس وقت کئی پہر کے بعد افات ہوا تھا اور نواب علاء الدین احمد خاں مرحوم کے خط کا جواب لکھوا رہے تھے۔ انھوں نے لوہارو سے حال پوچھا تھا، اس کے جواب میں ایک فقرہ اور ایک فارسی شعر، جو غالب شیخ سعدی کا تھا، لکھوایا، فقرہ یہ تھا کہ:

”میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ ایک آدھ روز میں ہمایوں سے پوچھنا۔“

اور شعر کا پہلا مصرع مجھے یاد نہیں، رہا دوسرا مصرع، یہ تھا:

مگر وہ بھر دارا یمن سر تو سلامت

مرنے سے پہلے اکثر یہ شعر دو زبان رہتا تھا:

دم واپس بر سرِ راہ ہے

عز و اب قلہ ہی قلہ ہے<sup>۳۳۷</sup>

سلطان نظام الدین اولیا کی درگاہ کے متصل دفن ہوئے۔ اردو کے سب سے بڑے قادر الکلام شاعر اور خدائے سخن میراثیں نے ان کی وفات پر ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا تھا:

گلزارِ جہاں سے باغِ جنت میں گئے  
مرحوم ہوئے، جوارِ رحمت میں گئے  
مذہبِ حق کا مرتبہ اعلیٰ ہے  
غالب، اسد اللہ کی خدمت میں گئے

مرزا کی وفات پر مآلی، سالک اور دوسرے نامور شعرا نے مرثیے کہے۔ فقیر نے ایک طویل مرثیہ قاری میں کہا جو ”لودہ اخبار“ لکھو لیں چھپا تھا۔ یہ مرثیہ ”غالب“ اور ”لودہ اخبار“ نامی مضمون میں دیکھا جاسکتا ہے۔ میر مہدی بخرواح کے دو بند درج کیے جاتے ہیں:

کیوں نہ دیران ہو دیارِ سخن  
مرگیا آج تاجِ دارِ سخن  
بلبلِ غزلِ تراشِ مستی  
گلِ رنگین و شاخِ سارِ سخن  
نخلِ بہرِ حدیقہ مضمون  
تازگی بخشِ لالہ دارِ سخن  
عمرے نظم کیوں نہ ہو دیران  
ہے عنائِ سخن وہ شہسوارِ سخن  
کیوں نہ حرفوں کا ہو لباسِ سیاہ  
ہے علمِ مرگِ شہرِ دارِ سخن  
ساتھ ان کے گئی سخنِ سخی  
ان کا مردہ ہی ہے مزارِ سخن

آبیاری تھی جس سے وہ نہ رہا  
اب فزاں ہو گئی بہارِ سخن  
نغمہ جیرائیاں کہاں وہی  
اب یہ ہے نالہ ہائے زارِ سخن

دعایِ مرثیہ و غزلِ غالبِ مُرد  
اسد اللہ خاں غالبِ مُرد

تھے نکھای سے ظلم میں ہمسر  
فوق تھا نثر میں قصوری پر  
اس کا جانی کوئی نہ اس کا نظیر  
ایک سے ایک ہے فرض بہتر  
کون تسکینِ فزائے خاطر ہو  
نخت بے چمن ہے دلِ حشر  
پار کرتے ہیں صبر کی تھیں  
ظلم ہے جانِ ناخلیبا پر  
آپ کے پاؤں تو نہ چلے تھے  
ٹپے یہ راہِ وصال کی کہیں کر  
آتشِ فہم کی ہے بھڑک اسی  
کام آئے نہ اپنے دیدارِ تر  
اب تو دیدار کو دکھا دیجیے  
میرے بالوں سے ہے پامعشر  
کون سنتا ہے اب کسی کی بات  
آج کل تو یہ شور ہے گھر گھر

دعایِ مرثیہ و غزلِ غالبِ مُرد  
اسد اللہ خاں غالبِ مُرد



در زمانہ ننگلی سہی  
گفت آلِ محسنِ تاریخ  
رہک جای و عالی سہی = ۱۲۸۵ ہجری  
(کتاب ”دیوانی تاریخ“ ص ۷۱، سید آل محمد پکرای مارہروی)

خیر شکوہ آبادی (”خیالاتِ منیر“ ص ۵۱، مطبوعہ ۱۲۹۰ ہجری)

آں غالبِ دہلوی حکیمِ دہراں  
سلطانِ سخنِ غلامِ آلِ یاسین  
در نظم و زبانِ قاری نای دہر  
در نثر پہ مسوہ افادات کہیں  
برداشتہ رخت ازیں سراے کافی  
یارب برسانیش ہنردہی بریں  
دنیا ست سے بدیدہ اہلِ سخن  
در برجِ لہ چو رفت آں سرِ مہیں  
تاریخِ وقایع او چنیں گفت منیر  
آہ افسحِ عصر و حیفِ جلیِ حزن

مرزا حاتم علی منیر (”خیالاتِ منیر“ مطبوعہ ۱۲۸۷ ہجری، ص ۳۹۰)

شاعرِ دہ خضودِ غفار  
لئے الحمدِ گرامیِ آہ  
گفت ہاتھ پہ تاریخِ اے سر  
جہاں غالبِ نایِ آہ = ۱۲۸۵ ہجری

مولوی عبدالغفور نساج (”کنجِ قوارخ“ مطبوعہ ۱۸۷۵ء، ص ۴۹)



کیوں کر نہ ہو الم دل پہ درو کو برے  
غالب کے غم میں کرتی ہے سب غلطی ہے  
تسلی سال فوت کی مجھ کو ہوئی جو فکر

پولی خرد، دو شبہ ذیقعد واسے واسے = ۱۲۸۵ھ

ذیل میں میر مہدی بھرتیج کا وہ مضمون درج کیا جاتا ہے جو غالب کے انتقال کے فوراً بعد ۱۷ فروری ۱۸۶۹ء کو ”اکمل الاخبار“ دہلی میں شائع ہوا تھا۔<sup>۲۷۵</sup>

”مظہر حق و رعب طالب مُرد“

اسد اللہ خان غالب مُرد

فہاں اس زمانہ غدار ہے، آہ روزگار ناخوار ہے، ہر روز نیا نیرنگ  
دکھاتا ہے۔ ہر دم دام غم و الم میں پھنساتا ہے۔ اس خیلِ آفت کی  
موج بلاخیز ہے۔ اس دانی بول ناک کی ہوا فتنہ انگیز ہے۔ اس  
کا آبِ سراپ، اس کی بنیاد خراب، اس کی راحت جزوِ جراحت،  
اس کی راحت سرمایہ دو صد آفت، اس کی شکر ذہر آلود، اس کی  
امید آرزو فرسود۔ ہر روز نکل حیات کو صرصر مہمات سے گراتا ہے۔  
ہر دم مٹل سرود سے صدائے ماتم اٹھاتا ہے، کبھی پد کو فراقی پسر  
سے خوں رلاتا ہے۔ کبھی بھائی سے بھائی کو چھڑاتا ہے۔

ہر مگن زمیں میں دام فریب نہیں ہے۔ ہر خوش لذت میں عشق  
صحت پنہاں۔ خزاں سے تو ام فصل بہار ہے۔ روز روشن کے  
ساتھ ہی شب تار ہے۔ مالِ خندہ شادی گریے غم ہے اور شہدِ بیش،  
صد گونہ الم۔ جناب ابھی نمودار ہوا۔ ابھی کچھ نہ تھا، پھول ادھر کھلا  
ادھر گر پڑا، لالہ لباسِ رنگیں میں بھی داغ دل پر رکھتا ہے۔ فنج  
غول بکر سے پردوش ہوتا ہے۔ بلبل، نوحہ کر جتنی ہے اور مرغ

سحر خواں اسیرِ محن:

دو دین زمانہ بہار و خزاں ہم آغوش است  
زمانہ جام بدست و جنازہ پر دوش است  
وہے ہم گراں خوابانِ غفلت پر کہ اس ریشہ عمر پر تارِ شکست سے  
زورِ غسل ہے۔ اس کے بھروسے پر کیا کیا طول اہل ہے:  
از اس سرِ آمد اس کا رخ دلاؤین  
کہ جا تا گرم کردہ گوشتِ خیر  
اس ناپود کو پود، بجیم کو ضیم، دمن کو چمن، گلشن کو گلشن، خواب کو  
بیداری، غفلت کو ہوشیاری جانتے ہیں اور اس قدرِ بادۂ غفلت  
سے مست و لاجعل ہیں کہ حق کو باطل سے نہیں پہچانتے۔ کیا  
عجب اگر آسمان وہ بے آزار ہے۔ بھلا اس سے کیا توقعِ آسودگی  
جس کا خود گردش پر ہمار ہے۔

دیکھو، بیٹھے بٹھائے کیا آفتِ اٹھائی ہے۔ کس منکبِ روزگار کی  
جدا کی دکھائی ہے۔ نکل برونہ صافی کو ہاؤزانی سے گرایا۔ سحر  
سحر خدائی کو خاک میں ملایا۔ جو خسرو کے بعد ملکِ حق کا...  
خسرو مالکِ رقاب تھا۔ اس کا نامِ عمر طے ہوا۔ جو میدانِ سنخوری  
کا شہ سوارِ ہلالِ رکاب تھا۔ اس کا رخسِ زندگی بے ہوا۔

ان حضرت کی کن کن خوبیوں کا بیان کیا جائے۔ دریا کوزے میں  
کیوں کر بہائے۔ حسنِ خلق میں اخلاق کی کتاب، عظیم الاقطاعی میں  
لاجواب، خوبیِ تحریر میں بے نظیر، صافی ضمیر، جاودہ تقریر، فارسی  
زبان میں لاجائی، ”اردوے مطعے“ کے بانی۔ انہوں جس کا شہباز  
خیال طالعِ صدقہ شکار ہو وہ پتھرِ کربِ اجل میں گرفتار ہو۔ صد  
حیف اس سادہ آمارے سنخوری کو تھتھے پر لٹائیں۔ ہاے اس رنگیں

خُن کو سفید کفن پہنائیں۔ جو ایک دم فراقِ لہجہ کی تاب نہ لائے  
اس کو یوں تنہا قبر میں چھوڑ آئے۔

اس غم میں سب کی حالت تباہ کی ہے۔ روز بھی اس مصیبت میں  
سیا ہے۔ اس روز کو روزِ فشر کہوں مگر کیا کہوں۔ سنتے ہیں کہ  
قیامت میں چھڑے ہوئے لمبے کے، ملاقاتیں کریں گے۔ یہ کیسی  
قیامت آئی ہے، جس میں ایسے شفیق نے ہدائی ہے۔ دل ہے  
پتھر نہیں، اس صدمہ جانکاہ سے کیوں کر نہ گھبرائے۔ چشم ہے فواد  
نہیں، کیوں کر اشک نہ بہائے۔ جس کا سینہ فشر دار ہو اس کے  
لب پر کیوں کر نہ آہ شرابار ہو۔ جس کا جگر خنجرِ غم سے نگار ہو وہ  
کیوں کر نہ بے قرار ہو۔ جس کی جان میں کادش پنہاں ہو، وہ  
کیوں کر نہ تالاں ہو، جس کے دل میں غم جاںِ غسل دشنہ چھن ہو  
اس کا کیوں کر نہ خونچکاں خُن ہو، قلم بھی میری طرح سینہ چاک  
ہے اور دیدہ دوات گریہ تاک۔ اب توضیحِ احوال و تفصیل  
مقال ہے۔

واضح ہو کہ جنابِ مرحوم دو تین مہینے صاحبِ فرائض رہے۔ ضعف و  
نقاہت کے صدمے سبب آٹھ دن انتقال سے پہلے کھانا پینا ترک  
فرمایا۔ اس دنیاے فانی سے بالکل دل اٹھایا تا آنکہ ۱۵ فروردی  
۱۸۶۹ء مطابق ۲ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ روزِ دوشنبہ کو دوپہر ڈھلے میر  
فلک کے ساتھ ہی اس غورشیوِ اویجِ فضل و کمال کو زوال ہوا، یعنی  
اس سچھی سراسے بے بنیاد سے عدمِ آباد کی طرف کوچ کیا۔ نہ غرغری  
نزع کی تکلیف پائی، نہ کشاکشِ جان کنی کی مصیبت اٹھائی۔

سب عملیہ شہرِ حیدر دلی دروازہ نماز جنازہ میں شریک ہوئے۔  
بعد نماز کے حضرت سلطان نظام الدین قدس اللہ سرہ کی درگاہ

میں پہنچایا اور اس گنج معانی کو جو خاک چھپایا۔ اس بھروسہ دل  
انکار نے یہ حال سراپا طال اس لیے درج اعتبار کیا تاکہ اس قد و  
شعر کے بھائی ہامنا حضرت مخدوم کے مستزنی رحمت ہونے کی خبر  
پائیں اور جہنم بزم سے لکب حرمت بہائیں۔

### قطعہ تاریخ

کل مرید استاد پہ افراط الم میں  
ہاتف نے جو بیٹھے ہوئے دیکھا مجھے غم ناک  
یلا، ہے اگر فکر میں تاریخ کی، بھروسہ  
کہ دے نہ سکی ”گنج معانی ہے حیرت خاک“<sup>۲۸۵۵</sup>

### حوالے اور حواشی

- ۱۵۱۔ ”اردوئے معلّے“، مطبع مہتابی، دہلی، ۱۸۹۹ء، صفحہ ۳۶، ”معلوٰۃ غالب“، جلد اول،  
مرتبہ: مولوی بخش پرستار۔
- ۱۵۲۔ ”دہلی کا آخری سال“، ص ۲۷۷، غولبر حسن نگاری۔
- ۱۵۳۔ ”شیخ آجکے“، صفحہ ۳۸۸، مطبع دوم۔
- ۱۵۴۔ ”اردوئے معلّے“، ص ۱۱۱۔
- ۱۵۵۔ ایضاً، ص ۷۷۔
- ۱۵۶۔ ”معلوٰۃ غالب“، ص ۳۵۔
- ۱۵۷۔ ”اردوئے معلّے“، ص ۹۔
- ۱۵۸۔ ایضاً، ص ۳۹۔
- ۱۵۹۔ ”معلوٰۃ غالب“، ص ۱۲۲۔
- ۱۶۰۔ ”اردوئے معلّے“، ص ۳۹۔
- ۱۶۱۔ قدر نگاری۔ غالب سے ان کی بڑی ماہ و رسم تھی۔ ان کا انتقال ۱۳۳۷ھ (۱۸۸۳ء) میں ہوا۔

مرزا علی غالب نے تاریخِ دولت لکھی۔ ("دیپنی غالب"، ص ۱۵۱، مطبعِ بنگالی، کھوسو، ۱۸۸۵ء)۔

ہم انقلابِ صریحہ قدر  
سنا کے رنج و الم ہوا غالب  
کئی تاریخِ سالِ دولت کی  
"قدر نے آہ کی فضا" غالب

- ☆۱۳۔ "مطلوبِ غالب"، ص ۱۹۵۔  
☆۱۴۔ ایضاً، ص ۱۹۵۔  
☆۱۵۔ ایضاً، ص ۱۹۴۔  
☆۱۶۔ "آمدے سطلے"، ص ۸۔  
☆۱۷۔ "مکاسبِ غالب"، ص ۵۶، مرقہ: اختیار علی خاں مرثیہ۔  
☆۱۸۔ "آمدے سطلے"، ص ۲۴۔  
☆۱۹۔ ایضاً، ص ۱۸۵۔  
☆۲۰۔ "مطلوبِ غالب"، ص ۱۲۱۔  
☆۲۱۔ "آمدے سطلے"، ص ۲۲۲۔  
☆۲۲۔ ایضاً، ص ۲۵۔  
☆۲۳۔ ایضاً، ص ۲۲۔  
☆۲۴۔ ایضاً، ص ۲۔  
☆۲۵۔ ہے آخر کے بارے میں غلط فہمی "غالب اور شاہانِ اودھ"۔  
☆۲۶۔ "آمدے سطلے"، ص ۲۰۹۔  
☆۲۷۔ "موردِ بھری"، ص ۱۶۱۔  
☆۲۸۔ "مطلوبِ غالب"، ص ۲۶۴۔  
☆۲۹۔ "آمدے سطلے"، ص ۲۶۸۔  
☆۳۰۔ ہمارے گھر کے لیے دیکھو "غالب اور شاہانِ اودھ"۔  
☆۳۱۔ "پانکارِ غالب"، ص ۸۸۔  
☆۳۲۔ غالب اپنے کوسرہی الخشب" کہتے تھے۔  
☆۳۳۔ "آمدے سطلے"، ص ۱۴۶۔  
☆۳۴۔ "مطلوبِ غالب"، ص ۱۲۸۔  
☆۳۵۔ "کنجِ قریح"، ص ۴۰، مطبوعہ دکن پور، کھوسو، ۱۸۷۵ء۔  
☆۳۶۔ "پانکارِ غالب"، ص ۸۹۔  
☆۳۷۔ "مختصری"، ص ۱۱۰۔ غالب فرماتا ہے:، پایتِ فردی ۱۹۶۹ء، ص ۶۷، مضمون نگار سید حسین الرحمن۔  
☆۳۸۔ مجروح کے دیپنی (مطبوعہ اقبال) ص ۲۳، مطبوعہ ۱۸۹۹ء میں یہ قصہ اختلاف کے ساتھ پہلی بار شائع ہوا۔

کل صورت و اہلی میں نہیں پا رہی گزراں  
فنا تہجہِ اوجہ پہ بیٹھا ہوا غم ناک

مرزا غالب کے آخری ایام

دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی بحریت  
جانب سے کہا، "کچھ معافی ہے یہ خاک"

غالب کے کوہِ حجاز پر بھی بحریت کا ہی فلسفہ کندہ ہے۔ لیکن پہلے مصرع کو اس طرح بدل دیا گیا ہے۔  
 گل میں تم و اعداء میں باخاطر عیوں



☆ مصرع اصل میں ایسا ہے:  
 رقبہِ عراق و بحرِ غالبِ فرد (adab)



# غالب کا مزار بے توجہی کا شکار

غالب نے اپنے ہم وطنوں کی سرد مہری اور بے مروتی کے بارے میں ٹیٹھ کوئی کی تھی:

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب

تم کو بے مہری یا رانا وطن یاد نہیں

ہم ہندوستانوں میں ایک بڑا صیب یہ ہے کہ اپنے اسلاف کے سرمائے کی قدر نہیں کرتے۔ برعکس اس کے کہ اہل مغرب اپنے بزرگوں کی معمولی سے معمولی شے کو بھی حیرت کچھ کر یا نگار کے طود پر محفوظ رکھتے ہیں۔ شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم کی بڑی ہمشیرہ شہنشاہ جرمنی کی والدہ تھیں۔ ان کی وفات کے بعد ان کی بتائی ہوئی تصویروں کی قیمت ایک ایک کروڑ روپیہ قرار پائی۔ اسی طرح انگلستان کے جادوویاں شاعر کاؤچر کے خطوط پچاس یا ساٹھ لاکھ میں بیلام ہوئے۔ ولایت میں ایک ریڈی ٹکٹ شروع زمانے کا کسی غریب کو مل گیا۔ اخباروں اور رسالوں میں عرصے تک اسی کے حلقہ مضامین شائع ہوتے رہے۔ ایک دیکھنے نے اس کو اتنی بڑی رقم دے کر سول لیا کہ تین شہینہ کو جناح مزدور پٹھانپشت کے لیے امیر بن گیا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے ایسا بے نظیر اور

عالم کا حرار ہے تو تھی کا حرار

نادر و کم یاب چیزیں دیکھی ہیں جن کی قیمت کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا۔ یہ نادر یا تو  
 رنگ خوردہ صندوقوں میں لاوارث قیدیوں کی طرح کسی جرم بے گناہی کی پاداش میں  
 دم توڑ رہے ہیں یا غفلت سے ضائع کر دیے جاتے ہیں۔ ایسوس اس بات پر ہورہا ہے  
 کہ ہماری عدم توجہی کی وجہ سے ہماری ٹیش بہا نشانیاں اور قیمتی سرمایہ انگلستان پہنچ کر  
 لندن میوزیم کی غدر ہو گیا ہے۔ ہماری بے ذوقی پر اقبال کو بھی خون کے آنسو  
 بہانے پڑے:

مکھو دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی  
 شہتا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا  
 مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی  
 جو دیکھیں ان کو پردہ میں تو دل ہوتا ہے سپہا

ہم نے ان لوگوں کو بھی نہیں بخشا جو ہندوستانی شعر و ادب کے تاج میں کوہ  
 نور کی طرح جگمگاتے تھے۔ ہم نے ان کی آخری آرام گاہوں کو مٹتے ہوئے دیکھا ہے  
 اور اسے سخت دل اور خود غرض ہیں کہ پھر بھی کوئی عبرت حاصل نہیں کرتے۔

اردو ادب کے سر تاج شاعر مرزا غالب، خاتمی ہند استاد ذوقی اور عاشق  
 مزاج حکیم مومن خاں مومن کو کون نہیں جانتا۔ تینوں نے زمین شعر کو آسمان بنا دیا۔ ان  
 کے دیران شدہ حزار ہمارے لیے عبرت کا تازیانہ ہیں۔ مومن کی قبر کا کہیں نام و نشان  
 نہیں مل رہا۔ ذوقی کے بارے میں ان کے شاگرد رشید مولانا محمد حسین آزاد کے یہ  
 خوب صورت الفاظ اب تک ”آب حیات“ میں موجود ہیں:

جب وہ صاحب کمال، عالم ادراج سے کشور اجسام کی طرف چلا،  
 تو نصاحت کے فرشتوں نے بارغ قدس کے پہلوں کا تاج پہلایا،  
 جس کی خوشبو شہرت عام بن کر جہان میں پھیلی اور رنگ نے  
 بھائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی۔ وہ تاج سر پر رکھا گیا تو  
 آب حیات اس پر ختم ہو کر برسا کہ شادابی کو کلاہٹ کا



اثر نہ پہنچے۔

آج سے پورے نوے سال پہلے دہلی کی قبر کی مرمت ایک ہاتھ اور دھواڑ  
نے کرائی تھی۔ مرمت کے بعد حراز پر قوالی کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ اب ہماری بے بسی  
کے باعث قبر کی حالت ایسی ناگفتہ بہ ہے کہ بیان کرتے شرم آتی ہے۔

موتوں اور دہلی کے بعد عالم کا انتقال فروری ۱۸۶۹ء میں ہوا۔ ان کے  
شاگرد میر بھروسہ نے تاریخ کبھی جو لوح حراز پر اس طرح کندہ تھی:

دھکب عرقی و لعل عالم نرد  
اسد اللہ خان عالم نرد  
کل میں غم و اندوہ میں ہا خاطر عروں  
تھا تربت استاد پہ بیضا ہوا غم ناک  
دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی بھروسہ  
ہاتف نے کہا، ”گنج معانی ہے تو خاک“

(۱۲۸۵ھ) (۱۸۶۹ء)

”تغزل“ لاہور، صفحہ ۵۹، بابت مارچ ۱۹۰۷ء، میں ”شعرا کے حراز“ کے عنوان  
سے لکھا ہے:

مرزا عالم کی عین قبر پر پاس والی احاطے کی دیوار، تھوڑے دن  
ہوئے، گر پڑی اور قبر تمام اس کے نیچے دب گئی۔ لوح حراز کو،  
جس پر بھروسہ کی کبھی ہوئی تاریخ کندہ ہے، تعجب کی بات ہے  
کہ کوئی صدمہ نہیں پہنچا، ورنہ یہ پتھر سب سفید بہت پتلا ہے۔  
اگر دیوار کا کوئی بھاری پتھر اس پر آکر پڑتا تو یہ ضرور ٹوٹ جاتا۔  
اس قبر کو اوپر سے صاف کرنا کے دوبارہ احاطے کی دیوار کو بنوا  
دینا بہت ضروری ہے ورنہ رفتہ رفتہ حالت ابتر ہوتی جائے گی۔

کچھ عرصے کے بعد، غالباً ۱۹۱۰ء میں، حراز عالم کی لوح ٹوٹ گئی، اس کے

غالب کا حرار ہے تو حق کا حرار

باوجود جوڑ کر دوبارہ نصب کی گئی۔ اس کا قوفو میں نے کسی رسالے میں دیکھا تھا۔ اس دوران اردو کے مشہور ادیب، شاعر اور صحافی پیارے لال شاہ کر<sup>۱۵</sup> (متوفی ۱۹۵۶ء)، ششی گویت رائے نظر کے بعد، جون ۱۹۱۱ء میں ”ادیب“ الہ آباد ہندوستانی لیٹریٹ کے ایڈیٹر ہوئے۔ وہ اردو کے عاشق اور غالب کے دل دادہ تھے۔ انھوں ہی نے حرار غالب کی پتا کا ڈول ڈالا تھا۔ موصوف نے غالب کلب، غالب ہال اور روضۂ غالب کی تعمیر وغیرہ کے لیے ”غالب میموریل فنڈ“ قائم کیا، لیکن کسی نے ان کے ساتھ تعاون نہیں کیا۔ وہ نہایت بے لوث اور مخلص شخص تھے۔ لوگوں سے ایچلوں پر اپیلیں کرتے رہے لیکن بے سود۔ ”ادیب“ الہ آباد میں اپنی تحریر ”غالب“ کے عنوان سے لکھتے ہیں:

غالب نے اردو نظم و نثر پر جو احسانات کیے ہیں ان سے اہل  
یورپ کو روشناس کرانے کی اشد ضرورت تھی۔ ہمیں مسٹر صلاح  
الدین خدا بخش ایم اے بی سی ایل کا ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں  
نے انگریزی میں ایک کتاب غالب کے حلق شائع کر کے ایک  
بڑی علمی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کتاب ولایت میں بھیجی ہے  
اور اس میں غالب کی اردو قاری شاعری پر مبسوط بحث کے علاوہ  
ان کے سوانح کا بھی ذکر نہایت دلچسپی سے کیا ہے۔ (”ادیب“  
جولائی اگست ۱۹۱۳ء)

اس سے ایک سال قبل انھوں نے ”غالب“ کے عنوان سے ایک حیرت انگیز  
اپیل شائع کی تھی۔ لکھتے ہیں:

اردو لٹریچر کو جس قدر ترقی غالب مرحوم کی بدولت ہوئی ہے وہ  
شاید کسی اور بزرگ سے نہیں ہوئی ہوگی۔ اسی غالب کا حرار اب  
انکی کس مہری کی حالت میں ہے کہ اسے دیکھ کر غیر ملک کے  
رہنے والوں کو حسرت ہوتی ہے۔ چنانچہ ”پانچمز“ (Poincaré)  
کے ایک نامہ نگار ڈاکٹر ہارٹن نے ایک مراسلے میں لکھا تھا:

اب کے جو میرا دہلی جانا ہوا تو شاہ نظام الدین اولیا کے اماں کے باہر ایک خام نے مجھے ایک قبر دکھائی۔ پھر اس کے پاس لے جا کر کہنے لگا کہ یہ غالب کی قبر ہے (آما دہن غالب جس کا یہ شعر ہے:

غالب نام آورم، نام و نظام میری

ہم اسما للہم، ہم اسما للہم

ٹوٹی ہوئی قبر جس کے سر حالے سبک مرمر پر کتبہ اور اس کی بھی وہ حالت کہ عیاذ باللہ بھی معلوم دیتا تھا کہ وہ ایک برساتوں کے بعد یہ بھی قبر کے ساتھ مل کے بڑھ چکا ہو رہے گا اور اس کے ساتھ زبان اردو کا ایک سر بلند علم سرگرم ہو کر مٹی میں ایسا ملے گا کہ اس کا نشان تک نظر نہ آئے گا۔ تو کیا مجھے اس امر کا حق ہے کہ کلام غالب کے دل دادگان پر استغاثہ کروں؟ مؤرخ، مصنف، شاعر، جس قوم میں ہوں وہ اس قوم کے پیش بہا جواہر ہوتے ہیں یہ مال ضائع نہیں کرتے بلکہ جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ ان کی قبریں نہیں بلکہ پیش قیمت خزانوں کے دھننے ہیں۔ ان حرکات کی کچھ قیمت نہیں۔ یہ ان مول رتن ہیں۔ ان مقدس تربتوں کو برباد ہونے دینا گناہ ہے اور گناہ کے ساتھ قصیر جو آنے والی سطیوں کی معاف نہ کریں گی۔ میری خواہش ہے کہ یہ تربت برباد نہ ہونے پائے۔ میری یہ تمنا ہے کہ یہ مرقہ باقی رہے۔ میری یہ آرزو ہے کہ یہ ڈمیر قائم رہے۔ اس لیے میں تجویز کرتا ہوں کہ زیادہ نہیں تو ایک ایک بدوے کا عام چندہ ہو اور پھر دو تین ہزار میں ایک مضبوط چھوٹی سی عمارت بنا کر مرنے

والے کا زعمہ نشان قائم کیا جائے۔

مستردہٴ ہالا سطور کو ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیے۔ یہ ایک یورپین ڈاکٹر کے الفاظ ہیں۔ جو نہیں کھائے ہوئے دل پر حیر و شہر کا کام کرتے ہیں۔ وہ غالب کو قوم کا جیش قیمت مال بتاتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ اس قبر کو برباد ہونے دینا ایسا گناہ اور تقصیر ہے کہ آنے والی نسلیں اس کو معاف نہ کریں گی۔ اس کے یہی معنی ہیں کہ آئندہ نسلیں اس مقدس تربت کو ترکے میں پانے والی ہیں۔ اس ترکے میں اصراف کرنے کا موجودہ نسلوں کو کوئی حق نہیں۔ یہ امانت ہے اور امانت بھی ایسی جو ایک نسل سے دوسری نسل کو پہنچی چاہیے۔ آنے والی نسلیں جب غالب مرحوم کے حرار کی جھجھکیں گی اور اس کا پتا یا نشان پانے کے لیے اس قسم کی تکلیف کا سامنا ہوا جو آج کل کے ماہرینِ علم آثارِ اسلامیہ کو تابہت سیکہ کے دریافت کرنے میں ہوئی، تو کیا کہیں گی؟ یاد رکھو کہ یہ جرم نہ معافی کے قابل ہوگا نہ عفو کے لائق۔ آدا مرنے والے نے اپنی زندگی ہی میں کہہ دیا تھا:

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا

نہ کبھی جنازہ افتاء نہ کہیں حرار ہوتا

وہ دن ابھی دور ہے کہ ہمارے ہندوستان میں کوئی غالب کلب یا غالب ہال قائم کیا جائے، مگر کیا ہم اس دہچہ پست جنت اور ایسی لمبیاں طلی غفلت میں مبتلا رہیں گے کہ غالب ایسے زعمہ جاوید شاعر کی مٹی مثالی قبر کو بربادی سے نہ بچائیں اور اس کے رہے سے نشان کو ابد الابد تک قائم رکھنے میں دریغ کریں۔ افسوس:

کرتے کس صو سے ہو غربت کی شکایت غالب

حم کو بے مہری پارانا وطن یاد نہیں

”ادیب“ کے اجرا کا سب سے بڑا مقصد ملک میں لٹریچر مذاق پیدا کرنا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ہماری کوشش سے عالم کی قبر برداری سے نکال جائے تو یہ ہماری سب سے اعلیٰ خدمت ہوگی۔ لہذا ہم اس مہینے سے عالم میسوریل فٹ (چند یادگار عالم) کھولتے ہیں اور شیدائیان کلام عالم سے استمداد کرتے ہیں کہ وہ خود بھی اس مفید تحریک میں حصہ لیں اور اپنے اصحاب کو بھی اس طرف رجوع کریں۔ جو کچھ بھی ارسال ہوگا، شکریے کے ساتھ قبول کیا جائے گا۔ ہاں، یہ بتادینا بھی ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ”عالم میسوریل فٹ“ میں جو روپیہ فراہم ہوگا، اس کا بے جا استعمال نہ کیا جائے گا۔ ”کاسریٹ“ کے قاتل ایڈیٹر مسٹر محمد علی (جوہر) بی اے تحفہ افراجات تیار کر رہے ہیں اور انہوں نے اپنے اخبار میں فٹ کھولا ہے۔ کافی روپیہ فراہم ہونے پر ایک مستقل یادگاری روضہ تعمیر کیا جائے گا۔ ممکن ہے کہ روپیہ کی فراہمی تک جناب مولوی حسن نظامی صاحب بلاو اسلامپور کی سیاحت سے واپس آجائیں اور روضہ عالم کی تعمیر انہی کی نگرانی میں ہو۔

(ایڈیٹر ”ادیب“، اگست ۱۹۱۱ء)

بیارے لال شاکر نے جنوری ۱۹۱۳ء میں ”ادیب“ اور آباد کی ایڈیٹری سے قطع تعلق کیا اور لکھنؤ سے مارچ ۱۹۱۳ء میں اپنا رسالہ ”انصر“ کے نام سے جاری کیا۔ اس کی جلد ۳، نمبر ۳، پایت ۱۹۱۳ء میں انہوں نے اردو والوں کو پھر احساس دلایا کہ وہ حراز عالم کے لیے اقدام کریں۔ ”حراز عالم“ کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں: ”انصر“ کے اس نمبر میں جناب عظیم دہلوی کی ایک نظم درج کی جاتی ہے جس میں حراز عالم کی حلیہ زار بیان کر کے پبلک

سے انجیل کی گئی ہے کہ وہ اس کو کم نای کے ہاتھوں سے  
 بچائیں۔ دہلی کے چند خاص حضرات اس کے حلقہ کوشش  
 فرما رہے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ معاونین ”احمر“ بھی اس  
 کار خیر میں حصہ لیں۔ چار برس ہوئے مسز محمد علی نے ”ہمدرد“  
 میں ایک انجیل شائع کی تھی اور پبلک نے اس تجویز کو نہایت پسند  
 کیا تھا۔ چنانچہ ایک معقول رقم جمع بھی ہوئی تھی۔ جس کی رسید  
 ”ہمدرد“ میں چھپی تھی۔ خود ہم نے بھی ”اویب“ مرحوم میں غالب  
 سمور مل فز کھولا تھا اور ایک خاص رقم اس سلسلے میں وصول ہوئی  
 تھی۔ جب ہم نے ”اویب“ سے قطع حلقہ کیا تو وہ رقم بھی  
 اٹرین پریس کے حوالے کر دی۔ اس کے بعد ہم نے دو تین دفعہ  
 مسز محمد علی کو تحریر کیا کہ اگر کام شروع کرنے کا ارادہ ہو تو یہ روپیہ  
 منگالیا جائے مگر ان کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ چون کہ حکیم  
 محمد اجمل خاں اور خواجہ حسن نظامی ایسے افراد اس تحریک میں  
 شریک ہیں لہذا پبلک کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ ان کا حلیہ رانگیاں  
 نہ جائے گا۔ ”اویب“ کے ذریعہ سے جو رقم فراہم ہوئی تھی وہ  
 اس کام کے لیے اٹرین پریس سے ہر وقت مل سکتی ہے۔ نہیں  
 معلوم مسز محمد علی کے جمع کردہ چندے کا کیا حشر ہوا۔ جو حضرات  
 اس کار خیر میں حصہ لیتا چاہیں وہ اپنے عطیات حکیم محمد اجمل  
 خاں صاحب کے نام پر دہلی کے پتے پر ارسال فرمائیں۔

”احمر“ کے اس شمارے میں خلیق دہلوی کی نظم بعنوان ”حرام عالم“ درج

ہے اس میں ۱۳ بند ہیں چون کہ نظم فکر انگیز ہے اس لیے چند بند درج کیے جاتے ہیں:

ہیں مہربان میرے خواجہ حسن نظامی

جن کی ہے ذات اقدس دعدانیت کی حامی

مضمون نگاروں سے ہیں دور دور نای  
جھڑتے ہیں پھول منہ سے صدقے میں خوش بیانی

☆

درگاہ میں ہے رونق فیضی قدم سے ان کے  
اوصاف کیا بیاں ہوں میرے قلم سے ان کے

☆

ملنے کا شوق ان سے دل میں ہوا زیادہ  
درگاہ اولیا کا میں نے کیا ارادہ  
محبت کا لطف آیا، پایا حراج سادہ  
تقریف کر رہا تھا ہر ایک ہی زادہ

☆

درگاہ دیکھنے کو بے تاب ہو رہے تھے  
سیماب بھی وہیں پر سیماب ہو رہے تھے

☆

جب میر کرنے لگے، دیکھا حور عالم  
رہ زمیں نہاں تھی فعلی بہار عالم  
یاد آرہا تھا سب کو وہ انگار عالم  
نظروں میں پھر رہا تھا حور و وقار عالم

☆

حسرت برس رہی تھی رونق تھی خوش بیانی  
اردو لہ کے اوپر کرتی تھی نوحہ خوانی

☆

سب حور بالکل نرہ ہوا پرانا  
پھایا تھا آسانی تربت پہ شامیہ

عالم کی صحبتوں کا یاد آگیا زمانہ  
وہ نظم عارفانہ، مضمون عاشقانہ

☆

ہر بات میں عرافت، ہر شعر میں لطافت  
پایہ وضع داری، دل دادہ شرافت

☆

عالم کی یاد دل میں پھر پھر کے آ رہی تھی  
دنیا کی بے ثباتی آنکھوں میں چھا رہی تھی  
حسرت نکل نکل کے آنسو بہا رہی تھی  
دور زمان کی گردش نقشہ مٹا رہی تھی

☆

مٹی کا، میرزا کو گھر یاد کر رہا تھا  
تربت کا ذرہ ذرہ فریاد کر رہا تھا

☆

انہوں زندگی ہے بے اعتبار کیسی  
ہر چیز دھنسی ہے ناپائیدار کیسی  
جاتی ہے بوٹوں سے فصل بہار کیسی  
تھکیں نہاں ہوئی ہیں زیرِ حرار کیسی

☆

بزمِ سخن کی زینت، روح و روانِ دلی  
مٹ جائے اس طرح سے نام و نشانِ دلی

☆

انہوں، قبر اس کی ٹوٹی ہوئی پڑی ہے  
ہوسیدہ ہو گئی ہے، پھوٹی ہوئی پڑی ہے



دسپ فلک سے ہانکل لوٹی ہوئی پڑی ہے  
بے غور ہے، نظر سے چھوٹی ہوئی پڑی ہے  
شعنے کو ہو رہی ہے، عالم کی یاد ساری  
شعر و سخن لہہ پر کرتے ہیں آہ و زاری

☆

عالم کے قدر دانوں اس قبر کو بنا دو  
ٹوٹا ہوا پڑا ہے سبک لہہ، جہا دو  
یہ یاد رفتگاں ہے، جو حق نے ہے دیا، دو  
جیسا جو ایک دے گا، دے گا اُسے خدا دو

☆

جہا ہم زبان میرے خوبہ حسن نظامی  
دل سے ہوئے ہیں جالب <sup>۲۵۵</sup> اس کے طبع حای

نکاحی بدایونی (۱۹۳۷ء-۱۹۳۷ء) نے دیوان عالم کا ایک خوب صورت ایڈیشن  
مع تصویر عالم ۱۹۱۵ء میں نکاحی پریس بدایوں سے شائع کیا۔ جب انھیں ہزار عالم  
کی شکستہ حالت کا احساس ہوا تو انھوں نے چندے کی انیل کی جو ”الناظر“ لکھو بابت  
ستمبر ۱۹۲۶ء (ص ۵۶) میں شائع ہوئی تھی۔ یہ انیل ”مرزا عالم کے ہزار کی مرستہ“  
کے عنوان کے تحت ان الفاظ میں کی گئی تھی:

میں اپنی طرف سے اردو دیوان عالم کے خاص ایڈیشن کی بقیہ  
۳۰۰ جلدیں اسی ضروری کام کے لیے اس طریقے سے پیش کرتا  
ہوں کہ وہ تمام ادیبانِ اردو و احساس جو مرزا عالم جیسے اردو  
ادب کے محسن کی یاد کو زندہ رکھنا ضروری سمجھتے ہیں، اجازت دیں  
کہ میں اردو دیوان عالم کا خاص ایڈیشن جو پہلے خود مرزا  
مرحوم کی یادگار ہے اور جو نہایت اہتمام اور خوش سلیقگی سے عالی

جناب سید راہ مسعود صاحب کی تحریک سے شائع کیا گیا ہے،  
 سب کتابیں فروخت ہو جائیں تو کل روپیہ بعد وضع کمیشن و  
 مصارف ڈاک وغیرہ ظلیق دہلوی یا کسی دوست کے جو دہلی میں  
 مقیم ہوں سپرد کر دیا جائے تاکہ اس تاج دار سخن کے ٹوٹے ہوئے  
 حرار کی، جس کا نظارہ اہل نظر اور اہل دل کے لیے ایک عبرت  
 ناک سین کا کام دیتا ہے، مرثیت کر کے آغا سلف کی دعا و حفاظت  
 کے فرض کفایہ کو انجام دیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ حرار غالب کی مرثیت و توسیع کے لیے بہت لوگوں  
 نے سر توڑ کوششیں کی تھیں۔ ان میں پیارے لال شاہ میرٹھی، نوبت رائے کھنوی، غلیق  
 دہلوی، فکھای بدایونی اور خواجہ حسن فکھای ہمیشہ پیش پیش رہے تھے۔ جب ان کی ایہوں  
 سے کوئی اثر نہیں ہوا اور جو چندہ جمع ہوا تھا، اس کا بھی کوئی پتا نہیں چلا پھر عرصہ دراز  
 تک خواجہ صاحب نے اپنی مخلصانہ کوششیں جاری رکھی تھیں۔ انھوں نے حرار غالب کی  
 تجدیدِ تعمیر کے لیے نامیدی کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ ان کی غلام آخری  
 اپریل ”مرقد غالب“ کے عنوان کے تحت اردو کے نامور رسالے ”ہمایوں“ لاہور، بابت  
 اپریل ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اردو کے مایہ ناز محقق جناب قاضی عہدالودود صاحب  
 نے خواجہ صاحب کی اپریل کو اپنے ماہ نامے ”معیار“ پشتہ بابت مئی ۱۹۳۶ء میں خواجہ  
 صاحب کے الفاظ میں یوں شائع کیا تھا:

غالب کا حرار میری دگاہ کے قریب لب سڑک (کڈا) واقع ہے۔  
 حرار کے پائیں یعنی جنوب میں اکبر کے کوا۔ مرزا عزیز... کا  
 مقبرہ ہے۔ حرار کے غرب میں قبر سے ملی ہوئی حکیم صاحبہ حکیم  
 دامل خاں مرحوم کی دیوار ہے۔ پھر تین سو گز کا ایک قطعہ زمیں  
 ہے جس کے وارث اب موجود نہیں۔ ”غالب سوسائٹی“ کا ارادہ  
 ہے کہ شمالی دیوار کو ہٹا کر شکستہ قبرستان درست کر دیا جائے۔ اور

شمال کی طرف، سڑک کے پاس ایک شان دار دروازہ بنا دیا جائے اور جتنی زمین مرحومہ بیگم صاحبہ نے حزار کے غرب میں عطا فرمائی تھی اس کو شامل کر کے غالب کا حزار اتنا اونچا بنا دیا جائے تاکہ آسمندہ جلے اور مشاعرے حزار کے قریب ہی ہو سکیں۔ غالب کا حزار نواب صاحب لوہارو کے قبرستان میں ہے۔ اس لیے قبرستان کے وارث غالب کا حزار بنانے میں حراست کرتے ہیں۔ لہذا تجویز کی گئی ہے کہ صرف غالب کی قبر کو بنا دیا جائے۔ لوہارو والوں کو اپنے بزرگوں کا خیال ہوگا تو خود بخود ہوں گے۔

حزار غالب اب اس اصطبل کی صورت اختیار کر گیا ہے جہاں آورہ لاوارث جانور کس پھری کی حالت میں اپنے مانگوں کی لاپرواہی پر گرے کناں ہوتے ہیں۔ یہاں غلامت کے ڈیمر رہتے ہیں۔ غالب کی قبر ۱۹۵۵ء میں بنائی گئی تھی۔ اگر غالب کے پرستار غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر ۱۹۶۹ء میں وزیر اعظم شریعتی امداد کا دعویٰ سے رجوع کرتے تو مرکزی سرکار کی امداد سے قبر غالب پر ایک شاندار روضہ بنایا جاسکتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک کتب خانہ، میوزیم اور ریسرچ کرنے والوں کے لیے ایک ہال بھی تیار ہوتا جہاں ادبی جلے اور مشاعرے منعقد کیے جاتے۔ جب میں نے، ایک عرصہ ہوا، تہج غالب کی زیارت کی تو حیران و ششدر رہا کہ اتنا بڑا شاعر اور ادبی پہلوی قبر۔

۲۳ اگست ۱۹۹۶ء کو پی بی سی لندن نے ہندی اور اردو نشریے میں اس چڑکا دینے والی خبر سے دنیا کو مطلع کیا کہ بھارت کی سپریم کورٹ نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ مرزا غالب اور شیخ ابراہیم ذوق کی قبریں خستہ حالت میں ہیں اور دہلی کی انتظامیہ کی سرپرستی کی کہ کتنی شرم ناک بات ہے کہ ذوق کے حزار پر ایک عوامی پیشاب خانہ بنا دیا گیا ہے۔ کورٹ نے ہدایت دی کہ یہ مقبرے مفاد عامہ کے لیے قومی یادگار کے طور پر محفوظ رکھے جائیں۔ رٹ پٹیشن کسی اردو ادارے کی طرف سے نہیں بلکہ

عالم کا حراز ہے تو بھی ۲۵۸

ماحولیات کے مشہور وکیل ایم ایس سی سہ نے دائر کی تھی۔ سپریم کورٹ کے اس فیصلے سے اردو دنیا میں ہلچل مچ گئی اور ان لوگوں کے چہرے سے نقاب الٹ گئی جو عالم کے نام پر اردو کا استیصال کر رہے ہیں۔ اگر ترقی اردو بورڈ، عالم اکادمی، انجمن ترقی اردو، دلی اردو اکادمی، اور ملک کی دوسری اردو اکادمیاں حراز عالم کی تجدید و توسیع کے لیے ذرا بھی متوجہ ہوتیں تو حراز عالم کی شاندار تعمیرات ضروریات کے مطابق بن گئی ہوتیں۔ یہاں یہ کہنا مناسب ہے کہ راقم الحروف پہلی بار ۱۹۵۸ء میں لکھنؤ گیا تھا تو میر انیس کا مقبرہ، جو ایک کمرے میں تھا، بالکل کھنڈ ہو چکا تھا۔ خدا پروردہ مسعود حسن رضوی کو مقفرت کرے کہ انھوں نے پہلے مرحلے میں انیس کے دولت خانے کو کنوئین کی تحویل سے چھڑایا اور پھر انیس کے مقبرے کو از سر نو تعمیر کر کے اس کو ایک خوب صورت روئے میں تبدیل کیا۔ اس تعمیر کے لیے اور لوگوں کے علاوہ بخشی غلام محمد مرحوم وزیر اعظم کشمیر نے سید علی جواد زیدی کے قوتل سے مالی امداد سے نوازا تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر کلب صادق نے اس کی طرف توجہ کی اور ۱۹۹۲ء میں میر انیس انٹر نیشنل سمینار کی رسم افتتاح یہیں انجام دی تھی۔

## حواشی

۱۔ علامہ لال شاکر مشہور علمی ادکار ہیں کساری انجمن کی بانی تھیں۔ میرٹھ میں ۱۳ مارچ ۱۸۸۰ء کو پیدا ہوئے اور ۲۰ جنوری ۱۹۵۲ء کو انتقال کیا۔ پچاس گج دلی کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔ شاعری میں طاقت بھر گئی کے شاکر تھے۔ عالم کے مجلس پرستاروں میں تھے۔ لکھنؤ سے مارچ ۱۹۱۲ء میں اپنا ذاتی اردو رسالہ ”انصاف“ کے نام سے پانچ سال تک زندہ رہ کر جنوری ۱۹۱۸ء میں دم توڑ گیا۔ شاکر اچھے شاعروں میں سے تھے اور انھوں نے اردو کی انجمن خدمت انجام دی۔

۲۔ میر عالم دہلوی اردو کے مشہور ادیب، شاعر اور صحافی تھے۔ اردو کے مشہور محقق اور ناقد ڈاکٹر جمیل جالبی انجمن کے بانی ہیں۔



# دیوانِ غالب کی اولین شرح

## ”وثوقی صراحت“

پروفیسر عبدالقادر سہروردی نے اپنے ایک مضمون ”غالب کی شرحیں“ میں غالب کی اولین شرح لکھنے کا سہرا احمد حسن شوکت میرٹھی کے سر باندھا ہے۔ اس بارے میں انہوں نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ لہذا ہماری رائے میں یہ روایت معتبر نہیں ہے۔ شوکت میرٹھی نے اردو کا ایک رسالہ ”پردانہ“ کے نام سے ستمبر ۱۸۹۵ء میں میرٹھ سے جاری کیا۔ اس کے حصّہ و رسالے ہماری نظر سے گزرے ہیں۔ ”پردانہ“ کے بعد کے شماروں میں شوکت میرٹھی نے کلامِ غالب کی شرح بالاقلام شائع کی۔ اگست ۱۹۰۲ء کے شمارے میں سوسوف نے صفحہ ۲۶ میں پہلی مرتبہ اعلان کیا:

حلقِ کلیاتِ اردو مرزا غالب۔ اب یہ حل کتابی صورت میں  
 ہوو ترمیم و تکمیل چھپ کر شائع ہوا۔ اخباروں میں اس کی دعوم  
 ہے۔ پس ناظرین ”پردانہ“ بھی ایک ایک جلد ضرور منگوائیں۔  
 قیمت بھی کم ہوگئی ہے یعنی صرف ایک روپیہ۔

ہماری رائے میں دیوانِ غالب کی اولین شرح لکھنے کا شرف حیدرآباد دکن

مَا قُلْ وَدَلْ خَيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ

سبحان الله وبحمده  
أردو دیوان غالب کی شرح  
بطور تازہ و پاکیزہ مفید تھیان

جسکا تاریخ نام ہر  
و ثوق صراحت  
جسکو

دبستان منور می کے استاد کامل حضرت مولانا سرلوسی  
محمد عبدالحی المتخلص والد (رحمۃ اللہ علیہ) نے تصنیف فرمایا

باہتمام وزیر علی ہسٹرم مطبع

مطبعہ افکار نظامی افکار آباد لاہور  
محمد ناظم نظامی افکار آباد لاہور

دیوان غالب کی اولین شرح

کے ایک عالم جید اور شاعر باکمال مولوی عبدالحی تحفص والد کو حاصل ہے۔ کتاب نادر و نایاب ہے۔ اس کا ایک کھل نسخہ سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں ہمارے مطالعے میں رہا تھا۔ تفصیلات بعد میں درج کی جائیں گی۔

والد کے حالات زندگی دستیاب نہیں ہیں۔ ان کے والد بزرگوار کا نام مولوی محمد مہدی تھا۔ وہ بھی عالم و فاضل اور فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ والد انہی کے گھر میں ۱۲۳۸ ہجری (۱۸۲۳ء) میں شہر مدراس میں پیدا ہوئے۔ حیدرآباد میں پروان چڑھے۔ پھر عرصہ دارنیک نظام کالج حیدرآباد میں پروفیسر رہے اور بی۔ اے کے طلبہ کو مرزا غالب پڑھاتے رہے۔ فارسی کے ایک قادر الکلام شاعر اور زبردست شخصیت کے مالک ترک علی شاہ ترقی قندر نور محل اپنے تذکرے میں والد کے بارے میں لکھتے ہیں:

عالم محقر بود و ہا شعر فارسی خصوصیت داشت۔ مردم ایران و ہندوستان آں مجمع صفات را مسجدی دکنی گفتند۔ عرصہ بست و بہت سال می شود کہ شبے در مشاعرہ کدام نواب از دور دیدہ بودم۔ مرد معمر معلوم می شود مگر با ہم گفتگو نہ شدہ ۲۵

والد کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی کچھ کتابیں سالار جنگ میوزیم میں موجود ہیں۔ ان میں دیوان فارسی کاظمی ذکر ہے۔ یہ ۲۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں سولہ صفحوں کے دو جز شامل کیے گئے ہیں۔ ان میں سلطان العلماء و اشعرا آقا سید علی صاحب شوستری تحفص طوبی کا گرانقدر مقالہ عربی اور فارسی میں بغیر کسی عنوان کے مقدمے کے طور پر درج کیا گیا ہے۔ اس میں والد کی شعری خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔ دیوان والد مطبع فخر نظامی واقع حیدرآباد میں باہتمام وزیر علی مالک مطبع، امرزی قندہ ۱۳۱۲ ہجری (مطابق اپریل ۱۸۹۵ء) شائع ہوا۔ دیوان والد کے ساجز اسے مولوی محمد عبدالواحد تحفص واحد اور ان کے ایک عزیز محمد عبدالولی نے مرتب کیا تھا۔ سولہ میں فیض محمد خاں ریحانی نے اردو میں چارج طبع کی:

دیوان جناب والد مرحوم کا چمپا  
بج تو یہ ہے، بیان فصیح و بلیغ ہے

من کر بھی زباں سے اہل کمال کے  
تاریخ کلمہ ”زبان فصیح و بلیغ“ ہے  
(۱۸۹۳ء) ۱۳۱۱ھ

واجد نے دیوان والد کا تاریخی نام ”چشتان بہشت“ رکھا تھا۔ اس سے والد کی تاریخ وفات اور ترمیم دیوان کی تاریخ یعنی ۱۳۱۱ کے اعداد نکلتے ہیں۔ دیوان میں ۹ قصیدے، ۴ مرثیے، ایک غزل، ۱۳ قطعات، ۱۹۳ رباعیات کے علاوہ غزلوں کے ۳۳۸ شعر ہیں۔ ایک منت بند بھی ہے۔

والد نظم کی طرح نثر میں بھی قدرت رکھتے تھے۔ ان کی نثری کتاب کا نام ”گلستان نثر“ ہے۔ یہ تاریخی نام ہے اور اس سے ۱۳۱۱ کے اعداد نکلتے ہیں۔ اس میں ۱۷۳ قطعات ہیں۔ ابتدا میں ۱۳ سطحوں کا دیباچہ ہے۔ اس کے بعد نواب محبوب علی خاں نظام دکن کی تعریف میں ایک قصیدہ ہے۔ پھر والد کے انتقال کے سلسلے میں لوگوں کے تعزیت نامے درج ہیں۔ والد باکمال انشا پرداز تھے۔ کتاب ۲۶۶ صفحات پر مشتمل ہے اور مطبع عزیز دکن میں ۱۳۱۱ء میں شائع ہوئی۔

والد کا انتقال ۶۳ برس کی عمر میں ۱۳۱۱ ہجری (مطابق ۱۸۹۳ء) میں حیدرآباد میں ہوا۔ بہت سے لوگوں نے وفات کی تاریخیں کہیں۔ قاری کے مشہور شاعر اور نظام دکن کے استاد غلام قادر مرحوم قلم گرامی نے ذیل کی تاریخ کہی:

والد آں فجرِ خطہ مدراس  
اے گرامی مگر غنائی مُرد  
با ہر دانش توں محقق  
وہ دکن انوری جانی مُرد  
آب و رنگِ سخن نامہ انیسویں  
پہلی مکتبہ سحانی مُرد  
وہ سخنِ جموائے من او بود  
آدخِ آدخ کہ یارِ جانی مُرد



دُکتر و خامہ را بکب انداز  
کان شہنشاہ خوش بختی نرد  
سالِ سرکش ز روئے ماتم چوست  
شاو اہم ککتہ دانی نرد

اردو اور فارسی کے شاعر سید فرخندہ علی نقیص طاہر نے اردو میں یہ تاریخ  
لکھی۔ ۳۳۳

عازمِ جنت ہوئے جب والدِ حسنِ سخن  
شاعرِ نثر پہلے مولوی عبدالحی  
کی رقم تاریخِ طاہر نے، من اے عبدالولی  
بچہ جنت میں ہیں قیدِ مولوی عبدالحی  
۱۳۱۱ ہجری

## شرح دیوانِ غالب

یہ دیوانِ غالب کی اولین شرح ہے جیسا کہ سرورق سے معلوم ہوتا ہے اس کا  
تاریخی نام ”ذوقِ صراحت“ ہے۔ جس سے ۱۳۱۱ ہجری کے اعداد برآہ ہوتے ہیں۔ اس  
کا ایک نسخہ ذمہ نمبر ۱۹ سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ شرح آج سے ۱۱۰  
سال قبل شائع ہوئی ہے۔ سرورق پر ذیل کی عبارت درج ہے:

اردو دیوانِ غالب کی شرح، بطرزِ تازہ و پاکیزہ مفیدِ مصیحاں، جس  
کا تاریخی نام ہے ”ذوقِ صراحت“ جس کو دیستانِ سخنوری کے  
استادِ کامل حضرت مولانا مولوی محمد عبدالحی ۱۳۱۱ھ انکھس بہ والد  
نے تصنیف فرمایا ہے۔ باہتمام وزیرِ علی مہتممِ مطبعِ نای نثرِ نکھای  
واقعِ حیدرآباد دکن میں طبع ہوئی۔

اس کے بعد واہد کا دیواچہ ہے۔ واہد والد کے بیٹے تھے۔ انھوں ہی نے

شرح شائع کی۔ لکھتے ہیں:

ظاہر ہو کہ اس خاکسار کے ولیدِ مرحوم جب نظامِ کالج میں بی۔ اے کلاس کو اردو دیوانِ مرزا غالب پڑھاتے تھے تو اس کے مقامات پر، جن کو شرح طلب جانتے تھے، ایسے مشکلات پر، جن کو حل کے قابل سمجھتے تھے، شرح اور حل لکھ دیتے تھے۔ چاہتے تھے کہ نظر ثانی کے بعد... عالی جناب نواب عماد الملک بہادر عالم تعلیمات... کے جناب فیضِ کتب میں اس شرح کو پیش کریں، لیکن تقاضا مرضِ دق سے بچا ہو کر اس جہانِ قانی سے عالمِ باقی کی طرف انتقال کر گئے۔ لہذا یہ ارادہ پورا نہ ہوا۔ اگرچہ اس شرح پر نظر جانی نہیں کی گئی لیکن نظرِ اول ہی میں جو کچھ لکھا ہے، نہایت نصیحت اور قابلِ قدر ہے۔ کیوں کہ ایک فردِ کامل، سخن گو، سخن دان، سخن فہم اور مسلمِ الثبوت استاد کی تصنیف ہے۔ اختصار کے ساتھ دقت کو اس طرح بیان فرمایا ہے کہ مقصودِ قابلِ فہم نہ ہو، لیکن فوذا کہیں غرض و جانتل سے طالبِ اعلم کے ذہن نشیں ہو جائے۔ حضرت مرحوم کی یہ عادت تھی کہ شرح کو بلا ضرورت ہرگز طول نہیں دیتے اور فرماتے تھے کہ شرح مختصر و مفید ہونی چاہیے۔ اب مجھ کو جو مرحوم کے دیوان اور انشا کے چھپانے سے فرصت ملی تو اس شرح کو بھی صاف لکھ کر اور اس کا تاریخی نام ”ذوقِ صراحت“ (۱۳۱۱ھ) رکھ کر بغرضِ افادہ چھپایا۔ امید ہے کہ مقبولِ خاص و عام ہوگی۔

دیوانِ غالب کی یہ شرح واجد نے اپنے والد والدہ کی وصیت کے مطابق شائع کی۔ وہ ”خانہ“ میں لکھتے ہیں:

ایسا شرحِ دیوانِ اردو، شاعرِ نازک خیال، صاحبِ کمالِ بلند پایہ

دیوان غالب کی اولین شرح

مرزا غالب... مصنفہ فخر انشا رحمن... حضرت مولانا مولوی شیخ عبدالحی  
المتخلص بہ والدہ دکن المدد اسی المولود حیدر آباد... بہ جذبہ و جہد طبع شاعر  
ادیب صاحب الفحائل و المناقب مولوی عبدالواحد... ظلف  
الصدق حضرت شاعر مرحوم بحسب وصیت شاعر منقولہ... بخلیہ  
طبع حرمین گردید۔ ۵۵

مرزا محمد تقی تحفہ تقی نے تاریخ طبع کہی:

اے تقی طبع ہوئی حضرت والدہ کی وہ شرح

جس کے سب اہل سخن تھے بدل و جاں طالب

طبع کا سال لکھا میں نے یہ منقولہ میں

لہ الحمد ہوئی شرح کلام غالب ۶۵

کتاب میں کل ۱۹۲ صفحات ہیں آخری صفحے میں واحد کا لکھا ہوا سال طبع  
ہے۔ غزلیات کی شرح ص ۱۸۰ میں ختم ہوتی ہے۔ اشعار کی تعداد ۱۱۳۲ ہے۔ آخری شعر  
یہ ہے:

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا

ملائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

ص ۱۸۱ اور ص ۱۸۳ تک ”شرح بعض لایات قصائد“ ہے۔ اس میں ۱۶ شعر  
کی شرح ہے۔ اس طرح کل اشعار کی تعداد ۱۱۳۸ ہے۔ غامدہ الطبع کے بعد کئی  
تاریخیں ہیں۔

غالبہ والدہ کے پیش نظر شرح لکھتے وقت دیوان غالب کا دوسرا ایڈیشن مطبوعہ  
۱۸۴۷ء ہوگا۔ اس ایڈیشن میں بھی کم و بیش اتنے ہی اشعار ہیں۔

والدہ کی شرح دیوان غالب بڑی مفید اور کارآمد ہے۔ اس میں بعض اشعار  
کے صرف مشکل الفاظ کے معنی لکھے گئے ہیں۔ جو آسان اور عام فہم شعر ہیں ان کی  
شرح درج نہیں کی گئی۔ بعض اشعار کا پس منظر اور تنبیحات بھی بیان کی گئی ہیں۔ مثال

کے طور پر ذیل کا شعر قابلِ توجہ ہے:

گو داں نہیں پہ داں کے نکالے ہوئے تو ہیں

کہے سے ان جنوں کو بھی نسبت ہے دور کی

شعر کی تفسیر میں قرآنی آیت کا حوالہ دیا گیا ہے۔ جاد الحق... کانِ زموقا،

یعنی حق آگیا اور باطل مٹ گیا ہے۔ باطل مٹنے کے قابل تھا۔ مختصر اسلام نے کہے کو

جنوں سے پاک کیا تھا۔

اردو کے مشہور صحافی، شاعر اور ادیب مفتی نوبت رائے نھرنے اپنے رسالے

”خدیجہ نظر“ لکھنو میں والد کی شرح کا ترجمہ الفاظِ ذیل میں کیا تھا:

اس نام کی ایک شرح کلیاتِ اردو مرزا غالب اکبر آبادی مرحوم

حال ہی میں حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی ہے، اور اس پر ہماری

راے طلب کی گئی ہے۔ ہم غالب کے دیوان کو حل طلب نہیں

بلکہ ترجمہ طلب خیال کرتے ہیں، اور حقیقی ہیں کہ ملک میں کوئی

ایسا پیدا ہو جو غالب کے کلام کی نزاکتیں اور اس کے حکیمانہ

خیالات پر ایک مبسوط ترجمہ تیار کرے، لیکن جب تک یہ نہیں ہوتا

اس وقت تک ایسی شرحیں بھی قیمتی ہیں جو لفظی معنی سمجھا سکتی

ہیں اور غالب کے دقیق کلام کو عام فہم بنا سکتی ہیں۔ ۱۰۷

والد کے فرزند محمد عبدالواحد ٹھٹھس داہد بھی فارسی اور عربی کے جلیل القدر

اساتذہ میں تھے۔ وہ حیدرآباد دکن ہائی اسکول علاقہ سرکار نظام میں فارسی پڑھانے جاتے

تھے۔ وہ بھی باپ کی طرح غالب شناس تھے اور غالب کے دیوانِ اردو کی فارسی شرح

”دیوانِ تحقیق“ کے عنوان سے حصہ اول میں مرتب کی۔ انھوں نے داہد کے حالات

بھی دستیاب نہ ہو سکے۔ ان کے بارے میں مزید کیجئے ہیں:

داہد ٹھٹھس صاحب مولوی عبدالعلی والد مرحوم حیدرآبادی۔ شاعر

جدیست و صاحبِ علم و صاحبِ دیوانِ فارسی۔ پانچیر شناسائی دارند۔

دیوانِ غالب کی اولین شرح

دوسرے بار در مشاعرہ عبداللہ خاں حنیف ملاقات شدہ۔ بسیار صاحب  
خلق و ادب نظر آمد۔ ۸۲۵

واجد نے دیوانِ غالب کی فارسی شرح لکھ کر اپنے باپ والد سے بہت  
حاصل کی۔ بہت سے لوگ واجد کے نام سے ناواقف ہیں۔ غالباً وہ پہلے شخص ہیں  
جنہوں نے آج سے قبل ایک سو سال غالب کی مفضل شرح لکھی۔ ”دیوانِ تحقیق“  
کلامِ غالب کی فارسی شرح ہے جو صرف ردیف الف پر مشتمل ہے۔ غالب کی ایسی  
تفصیلی شرح کسی نے نہیں لکھی ہے۔ ایک ایک شعر کی تشریح کئی کئی صفحات میں کی  
ہے۔ تائید میں فارسی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ کتابِ غالبیات میں بڑی اہم اور  
معلومات افزا ہے۔ جو کام والد سے نہ ہو سکا، وہ بیٹے نے بخیر و خوبی انجام دیا۔ مش  
مشہور ہے:

اگر پدر تواند ہر تمام کند

”تحقیق و دیوان“ حصہ اول (ردیف الف) مطبع طر نظامی حیدرآباد دکن میں  
آج سے لگ بھگ سو سال پہلے ۱۳۱۹ ہجری مطابق ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی۔ ابتدا کے  
۲۳ سطحوں میں حصہ و اساتذہ کی تاریخیں درج ہیں۔ ان میں سید محمد کاظم حسین کنتوری  
تحفہ شیفہ، میر نوازش علی لد، میر یار علی اعظم قابل ذکر ہیں۔ صفحہ ۲۳ سے ۴۱ تک  
صحت نامہ درج ہے۔ اس کے بعد نئے سرے سے سطحوں کے نمبر ڈالے گئے ہیں۔ صفحہ  
۱۳۷ تک غالب کی ردیف الف کی شرح اس طرح بیان کی گئی ہے کہ کوئی گوشہ  
نقص نہیں رکھا گیا۔ پہلا اور آخری شعر یہ ہیں:

تقص فرمادی ہے کس کی شوئی تحریر کا

کافندی ہے جہنم ہر حکم تصویر کا

بخشے ہے جلوہ گل ذوقِ ناشا غالب

چشم کو چاہیے ہر رنگ میں دا ہو جانا

سید محمد کاظم حسین شیفہ کی ”شرح دیوانِ اردو کے غالب موسوم بہ دیوان

دیہی غالب کی دلیلیں شرح

تحقیق کی تاریخ طبع سنہ ۲۹ میں موجود ہے:

جب مشرح ہوا اردو دیہاں  
 اور روشن ہوا نام غالب  
 شرح یہ والدہ دہا نے لکھی  
 جس سے ظاہر ہو مرام غالب  
 عمر سال میں مقبول حروف  
 اب بھی شرح کلام غالب ۱۵۰  
 ۱۳۶ھ (۱۹۰۱ء)

## حوالے

- ۱۵۰ دیہی دلیلیں شرح کلام، جلد ۱، ۱۹۰۵ء
- ۱۵۱ - غزلیں نظم و نثر - سنہ ۱۹۰۳ء طبع شمس المصطفیٰ جلد ۱، ۱۹۰۳ء
- ۱۵۲ دیہی دلیلیں
- ۱۵۳ دیہی دلیلیں
- ۱۵۴ - غزلیں مرام - سنہ ۱۹۰۳ء
- ۱۵۵ - غزلیں مرام - سنہ ۱۹۰۵ء
- ۱۵۶ - شکر، فکر، فکر، جلد ۱، سنہ ۱۹۰۱ء
- ۱۵۷ - غزلیں نظم و نثر - سنہ ۱۹۰۳ء طبع شمس المصطفیٰ جلد ۱، ۱۹۰۳ء
- ۱۵۸ - دیہی تحقیق - سنہ ۱۹۰۳ء طبع شمس المصطفیٰ جلد ۱، ۱۹۰۳ء



# ناصر علی سرہندی و مرزا غالب کے متحد المضامین اشعار

مرزا غالب کی تاریخ ولادت (۱۲۱۲ھ) سے ۱۰۳ سال قبل ناصر علی کی وفات ہو چکی تھی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قبل میں ناصر علی کے مختصر حالات درج کیے جائیں:

میاں شاہ ناصر علی نام اور قلی تحفص۔ ولید گرامی کا نام حب علی تھا اور وہ عالی تحفص کرتے تھے۔ ناصر علی پنجاب کے ساوات میں سے تھے۔ ان کی ولادت پنجاب میں سرہند کے قصبے میں ہوئی تھی۔ تذکرہ نضر آباد میں انھیں کشمیری پنیلہ (غلام) کہا گیا ہے جو دوست نہیں۔ وہ سید تھے اور ان کی سیادت پر خود ان کا یہ شعر دال ہے:

گر از حسب چری ما قمریم قصر

ور از نسب چری ما آل مصطفیٰ ایم ۱۵۱

مولوی قدرت اللہ کوپاموی لکھتے ہیں کہ موصوف "سر آمد فصحاء روزگار و سر حلقہ بلخائے تاجدار" تھے۔ ان کی فزولیں تازگی مضامین کے اعتبار سے بحر سامری اور مثنویاں تنجب الفاظ کے لحاظ سے ہادوگری نظر آتی ہیں۔ ۲۵۱ مکتوب "کلمات اشعرا"

ناصر علی کو ”آرمے ہندوستان“ کہتے ہیں اور ان کی شان میں یہ رباعی لکھی ہے:

دہر ملکِ سخن بود جہانگیر علی  
دہر شربِ دل ولی علی ہر علی  
با ہر علی نمی رسد ہر کے  
نہ انساں کہ خطِ کس بہ خطِ میر علی

ناصر علی بڑے خوش خیل ، حالی صفت، دولتِ استغنا سے مالا مال اور بے باک مردِ قلندر تھے۔ ۱۱ ہجری میں لشکرِ حاکمیری میں شامل ہوئے۔ ملازمت کے وقت بادشاہ کے مصالحتی کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس پر بادشاہ برہم ہوا اور کہا کہ تم فقط شاعر ہو اور آداب سے بے بہرہ ہو۔ بادشاہ کے یہ کلمات سن کر ناصر علی رنجیدہ ہو کر وہاں سے لوٹے اور نواب ذوالفقار خاں نصرت جنگ کے ملازم ہوئے۔ پہلی ہی ملاقات پر غزل کا یہ مطلع پیش کیا:

اے شانِ حیدری ز جنہیں تو آشکار  
نام تو دہر نبرد کند کارِ ذوالفقار

نواب یہ سن کر بہت خوش ہوا اور انھیں خلعتِ فاخرہ، ایک ہاتھی اور تین سو روپے نقد انعام میں دیے۔ ناصر علی نے وہ ہاتھی اور دو کثیر راہ اینار میں اپنے ہاتھ سے چھاندا کیا۔ دوسرے دن وہ خلعت بھی ایک شراب فروش کی دکان پر جام کے عوض پیش ہو گئیں۔ رات گھنٹوں کے گھنٹوں کے راتے چند بھان کے داماد تھے، نوکروں سے نقل کرتے ہیں کہ ایک دن وہ اور کوئی دوسرا آدمی ناصر علی کے ساتھ رتھ میں سوار ہو کر دہلی کے بازار میں جا رہے تھے۔ راستے میں دیکھا کہ ایک سبزی فروش اپنی حسین و جمیل بیوی کے ساتھ برسرِ پیکار تھا۔ ناصر علی یہ دیکھ کر اچانک رتھ سے کودے۔ ہمیں یہ خیال ہوا کہ شاید صاحبِ بٹری کی رفع کے لیے اترے۔ وہ آہستہ آہستہ اس سبزی فروش کی خوشامد کے کہہ رہے تھے کہ ایسی تازمین اور پری پیکر کو گھوڑوں اور گدھوں کے حوالے کرنا کمال ہے۔ حیدری اور ناصر علی ہے۔ اگر تم اس سے بیزار ہو تو میرے حوالے



کردو۔ میں آدم زاد ہوں، اور میں نے کیا قصور کیا ہے۔ سبزی فروش اور راہ چلنے والے  
حسرت زدہ ہوئے اور اس طرح میاں بیوی کا بھگڑا آن واحد میں غم ہو گیا۔

آخر عمر میں ناصر علی حضرت بوعلی قلندر کی دوستی کا دم مارنے لگے۔ آخر کار  
۲۸ رمضان ۱۱۰۸ھ کو انتقال کیا، اور حضرت نظام الدین اولیا کے مقبرے کے پاس ہی  
ہمد خاں کے گھر۔ سرخوش نے تاریخ وقات کیا:

دارست علی بہ حبیب ہے پیدا  
از راحت و رنج دہر مستغنی رفت  
دام چوں تو تہش سوے معنی بود  
دل کند و ز صورت کدہ ہستی رفت  
سرخوش ز غم سال وقاتش پر سید  
گفت "آء علی ہالم معنی رفت"

۱۱۰۹ھ ہجری

مرزا عبدالقادر بدایاں کا یہ ماذہ تاریخ ہے جس سے ۱۱۰۸ھ نکلتے ہیں:

رنکب تاریخ کست ۳۵۶

ناصر علی سرہندی اور مرزا غالب کے کچھ متحد المصنفین اشعار ایک قلمی کتاب  
میں مجھے مل گئے تھے۔ غالب راجا صاحب محمود آباد کے کتب خانے میں کسی ہاؤس شخص  
نے دیوان ناصر علی میں ایک سادہ ورق پر لکھے تھے۔ کتب خانے میں دیوان کے کئی  
قلمی نسخے موجود ہیں۔ دو دیوان مصنف کی زندگی میں لکھے گئے اور ایک ۱۱۱۸ھ ہجری کا  
مکتوب ہے۔ کچھ قلمی مثنویاں بھی ہیں۔

دونوں باکمال شعرا کے متحد المصنفین اشعار دیکھ کر مجھے یاس یگانہ چنگیزی کا وہ  
مضمون یاد آتا ہے جو انھوں نے "سرتق، تواریخ، ترجمہ" کے عنوان سے "مخزن" میں شائع  
کرایا تھا۔ جس میں انھوں نے غالب کے چند اشعار معروف پر سرتق کا التزام لگایا  
تھا۔ اس سے بعض لوگ نہ صرف یاس یگانہ کے خلاف ہو گئے، بلکہ "مخزن" کے ایڈیٹر

ناصر علی سرہندی و مرزا غالب کے حوالہ مضامین اشعار

تاجر نجیب آبادی کی مخالفت بھی کرنے لگے۔ وہ ”مخزن“ (جلد ۳، نمبر ۷) بابت اکتوبر ۱۹۱۷ء میں ”ایام مخزن“ میں لکھتے ہیں:

گزشتہ نمبر میں حضرت یاس لکھنوی کا مضمون ”توارق، ترجمہ، سرقت“ کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ اس مضمون میں صاحب موصوف نے کچھ غالب پر لے دے کی تھی۔ اس پر بہت سے اہل قلم مجھ سے ناراض ہو گئے کہ کیوں تم نے یہ مضمون شائع کیا۔ میں نہ حضرت یاس کا اتنا ہنرمند ہوں کہ اگر وہ کسی کو خواہ مخواہ مورد ظلم بنائیں تو میں انھیں داد دوں، نہ غالب مرحوم کے خاندان سے مجھے کسی قسم کی کاوش کہ خدائی فوج دار بن کر ان کے بدنام کرنے کے درپے ہو جاؤں۔ انھوں نے معقولیت کے پیرائے میں غالب مرحوم پر کچھ الزام لگائے تھے۔ ”مخزن“ کسی خاص پارٹی سے حلق نہیں ہے۔ میں نے مضمون شائع کر دیا۔ اب اگر کوئی صاحب اس مضمون کی تردید میں کچھ لکھیں تو میں اسے بھی شائع کرنے کو تیار ہوں۔ بشرطے کہ حنا کے پیرائے میں تردید کی جائے۔

ذیل میں ناصر علی سرہندی اور مرزا غالب کے وہ اشعار درج کیے جاتے ہیں جو متحدہ مضامین ہیں۔ غالب کے اشعار یاس یگانہ کے بیان کی تائید کرتے ہیں جس میں غالب پر سرتے کا الزام لگایا گیا تھا۔

۱۔ تلی سرہندی اے ز حیرتِ مست از چشم غزالاں خوابا  
سینہ ما از سچ بیخوار تو فتح الباہیا  
غالب نہیں درپہ راحت جراح پیکان  
وہ زخم چکا ہے جس کو کہ دل کشا کہے  
۲۔ تلی بلکہ از ذکر تو گردیم جی از خوشن  
چوں تھیں ہر قطرۂ خونم بے از نام تو شد

- غالب  
دو بیت خانہ بیداد کاوش ہائے مڑگاں ہوں  
کھلنی نام شاہ ہے مرے ہر قطرۂ خون میں  
۳۔ غلی  
اگر ہٹائے من کو ہم نہاں گرد  
شرارہ از رگ خار چو غول رواں گرد  
غالب  
رگ سگ سے چپکا وہ لہو کہ پھر نہ تھتا  
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا  
۴۔ غلی  
صدائے خستہ کل طرف شوقی داد  
کہ از شکوۂ گل شاخ پیہ در گوش است  
غالب  
آید سیلاب طوفانی صدائے آب ہے  
نقص پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی چادر سے  
۵۔ غلی  
شب کہ از کلیت نے برق حشمت تاب داشت  
از خلجہ رجب گل سخن چمن مہتاب داشت  
غالب  
شب کہ برق سوز دل سے زہرہ ابر آب تھا  
شعلہ جوالہ ہر اک حلقہ گرداب تھا  
۶۔ غلی  
چہ شد کہ شاہ بر افروخت شمع کافوری  
چراغ خانہ درویش ماو تاباں است  
غالب  
زکوۃ حسن دے اے جلوۂ انبیا کہ مہر آسا  
چراغ خانہ درویش ہوں کار گدائی کا  
۷۔ غلی  
آب چوں در روغن افتد تالہ خیزد از چراغ  
صحت ما جنس را باشد شر آزار ہا  
غالب  
آگ سے پانی میں بجھتے دقت اٹھتی ہے صدا  
ہر کوئی درمانگی میں تالے سے دوچار ہے



# عالم کے ایک معترض (ياس يگانہ چنگیزی)

اردو کے نام ورنہ شاعر اور فنی عروض و بیانی کے صاحب کمال استاد مرزا یاس  
۱۳۰۱ ھری (مطابق ۱۸۸۴ء) میں عظیم آباد (پنڈ) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۴ء میں انھیں  
پاس کیا۔ شاعری میں سید علی چناب (متوفی ۱۹۲۸ء) سے تلمذ حاصل تھا۔ ۱۹۱۳ء میں  
لکھنؤ میں مرزا محمد شفیع شیرازی کی صاحب زادی کے ساتھ عقد نکاح ہوا۔ شیرازی  
صاحب مشہور ادبی کتاب ”سحر، شر و چکیت“ مطبوعہ ۱۹۱۳ء کے مرتب تھے۔ نواب  
میسری بیچ نے سہرا کیا۔ تاریخی شعریہ ہے:

لکھتے ہیں بھر یار سنہ صیوی بلخ

ہے جشن عقد یاس کا مد نظر کہیں

یاس ہمیشہ عقلی کی زندگی گزارتے رہے۔ زندگی کے آخری کام موت و  
زیست کی کش مکش میں کٹ گئے۔ ان کے ساتھ بڑی بدتمیزی کی گئی۔ اس الم ناک اور  
ناخوشگوار واقعے کے بارے میں اپنے بیٹے کو ۲۹ اگست ۱۹۵۳ء کے خط میں لکھتے ہیں:  
آزکار اہل محلہ نے مجھے گھر سے نکل جانے پر مجبور کیا۔ گڑبستی کا

عالم کے ایک معترض (اس کا ترجمہ)

سارا سامان اور اپنی بیش قیمت کتابیں، ”آیات و ہدائی“ کی تقریباً پچیس جلدیں، برتن ہاسن، انگ پلنگ، میز کرسیاں، سب چھوڑ آیا۔ یاروں نے سب لوٹ لیا۔ نہایت قیمتی مسودات میرے لکھے ہوئے نہ معلوم کن ہاتھوں میں پڑیں گے۔

یاس کے ساتھ جو ناروا سلوک کیا گیا تھا، اس کی رد واپس پروفیسر مسعود حسن رضوی اور ایک معجز شخص سرفاضل حسین عرف اللہ صاحب نے مجھ سے بیان کی تھی۔ میں ایسے دل دوز اور شرم ناک واقعات یہاں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ آخر کار یاس کا انتقال بڑی کس مہری، درد و کرب اور عالم تنہائی میں ۳ فروری ۱۹۵۶ء کو ہوا۔ میت چار شہدوں نے اٹھائی۔ لکھنؤ کا کوئی آدمی جنازے کے ساتھ نہیں تھا۔ وکٹوریہ کالج، مشی تعلیم حسین کی کربلا میں پرو خاک کیے گئے۔ بعد وفات ان کی بیٹی نے قبر بنوائی، مگر اللہ صاحب کے مشورے سے لوح قبر پر یہ شعر کندہ کرایا:

خود پرستی کیجیے یا حق پرستی کیجیے

آہ کس دن کے لیے باقی پرستی کیجیے

یاس کی تصانیف نایاب ہو رہی ہیں۔ ادیب مرحوم کے کتب خانے میں ذیل کی کتابیں اور کچھ مسودات میری نظر سے گزرے ہیں:

(۱) ”نظر یاس“: مطبع نورالطابع، لکھنؤ، ۱۹۵۳ء

(۲) ”چراغ سخن“: مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۵۱ء

(۳) ”آیات و ہدائی“: مطبعہ شیخ مبارک علی، لاہور، ۱۹۴۷ء

(۴) ”ترانہ“: مطبعہ لاہور، ۱۹۳۳ء

(۵) ”کچھینہ“: قوی دارالاشاعت، لاہور، سنہ عمارت

(۶) ”عالمِ سخن“: ۱۹۳۳ء

”نظر یاس“ کی ابتدا میں سید حامد علی خاں میر شکر کا ایک جملہ درج ہے۔

اس کے علاوہ مشہور شعرا لکھنؤ میر محمد علی عارف، بخاری صاحب رشید، مرزا ابوج، سید

محمد کاظم چلوید وغیرہ کی تقریظیں موجود ہیں، عارف لکھتے ہیں:

میرے شفیق دوست، صاحب فضل و کمال، شاعر نازک خیال،  
جناب مرزا داہد حسین یاس کا کلام فصاحت و بلاغت نظام نظر  
قاصر سے گزرا اور بعض حالات سے دیکھ کر میں نے پسند کیا اور  
بلا ذمہ رعایت حسین کی۔ درحقیقت اساتذہ کی تھکیل و زبان کا  
مجھ نمونہ ہے، لیکن بہ نسبت اور اساتذہ کے حضرت آتش کے  
کلام کی گرماگرمی زیادہ پائی جاتی ہے، کیوں کہ جناب یاس نے  
تخلید بھی خواجہ صاحب کی ہی اختیار کی۔ یقینی واقع ہے کہ  
ارباب کمال "مختار یاس" کو بظہر قدر ملاحظہ فرمائیں گے اور  
حسین و آفریں کی بیش بہا وسعت دے کر مصعب ممدوح کا دل  
بڑھائیں گے، اس لیے کہ ہر کمال کی ترقی قدر شناسوں کی توجہ پر  
محصص ہے۔

ان تقریظوں کا رد عمل یہ ہوا کہ لکھنؤ کے بعض شعراء حلقہ معیار نے  
("معیار" ایک اردو رسالہ تھا) یاس کے خلاف ایک ادبی محاذ قائم کیا۔ انہی دنوں  
عزیز لکھنوی نے ایک مشاعرے میں یاس کی موجودگی میں ایک جھوکی۔ یاس صبر و  
سکون سے سنتے رہے۔ کچھ دنوں بعد لکھنؤ چمک میں ان کے خلاف ایک اور جھو تقسیم کی  
گئی، اس کے چند شعراء یہ ہیں:

نظام خداوند بالا و پست  
کشم یاس را نیست ہر جا کہ هست  
ہر آں کہ خواندیم لا تقطع  
تقو بہ زب یاس ایک تقو  
دل کا فرماں چھو دوزخ بود  
و دوزخ ہے یاس مطہر بود

غالب کے ایک معرض (دس پتہ بھجری)

پاس اپریل ۱۹۳۰ء میں لکھنؤ سے عظیم آباد گئے۔ یہاں ایک مشاعرے میں سات شعر کا غریب قلمہ سنایا۔ یہ قلمہ غالب دہلوی نے اپنے روزانہ اخبار ”بہارِ لکھنؤ“ میں شائع کیا۔ اس کے بعد ”مخزن“ لاہور کے اگست ۱۹۳۰ء میں معمولی اختلاف کے ساتھ دوبارہ چھپ گیا۔ مقطع یہ ہے:

لکھنؤ کے فیض سے ہیں دو دو سہرے میرے سر

اک تو استاد یگانہ دوسرے داماد ہوں

مقطع میں یگانہ تخلص درج ہے۔ پاس کے ساتھ یگانہ تخلص کرنے کی بنیاد یہیں سے پڑتی ہے۔ اس سے پاس کے مخالفین اور بھی بھڑک اٹھے اور سرحدِ آرائی میں حمزہ آنے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پاس نے اپنے حریفوں پر قابو پانے کی غرض سے بعد میں ایک اور تخلص ”چنگیزی“ اختیار کیا۔ یعنی اب پاس، یگانہ، چنگیزی ہو گئے۔ ”نضرِ پاس“ کے سرودھ پر پاس کا یہ شعر چمکا ہے:

اثر پیدا کیا چاہو سخن میں طرزِ دل کش سے

تو امانہ ہاں بیکو انیس و میر و آتش سے

آگے چل کر کتاب میں ”ہوشِ شاعری“ میں پاس میر انیس، میر اور آتش کی خوبیاں بیان کرتے کرتے غالب پر تنقید کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

غالب کے بیان میں محض تخیل کی جذبات ہے۔ دیوانِ بحر میں

تھوڑے سے اشعار ہیں جن کی وجہ سے غالب غالب ہیں (دہرہ)

یہ مختصر سا دیوان بھی ہزاروں پیچیدگیوں اور خامیوں سے بھرا پڑا

ہے (ان چیدہ اشعار میں بھی کوئی شعر مشکل سے ملے گا جہاں

قوتِ تخیل کا تصرف (جیسا کہ میر انیس اور آتش کی مثالوں سے

دکھایا گیا ہے) خیال اور الفاظ دونوں پر یکساں ہوا ہو۔ حاشا اس

سے مطلب یہ نہیں کہ غالب استادانہ حیثیت نہیں رکھتے، لیکن

اساتذہ مذکورہ کی جذبہ کمال تک ان کی پہنچ نہیں ہے۔



عالم کے ایک مضمون (دس ہفتہ بھروسہ)

”نعمتِ یاس“ کی اشاعت سے پاکستان کو لینے کے دینے پڑے اور معاصرین ان کا قافیہ تک کرنے لگے۔ ان میں ”معیار“ کے ایڈیٹر علی حسن خان آہ، مرزا محمد ہادی عزیز، مقلی لکھنوی، مقبول حسین ظریف اور مرزا عالم قافیہ پیش پیش تھے۔

۱۹۱۵ء میں یاس نے تاریخی نام سے ”چراغِ سخن“ نئے عروج پر ایک تصنیف پیش کی جو دسمبر ۱۹۳۱ء میں ”ابوالعالی مرزا یاس“ کے نام سے شائع ہوئی۔ سرورق پر یہ شعر ہے:

مرزا یاس پہ کرتے ہیں شکر کے جھڑے

دعاے خیر تو کیا اہل لکھنؤ کرتے

دوسرے صفحے پر ”اسمعوا افہموا، یاس نام آدم، فارغ لکھنؤ“ کے بعد نو

شعر کا ایک قطعہ ”تراۓ فطحتیہ“ درج ہے۔ مطلع ہنگامہ خیر ہے:

متم کہ لکھنؤ را جاننا تازہ دادم

متم خداے سخن یاس و ناخداے خودم

یاس نے ”چراغِ سخن“ میں عالم، عزیز اور آہ کے کلام کو ہدف تنقید بنایا

ہے، عالم کے اس شعر:

میں اور صد ہزار نوا ہاے دل خروش

تو اور ایک وہ نشیدن کہ کیا کہوں

پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

سبحان اللہ! ”نشیدن کہ کیا کہوں“ کی ایک ہی کمی۔ اردو کی

پھوٹی ہوئی قسمت جہاں تک تاز کرے، بجا ہے۔ عالم پرست

ذرا گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ یہ دہلی کی زبان ہے یا کسی

دیہ زاد کی۔

عالم کے بارے میں یاس ”بدلتی کی مثالیں“ میں مزید یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

عالم کی بدلتیاں اور گھٹیل کی بے احتدایاں دکھانے کے لیے

غالب کے ایک معترض (اس پتہ پر)

ایک مستقل کتاب چاہیے، اس رسالے میں گنجائش نہیں، مگر تاج  
اور غالب کی روش تخیل کی طرف بھی اشارہ کر دینا ضروری سمجھتا  
ہوں اور وہ یہ ہے کہ تاج نے جو کچھ کہا ہے اگرچہ باقتدار متزل  
پسندیدہ نہیں ہے مگر مطلب فوذا کچھ میں آجاتا ہے اور محتجب الفاظ  
و محاورات کے اعتبار سے تاج کے تمام اشعار مستحکم ہیں۔ گویا  
دیوان تاج زبان اردو کی ایک ڈسٹری ہے، مگر غالب کے مختصر  
دیوان کا بیش تر حصہ نہ کچھ میں آتا ہے اور نہ باقتدار غزل کوئی  
وقت رکھتا ہے۔ بعید الہم خیالات اور بے اعتدالی تخیل کا اچھا  
خاص نمونہ ہے۔۔۔

یاس کا دوسرا عظیم شاہ کار "آیات وجدانی" ہے۔ غزلوں پر کا مجموعہ ۱۹۳۷ء  
میں لاہور میں شائع ہوا۔ دوسرے اور تیسرے صفحے کے درمیان یاس کی تصویر چھپی  
ہے۔ تصویر کے اوپر لکھا ہے:

"A man who knows himself."

اس کے نیچے ایک شعر اور انگریزی عبارت اس طرح ہے:  
سرایا راز ہوں میں، کیا قافوں، کون ہوں، کیا ہوں  
سمجھتا ہوں مگر دنیا کو سمجھانا نہیں آتا

"Mirza Yas Ygana

A Living Mind of the East."

کتاب کے تیسرے صفحے پر ذیل کا شعر جلی حروف میں لیا ہوا ہے:

خود پرستی کیجیے یا حق پرستی کیجیے  
آہ کس دل کے لیے باحق پرستی کیجیے

کتاب کے آخر میں لال کور میں یاس کے ہاتھ کا لکھا ہوا احتساب درج  
ہے۔ اصولاً احتساب ابتدا میں ہونا چاہیے تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ پبلشرز نے جان بوجھ

غالب کے ایک مضمون (پتہ بھرنی)

کر اسے آخری صفحے میں شامل کر کے شائع کیا اور مصنف کی رائے کے چار سو روپے بھی مار دیے۔ انتساب کے الفاظ قائل ذکر ہیں:

To

The German Nation, The Staunch

Friend of the Eastern Classics

Mirza Yas Ygana

66, Shah Gunj, Lucknow

6 - 3 - 27

سرورق پر قرآنی آیت ہے، جس کا مفہوم ہے ”جلوہ فرما حق ہوا، باطل گیا۔“

یاس کی غالب ٹھکنی: یاس اپنے معاصرین کی ”غالب پرستی“ سے بیزار تھے۔ بقول ان کے، یہ لوگ غالب کی اندھی تقلید کر کے ان کو میر سے آگے بڑھانے میں رواں دواں تھے۔ حقیقت میں یاس غالب کو ایک اچھا اور باکمال شاعر سمجھتے تھے اور ان کی شعر گوئی کے اسی حد تک قائل تھے جس حد تک وہ اسے سمجھتے تھے۔ یہ درست ہے کہ بعض معاملات میں انھیں غالب سے اختلاف تھا۔ ”چراغِ سخن“ صفحہ ۳۵ میں لکھتے ہیں:

افسوس ہے کہ آج کل ہندوستان میں غالب کے ان چہیدہ انداز (ہائے) بیاں کی تقلید کی جاتی ہے جو معنی و بیاں کی رو سے نہایت معیوب ہیں۔ ہاں، غالب کے وہ چند اشعار جن میں منطق کی شوشیاں، پسندیدہ نزاکتیں اور قریب الفہم کنائے پائے جاتے ہیں، ان کی تقلید کی جائے تو بے شک اردو کی شاعری کے لیے نہایت مفید ہے۔ مگر ایسا نہیں کیا جاتا اور یہ کام کچھ آسان بھی نہیں ہے۔ واضح ہو کہ غالب کے وہی چند اشعار پسندِ خاص و عام ہوئے جن میں مذکورہ بالا خوبیوں کے جوہر پائے جاتے ہیں۔ یا جو سادگی و نزاکت کے سیدھے راستے پر ہیں۔

عالم کے ایک معزز (اس وقت بنگوری)

اسی کتاب کے صفحہ ۴۴ میں لکھتے ہیں:

آج کل ہندوستان میں عالم پرستی کی وہ زہریلی ہوا چل رہی ہے کہ الٹی توپا افسوس ہے کہ لکھنؤ کے بعض حضرات کے دماغ میں یہ ہوا ایسی سائی ہے کہ یہ لوگ خود کو خوش مذاق بھی سمجھنے لگے ہیں، بلکہ اپنے مذاق کے سوا دوسروں کے مذاق کو ہتھل سمجھتے ہیں۔ جن جالند۔ لکھنؤ ایسے شہر کے لیے ایسی بد مذاقی نہایت ہی ننگ کا باعث ہے۔

یاس نے ایسے ہی خیالات کا اظہار اپنے مرثیہ کردہ ماہانہ رسالے ”محبت“

نمبر ۱۹۲۵ء میں بھی کیا تھا:

افسوس ہے کہ اہل وطن کی کوتاہ نظری و غلط فہمی سے میں عالم کا مخالف ہو گیا ہوں، مگر یہ ایسی ہی بے معنی بات ہے جیسے عالم کے بعض بعض اشعار آج کل ہر کس و نامکس نے عالم کی بے جا مدح سرائی کو اپنا فیشن بنالیا، مگر میں اس تحسین ناشناس کو اپنا فیشن بنانا جرم سمجھتا ہوں۔

یاس نے اپنے معاصرین کی عالم پرستی کے تناظر میں ”عالم حکیم“ کے

نام سے ایک کتاب بھی لکھی جو ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ ذیل میں چند اقتباسات درج کیے جاتے ہیں:

(الف) بغض و عداوت کی قربان گاہ پر وجہ معاش کو بیعت چڑھانا، بال بچوں پر سختیاں اپنی آنکھوں سے دیکھنا اور صبر کرنا، عمر بھر کا سرمایہ ایک اچھا خاصہ کتب خانہ بے روزگاری کے ہاتھوں ننگ آکر کوڑیوں کے مول لٹا دینا۔ اپنی ضمیر پرستی کے ہاتھوں اٹا مورد الزام۔ عالم جیسے خود غرض، بیٹ کے بندے، خلعت کے بھوکے، انگریزوں کے پرستار و فاشن خوار کا کام نہیں ہے۔ (”عالم حکیم“، ص ۱۱)

(ب) کتنی شرم ناک بات ہے کہ عالب نے چار دن بھی بادشاہ کے تک کا پاس نہ کیا۔ تخت اٹھتے ہی انگریزوں کے دھادوں تک خوار، قصیدہ گزار بن گئے۔ (صفحہ ۱۲)

(ج) عالب اور وطن پرستی؟ ارے میاں! کہاں کی وطن پرستی، وطن پرستی کا ثبوت تو لکھنؤ کے شہدوں نے دیا کہ واجد علی شاہ بہادر کے معزول ہونے کے بعد مرزا برہمچس قدر کو زبردستی تخت پر بٹھا کر انگریزوں سے لڑتے رہے اور یہاں یہ حال کہ دلی کا راج لٹ گیا۔ بہادر شاہ قید ہو کر رنگون سدھارے۔ کسی کی تکسیر تک نہ پھوٹی۔ مرزا وطن پرست کو اپنے طوے ماڑے کی پڑی تھی۔ بڑھاپے میں لاٹ صاحب کے دربار میں شرکت کی ہوں دل میں رہ گئی۔ سلطانہ مظاہر کا تک خوار اور اس کا یہ کردار، لاجل! (ص ۲۳)

(د) عالب کے کمالات فن کا سترف ہوں، مگر اسی حد تک، جتنی بھی میرا ضمیر اجازت دیتا ہے۔ میں عالب کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں، پرانی آنکھوں سے نہیں۔ (ص ۳۱)

(ه) عالب کا تو میں مذاہب ہوں، لیکن عالب پرستوں نے تمام اساتذہ ماضی و حال کا حق تلف کر کے عالب کو دے دیا ہے، مگر میں نے ہرگز عالب کا حق تلف نہیں کیا، ان کو اردو کا مایہ ناز شاعر مانتا ہوں۔ (ص ۳۴)

پاس ان "عالب پرستوں کے بارے میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

عالب کو تیر سے بڑھانے والے

چروں کو ہانس پر چڑھانے والے

انہوں کو اپنے ساتھ لے آؤں گے

دنیا کو غلام سنی پڑھانے والے

اول میں "عالب حسن" سے چہ رباعیاں درج کی جاتی ہیں۔ پہلی رباعی

میں دونوں بزرگوں کی مشترک چیزیں ملتی ہیں، یعنی دونوں اشاعری اور مولائی کے

عالم کے ایک سحرش (اس کا نام پتھر)

حقیقت مند شاعر تھے۔ چوتھے مصرع میں آپس آپ کو عالم سے افضل سمجھتے ہیں:

دونوں دہانے ہیں علی کے طالب  
جان ایک ہے گو جدا جدا ہیں طالب  
مذہب میں، شاعری میں، قومیت میں  
عالم ہیں یکاۓ اور یکاۓ عالم

☆

شہزادے پڑے فرنگیوں کے پالے  
مرزا کے گئے میں موتیوں کے مالے  
واللہ گریبان میں منہ ڈال کے دیکھ  
عالم کو دہن پرست کہنے والے

یکاۓ چنگیزی نے جب ”عالم حق“ کا لقب پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کو بھیجا تھا تو ادیب نے بعض رہامیاں پسند نہیں فرمائی تھیں۔ یکاۓ نے، جو اس زمانے میں حیدرآباد میں سب رجسٹر تھے، ادیب کے نام ایک طویل مکتوب ۲۵ دسمبر ۱۹۳۳ء کو لکھا تھا، ذیل میں اس کا ابتدائی حصہ درج کیا جاتا ہے:

آپ فرماتے ہیں کہ آخر کی چند رہامیاں (وہی جن میں عالم پر  
تسلیم کیا گیا ہے) شائع نہ کی جاتیں تو اچھا تھا۔ انہیں شائع  
کر کے گویا میں نے اپنے بھی خواہوں کا (”بھی خواہ“ بقول آپ  
کے) دل دکھایا ہے۔ خیر یوں ہی کی۔ غلط جی یا غلط فہمی کے  
سبب کوئی آپ جھکا کھا جائے تو اور بات ہے ورنہ مجھے دل  
دکھانے کی ضرورت کیا تھی۔ لہذا یہ آگاہا ہے کہ ہر کو ہر کی  
حیثیت سے جانچنے اور قدر کرنے کی صلاحیت ملک میں کتنی ہے۔  
آیا لوگ محض اپنے ہی ہم خیال و ہم مذہب کے ہر کو دیکھ سکتے  
ہیں یا غیروں کے بھی۔ میرا مذہب عالم پرستی نہیں ہے بلکہ خود

پرستی یا حق پرستی:

خود پرستی کیجیے یا حق پرستی کیجیے

آہ کس دن کے لیے نا حق پرستی کیجیے

عالب کا دشمن کون کافر ہے؟ میں تو اُن عالب پرستوں پر قہر کی بجلیاں گراتا ہوں جو بطور فیشن عالب کے نام کی رٹ لگائے رکھتے ہیں۔ سچ پہچھو تو بر خوردار یہ ہمارا مرزا عالب ٹٹ پونجیوں کے ہاتھ پڑ گیا ہے۔ اس کے اشعار کے وہ وہ معنی نکالتے ہیں جو عالب کے فرشتوں کے خیال میں بھی نہ آئے ہوں۔ اور میاں بات یہ ہے کہ امداد شاعری میں میر کے بعد آتش جیسا شاعر پیدا ہی نہیں ہوا۔ عالب تو بے چارہ زبردستی امداد کا شاعر بن گیا۔

پاکستان پیپلز کی "عالب مخالف" تحریریں عرصہ دراز تک قائم رہیں اور اس کا جوش و خروش ملک کے طول و عرض میں پھیل گیا تھا۔ ان کے عالب شکنی کے مضامین "نخن" جیسے معیاری رسائل میں دلچسپی کا باعث بنتے رہے۔ "نخن" ۱۱ ہوں، جلد ۲، نمبر ۶، اپریل ستمبر ۱۹۷۱ء میں یاس کا ایک شعر کہ آرا مضمون "تو ارد، ترجمہ، سرقت" ۱۵۱ کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس کی اشاعت پر لوگوں نے "نخن" کے ایڈیٹر جناب تاجور نجیب آبادی سے سخت احتجاج کیا، چنانچہ انھوں نے "نخن" کے اگلے شمارے جلد ۲، نمبر ۷ (مئی ۱۹۷۱ء)، اپریل اکتوبر ۱۹۷۱ء میں "بزم نخن" کے تحت اپنا رد عمل یوں ظاہر کیا:

گزشتہ نمبر میں حضرت یاس لکھنوی کا مضمون "تو ارد، ترجمہ، سرقت" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ اس مضمون میں صاحب موصوف نے کچھ عالب پر لے دے کی تھی۔ اس پر بہت سے اہل قلم مجھ سے ناراض ہو گئے کہ کیوں تم نے یہ مضمون شائع کیا۔ میں نہ صرف یاس کا نیاز مند ہوں کہ اگر وہ کسی کو خواہ مخواہ مورد طعن بنائیں تو میں انھیں داد دوں، نہ عالب مرحوم کے خاندان سے

مجھے کسی قسم کی کاوش کہ خدائی فوج دار بن کر ان کو ہدام کرنے کے واسطے ہو جاؤں۔ انھوں نے معقولیت کے پیرائے میں عالم مرحوم پر کچھ الزام لگائے تھے۔ ”تخون“ کسی خاص پارٹی سے متعلق نہیں ہے۔ میں نے مضمون شائع کر دیا۔ اب اگر کوئی صاحب اس مضمون کی تردید میں کچھ لکھیں تو میں اسے بھی شائع کرنے کو چار ہوں۔ بشرطے کہ حسانت کے پیرائے میں تردید کی جائے۔

”تخون“ بابت مئی ۱۹۱۸ء میں پاس کا ایک اور مضمون ”آتش و عالم“ شائع ہوا۔ اس میں ”سعیار“ اور ”عالم“ پر سختوں کی زبردست مخالفت کی گئی تھی۔ اس کے بعد ”تخون“ بابت جولائی ۱۹۱۸ء میں ایک طویل مضمون ”آتش و عالم“ کے عنوان سے آزدہ بیٹا پوری کے فرضی نام سے شائع ہوا۔ اس کے طرز تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ مضمون پاس کے کاوش فکر کا نتیجہ ہے۔ چند پتلے یہ ہیں:

اہل سعیار (سعیار لکھنؤ میں کھنڈے والے عالم پرست) خدائے خن میرا نہیں اور غولہ آتش پرستہ آنے لگے اور عالم کی تحلیل کا دھواں بے جا کرنے لگے تو مجھذا مرزا پاس کو عالم کی قلعی بھی کھولنا پڑی۔ مرزا پاس خود عالم کے مداح ہیں۔ مگر ان حضرات کی حسیہ کے لیے عالم کی شاعری کے صوب اور آتش کی شاعری کے محاسن دکھانے پر مجبور ہوئے۔ مرزا پاس کو جو عالم کا ہر حق خلاف سمجھتے ہیں وہ عالم کسی دماغی مرض میں مبتلا ہیں۔ شاہ دگیر صاحب مرزا پاس پر یہ جو الزام دیکھتے ہیں کہ ”عالم کو برا بھلا کہا یہ بالکل غلط ہے۔ عالم کو ہرگز برا نہیں کہا بلکہ ان کی بیستان نما شاعری سے نفرت ظاہر کر کے لوگوں کی آنکھیں کھول دی ہیں۔“



جب غالب کے خلاف یاس کی مخالفت کا سیلاب زور شور سے امنڈنے لگا تو انھوں نے سر کے کا ایک اور مضمون لکھا جو "غزن" لاہور، ہایت جون ۱۹۱۸ء میں "میرزا غالب اور میں" کے عنوان سے صفحہ ۳۹ تا ۵۲ شائع ہوا۔ مضمون مفید اور نادر ہے، اس لیے ذیل میں من و عن درج کیا جاتا ہے:

مرزا غالب مظلوم کے حلق جتنے مضامین میرے قلم سے نکلے ہیں وہ ہندوستان کے اکثر بزرگواروں کی برہمی خاطر کا باعث ٹھہرے۔ اکثر حضرات کی طرف سے یہ برہمی حق بجانب ہے۔ خصوصاً جناب نواب سعید احمد خان صاحب طالب، نواب شجاع الدین احمد خان صاحب تاپاں اور نواب سراج الدین احمد خان صاحب ساکن، جنہیں مرزا غالب مظلوم کے ساتھ سلسلہ قرابت کا شرف حاصل ہے، مگر ان بزرگواروں کی شرافت و تہذیب حم کھانے کے قابل ہے کہ باوجود اس برہمی خاطر کے مجھ سے اسی طرح ملتے ہیں جو تہذیب و شرافت کا متکفنا ہے۔ مجھے نواب سعید احمد خان صاحب طالب کی خدمت میں شرفِ نیاز حاصل نہیں ہے۔ میں اس سال ایک ضرورت سے دہلی گیا تھا، معلوم ہوا کہ حضرت طالب آن دنوں دہلی میں تشریف نہ رکھتے تھے، اس وجہ سے میں شرفِ حضوری حاصل نہ کر سکا۔ نواب شجاع الدین خان صاحب تاپاں سے پارساں علی گڑھ کالج کے مشاعرے میں فقط شہسائی سی ہوگئی تھی۔ بات چیت کی نوبت نہ آئی۔ میں نے یہ سنا تھا کہ حضرت تاپاں نہایت بد مزاج اور منہ کے کڑے ہیں۔ اس بات نے مجھے اور بھی آمادہ کیا کہ میں جناب کی خدمت میں حاضر ہوں۔ چنانچہ ایک دن در دولت پر حاضر ہوا۔ بہت دیر تک محبت ری اور پھر دوسرے دن ان حضرت تاپاں نے مجھے

اپنے دسترخوان پر بھی بلایا اور بعد طعام کئی گھنٹے تک شعر و سخن کا سلسلہ جاری رہا۔ جناب گرامی حیدر آبادی بھی تشریف رکھتے تھے، مگر میں نے حضرت تاباں میں بد مزاجی کے آثار کچھ بھی نہ پائے۔ اٹھائے گھنٹوں میں مرزا غالب کا ذکر آگیا تو بس اتنا فرمایا کہ بھی تم تو غالب کے مخالف ہو۔ میں نے عرض کی کہ حضرت میں ہرگز غالب کا مخالف نہیں ہوں جتنا لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے یا بجائے خود سمجھ لیا ہے۔ مگر ہاں، اس مخالفت ظاہری کے (جو میری طرف سے ظہور میں آئی) کچھ ایسے اسباب ناگزیر ہیں جن کی اطلاع ہر شخص کو نہیں ہے، خاص خاص لوگ واقف ہیں۔ وہ سب اسباب میں نے بیان کیے تو حضرت تاباں اس بھید کو سمجھے اور خاموش ہو رہے۔ حضرت سائل بھی اس بھید سے آگاہ ہیں اور مکزی مولانا رعب قریشی انصاری اور مکزی جناب مولوی سید محمد احمد بیخود موہانی بھی آگاہ ہیں۔ یہ دونوں حضرات مؤرخانہ کر میرے سچے دوست اور بھی خواہ ہیں اور حد درجے غالب کے فدائی ہیں۔ غالب کے حلق میری عامہ فرمائشوں سے آزرده بھی ہوئے، مگر چوں کہ یہ حضرات اس قصار کے سبب اذیتوں سے ماہر ہیں، اس وجہ سے میری مجبوریوں کا اندازہ کر کے خاموش ہو رہے۔ مولانا رعب اور حضرت بیخود موہانی کے ساتھ ان کے گہرے تعلقات پر بھی مجھے غالب منظور کے خلاف عامہ فرمائی کی جو ضرورت دائی ہوئی وہ لکھنؤ کی ایک نااہل جماعت (’معیار پارٹی‘) کی مسلسل اشتعال انگیزی تھی۔ اس جماعت کے اراکین خاص متقی، مزین و ناقب ہیں جن کے دل غرائش ہڈیاں اک گرامفون کے ذریعے سے بہت دنوں تک میرے دل کو تڑپاتے

رہے۔ یہ گراموفون 'معیار' مرحوم کا اڈیٹر ہے جس کے واسطے سے ناچلے برداشت صدائیں میرے کانوں تک پہنچتی رہی ہیں۔ جس نے خدائے سخن میرا نہیں اعلیٰ اللہ مقام اور خواجہ آتش علیہ الرحمۃ کی شان میں کلمات تازیانہ کہہ کر میرا کلیجا پکا دیا۔ میں اس درس گاہ کا تعلیم یافتہ ہوں جہاں سب میرا نمٹیں، میرا ترقی میرا اور خواجہ آتش کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ میرے دل میں ان بزرگواروں کی جو عظمت قائم ہے وہ مٹائے نہیں مٹ سکتی۔ غالب کی نسبت میرے جو خیالات ہیں، وہ ہیں۔ اس کی ضرورت نہ تھی کہ اپنے مافی الضمیر کو عالم شہود میں لا کر خواہ مخواہ بھی برہی پھیلائی جاتی، مگر بعض کو تاہ اندیشہ لکھنؤ کی سفیدانہ روش نے مجھے مجبور کیا کہ میں اس دل آزادی کا انتقام لوں۔ انتقام اگرچہ داخل انصاف ہے مگر وحشیانہ انصاف ہے۔ 'معیار پارٹی' کی اشتعال انگیزیوں نے مجھے آخر کار اس ناگوار خدمت پر آمادہ کیا۔ غالب مغفور کی نسبت جو کچھ میں نے لکھا وہ ایک ناگوار فرض تھا جو مقامی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر طوعاً و کرہاً ادا کیا گیا۔ اس 'معیار پارٹی' کی چشم نمائی کے سوا اور کسی کی دل آزادی مقصود نہ تھی۔ مگر ملک کے اکثر اہل سخن پر اس کا بُرا اثر پڑا اور پڑنا چاہیے تھا۔ چنانچہ اکثر حضرات نے میری مخالفت میں مضامین شائع کیے، مگر میں نے کسی کا جواب نہ دیا، کیوں کہ میرا زورے سخن 'معیار پارٹی' کے سوا اور کسی طرف تھا ہی نہیں۔ جو لوگ مجھے غالب کی شاعری کا بد حق منکر سمجھتے ہیں، انہیں اختیار ہے، مگر وہ حقیقت ایسا نہیں ہے، بلکہ یہ کہوں گا کہ حقیقی و مزین و ناقب و غیرم سے (جنہیں تھلید غالب کا بڑا دھواں ہے مگر سراسر فلک) میں غالب کا زیادہ مرتبہ شایع

ہوں۔ ان لوگوں نے ابھی عالم کو پہچانا ہی نہیں۔ عالم کے ساتھ میری یہ مخالفت ظاہری ان لوگوں کی تحسین ناشناس سے کہیں بہتر ہے اور میری یہ مرتبہ شناسی بمقابلہ ان لوگوں کے، جو دراصل عالم کی مرتبہ شناسی کے اہل ہیں، ناقص و ناقص ہے۔

”مخزن“ میں میں نے ایک مضمون ”سرقہ، قمار، ترجمہ“ کے عنوان سے شائع کر دیا تھا، جس میں عالم کے چند اشعار معروف پر سرقے کا الزام لگایا گیا تھا اور یہ الزام بے جا نہ تھا اور بعض اشعار پر ترجمے کا حکم لگا کر دارالانصاف دی تھی کہ جہاں ترجمہ بن چڑے وہاں شاعر مستحق تحسین ہے۔ یہ مضمون اہل نظر کے نزدیک اہل قدر اور بعض اہل تحقیق حجت ہوا۔ مگر انہوں نے، جناب شوکت نے، جو مجھ سے پہلے سے بدعین تھے، اس مضمون کا جواب تو نہ دیا محض دل شکن الفاظ سے یاد کیا۔ سنی و شیعہ کا جھگڑا اور باغ و فک کا ذکر پھیل دیا۔ میرا نہیں اور دیر کے مرثی کو تادل اور انسانوں کا متواضع ٹھہرایا اور آتش و تاج و اسیر کی نسبت یہ تحریر فرمایا کہ یہ لوگ فارسی سے بھی بالکل بے بہرہ تھے۔ حالانکہ یہ امر ایسا ہی ہے جیسے کوئی دن کو رات کہہ دے۔ جناب شوکت کی مذہبی پھیڑ چھڑ سے لکھنؤ میں ایک برہمنی سیکل گئی اور اکثر حضرات نے اسی لب و لہجے میں جواب دینا چاہا اور میرے بعض سنی اہل مذہب احباب نے بھی جواب لکھنا چاہا مگر میں نے سب کے جوش کو ضبط کیا، کیوں کہ میں جناب ممدوح کو اپنا بزرگ جانتا ہوں۔ ان کے فرزند رشید جناب عدت میرٹھی سے مجھ سے دوستانہ مراسم ہیں۔

مرزا عالم کے حلق میرے مضامین سے جو برہمنی سیکل ہے اس

کے دو اسباب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو باعتبار نفس مضمون، یعنی اعتراض صحیح ہیں یا غلط، دوسرے باعتبار لب و لہجہ۔ سو اس میں شک نہیں کہ میں نے عالم کے فقط انھیں اشعار پر اعتراضات وارد کیے ہیں جن میں فی الحقیقت غامیاں پائی جاتی ہیں، جن سے کوئی صاحب فن انکار نہیں کر سکا۔ عالم کے ان اشعار پر میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا جو اردو کے لیے سرمایہ ناز ہیں۔ ان اعتراضات واقعی پر بکڑنا اصول فن کی مخالفت کرتا ہے۔ ہاں، مجھ پر یہ الزام ضرور عائد ہوتا ہے کہ ایسے سخت لب و لہجے میں اعتراض کرنا سوء ادب تھا۔ یہ شکایت میرے سر آگھوں پر مگر کیا کروں، لکھنؤ کے چند ناظموں نے میراغس و خولہ آتش کے معاملے میں اس قدر میرا دل دکھایا کہ مجھے بھی وہی لب و لہجہ اختیار کرنا پڑا۔ یہ ناخوابت اندیش یہ کچھ تھے کہ ہمارے سوا اور کسی کے پاس الفاظ سخت کا ذخیرہ موجود ہی نہیں، آخر میں بھی صلہ میں زبان رکھتا تھا۔ میں نہایت ادب سے اتنا اور عرض کروں گا کہ عالم مغفور کی نسبت جو الفاظ سخت میرے قلم سے نکلے ہیں وہ ایسے دل دکھانے والے نہیں ہیں جیسے بارغ فوک کا ذکر یا میراغس و خولہ کے مرثیوں کو ناولوں یا انسانوں سے تشبیہ دینا، مگر اس پر بھی میں نے جناب شوکت کی قریر کا جواب لکھنا یا لکھوانا مناسب نہیں جاتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ میں نے عالم مغفور پر جو کچھ لکھا تھا، وہ محض مقامی ضرورتوں سے مجبور ہو کر لکھا، جس سے محض لکھنؤ کے چند ناظموں کی چشم فدائی مقصود تھی۔ اس بحث کو لکھنؤ اور دہلی کی تالیفات دیرینہ پر مہول کرنا غلط فہمی ہے۔ یہ بحث صحتی و مزین و

غالب کے ایک مضمون (اس پتہ پر)

غالب و غیر ہم کی چشم نمائی کے لیے پھیری مٹی تھی اور آج غم  
ہوگئی۔ (مرزا یاس ازلکھو)

دراصل مرزا یاس پر frustration اور ان کی کم زوریاں غالب آ چکی تھیں۔  
ان کتابوں نے ان کے حراج میں پھل پیدا کی تھی۔ بے شک وہ ایک خوددار اور  
قادراںکلام شاعر تھے۔ بے احتیالیوں کی وجہ سے وہ دوسروں کو اپنی برتری اور سر بلندی  
سے مطلوب کرنا چاہتے تھے۔ ”غزنو“ کے تذکرہ بالا مضمون کے آخر میں انھوں نے  
اطہان کیا تھا کہ اب وہ غالب کی مخالفت نہیں کریں گے۔ ان کا یہ دعویٰ کھوکھلا نکلا۔  
راقم حروف کی نظر سے کئی ایسے رسالے گزرے ہیں جن میں مخالفت کا سلسلہ جاری  
رہا۔ ان میں ”قوس قزح“ اور ”طور“ قابل ذکر ہیں۔ یاس میں ایک کم زوری یہ بھی تھی  
کہ وہ اپنے مضامین دوسروں کے نام سے چھپوا کر گویا اپنا لوہا منوانا چاہتے تھے۔  
موصوف نے ”جہانِ غن“ (۱۹۱۵ء) میں غالب لکھتی کا ڈول ڈالا تھا اور غالب کی  
خالفت میں حصہ و مضامین شائع کیے۔ ”جہانِ غن“ کے تقریباً بیس سال کے بعد ایک  
کتاب ”غالب جنم“ ۱۹۳۳ء میں شائع کیا۔ کتابچے کی ابتدا میں ان کی تصویر بھی ہے،  
جس پر ”میرزا یگانہ چنگیزی صاحب آیات و ہدائی“ کے نیچے لکھا ہے:

”The Arch Artist - Poet of India”

یہ کتاب مرتب کر کے یاس کو لینے کے دسپنے پڑے اور ادبی حلقوں میں ان  
کی شہرت بمرور ہوگئی۔

اس وقت میرے پاس اردو کا ایک نادر الوجود رسالہ ”طور“ امرتسر، بابت  
فروری ۱۹۲۹ء ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ ذیل کے اشتہار سے ہو سکتا ہے جو صفحہ ۱۰۸  
میں درج ہے:

”طور“ کا ”ماہ نو خبر“ نہایت آب و تاب سے ماہ مارچ میں شائع  
ہوگا۔ علامہ اقبال، شیخ عبدالقادر، مولانا سید سلیمان، پروفیسر محمود

شیرانی، مولانا ظفر علی خان، مولانا رومی، حضرت علامہ لکھنوی، صفی  
لکھنوی، صدر لکھنوی، جوش ملیح آبادی، قاضی بدایونی، امیر کھنوی،  
دہشت لکھنوی کے علاوہ اور بہت سے نام اور ادبا و شعرا کے نام  
ترین ادبی شاہ کار نہایت "طوبہ" ہوں گے۔

”طوبہ“ کے زیر نظر شمارے میں حامد حسین رسولوی کا ایک مضمون ”مرزا عالم  
مرحوم اور مرزا یگانہ“ (صفحہ ۱۰۴ تا ۱۰۸) چمکا ہے۔ مضمون معلومات افزا ہے، اس لیے  
ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

### مرزا عالم مرحوم اور مرزا یگانہ

”حب وطن“ کا شمار ان شریفانہ جذبات میں ہے جن کو ہر بھلا آدمی  
قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یہ کیا ہے کہ ترک وطن کیے ہوئے  
پشتیں گزر گئیں، آج بھی لوگ اپنے نام کے ساتھ شیرازی،  
شیرانی، شردانی، قدحاری، بخاری وغیرہ لکھتے ہیں اور اس پر فخر  
کرتے ہیں، مگر بمصادیق نقلہ جو ارزاں شود اسال سیدی شوم  
ایک صاحب، جو کل تک مرزا یاس عظیم آبادی تھے، آج مرزا یگانہ  
لکھنوی ہو گئے ہیں اور ”حب وطن“ کا کیا ذکر، وطن کی نسبت سے  
اس درجے بیزاری کہ اس شخص کو بھی دھتکتا دیا جو عظیم آبادی کی  
نسبت سے مشہور تھا۔ مانا کہ آپ نے عظیم آبادی کی سکونت ترک  
کر کے اب بلا اشتغال لکھنؤ کو عزت بخشی ہے، لیکن عظیم آباد کے  
بھی کچھ حقوق تھے اور آپ کی جگہ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو وہ بھی  
عظیم آباد کی نسبت فراموش نہیں کر سکتا تھا، لیکن جب کسی مقصد  
خاص پر نظر ہو تو اس کے حصول کے لیے ہر اچھی سی اچھی بات  
سے زکوہ دہانی کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اور مقاصد جو کچھ بھی ہوں

ایک مقصد تو بہت واضح ہے، یعنی گھنٹی بھانپ کر آپ اپنے اہل زبان ہونے کا سہرا پہنکنا چاہتے تھے اور اس طرح زبردستی اہل زبان بن گئے۔ لیکن یہ قطعاً کاری اس نواح میں تو بیل نہیں کھیتی۔ اس لیے بقول خود:

ہاں تو سدا مارے ناچارے صاحب

بنجاب پر چھا گئے۔

رسالہ ”طوطو“ ماہ جنوری ۱۹۲۹ء میں مرزا عالم کے اس شعر پر کہ:

فعل فریادی ہے کس کی شونی تحریر کا

کافذی ہے بھڑکن ہر حکیر تصویر کا

مرزا عالم کی تنقید شائع ہوئی ہے اور طوطو تحریر اس قدر بازاری اور مرزا عالم پر اس نئی طرح لے دے کی گئی ہے کہ مجبوزا الخیر صاحب ”طوطو“ کو آنکھ کے لیے زخاوات سے محتاط رہنے کی ہدایت کرنا پڑی ہے۔

میں ایک عرصے سے دیکھ رہا ہوں کہ لاہور کے رسالوں میں مرزا عالم کی بیکانی دے دے ہتائی کا پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے۔ ”نیرنگ خیال“ میں ”نظام روح“ پر ایک تنقید ’ادب آموں کے فرضی نام سے شائع ہوئی تھی۔ اس کی دو خصوصیتوں کی وجہ سے جاننے والوں نے جان لیا کہ ”سر ایں قند ز ہایت۔“ اقل تو طوطو تحریر اس قدر مامیاد اور سو فیاد تھا جسے کوئی مہذب شخص برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ جناب ناشر ایم اے ۳۵ کو مجبوزا الخیر صاحب کے ساتھ ”نیرنگ خیال“ کی چشم لٹائی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس اعجاز تحریر ہی سے لوگوں نے پہچان لیا تھا کہ ادب آموں کے پردے میں کون بزرگ ہیں۔ دوسرے اس کا رد وائی



نے اور بھی بھاڑا پھوڑ دیا کہ باوجودے کہ تنقید میں کہیں سے مرزا پکارت کے تذکرے کی ضرورت نہیں تھی۔ تاہم نہایت بلند آہنگی سے مرزا پکارت کی میدان داریوں کا راک الاپا گیا تھا کہ فلاں مشاعرے میں اتنے اتنے استادوں کے مقابلے میں مرزا پکارت نے یوں میدان سر کیا۔ فلاں مشاعرے سے یوں سرسبز واپس آئے۔ فلاں مشاعرے میں یوں لوگوں کے سر چپے ہو گئے اور دلچسپی میں مرزا پکارت کو حاصل ہوئی۔

ایک مضمون ”قوس قزح“ میں بعنوان ”حقیقی شاعری اور مرزا یاس پکارت کا حق“ کالج کے کسی طالب علم قمر پٹاوی کے نام سے شائع ہوا تھا۔ جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ حقیقی شاعر مرزا پکارت ہیں اور بس، تعلیم یافتہ طبقے میں موجود شعرا میں سر اقبال اور شعراے ماضی قریب میں مرزا غالب کو جو عام مقبولیت حاصل ہے، وہ محتاج بیان نہیں، لیکن اس تنقید میں مرزا پکارت کا موازنہ سر اقبال اور غالب سے بھی کیا گیا تھا اور فضیلت مرزا پکارت ہی کی دکھائی گئی تھی۔ اسی طرح ایک شعر نظیری کا بھی موازنہ میں لا کر نظیری سے بھی نمبر بڑھا دیا گیا۔ یہ مضمون بھی کوثر صاحب کے نام سے تھا، لیکن طرزِ تحریر سے اس میں بھی کسی پختہ کار کا ہاتھ معلوم ہوتا تھا۔ وہ بھی پٹاوی نہیں، بلکہ یوپی کے کسی شخص کا۔ یہ سب اس لیے برداشت کیا گیا کہ انکا داری کے طریقے ہیں اور کمانے کمانے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے۔ آخر روٹی تو کسی طرح کما کھائیں (اور آخر کار مضمون میں اس مقصد کی طرف بہت واضح اشارات کیے گئے تھے، یعنی ”جس طرح پہلے اہل کمال کم نائی کی حالت میں گزر گئے، مرزا یاس

غالب کے ایک معترض (اس پتہ پر)۔

یگانہ لکھنؤی جیسے یگانہ روزگار اور دیگر اہل قلم کے ساتھ، جو اس وقت موجود ہیں، ایسی عدم توفیقی نہ ہونا چاہیے اور اہل ملک کو چاہیے کہ داسے، دوسے، قدسے، سنے ہر طرح سے ان کی خدمت کریں) لیکن اب معاملہ حد سے بڑھ گیا ہے اور یہ ناقابل برداشت ہے کہ ان مشاہیر اساتذہ کی روئیں ستائی چاری ہیں جو اس دنیا سے گزر چکے ہیں۔

مرزا یگانہ نے ایک شعر کی تنقید میں پارسے چھ صفحے سیاہ کیے ہیں اور مولانا ظفر طابع لائے کی رائے کا بھی حوالہ دیا ہے۔ موصوف کی رائے اس شعر کی بابت یہ تھی کہ:

اس شعر میں مصنف کی غرض یہ تھی کہ نقشب فریادی مستی بے اعتبار ہو گا اور یہی سبب ہے کاغذی مجاہد ہونے کا۔ شعر میں مستی بے اعتبار کی گنجائش نہ ہو سکی کیوں کہ قافیہ مزام تھا اور شاعر کا مقصود تھا مطلع کہنا، تو مستی بے اعتبار کے بدلے ”شوقی تحریر“ کہہ دیا، مگر اس سے کوئی قرینہ مستی بے اعتبار کے حذف پر نہیں پیدا ہوا۔ آخر خود ان کے حصہ پر لوگوں نے کہہ دیا کہ شعر بے معنی ہے۔

مرزا یگانہ کو بھی شعر پر اگر کچھ اعتراض ہے تو زیادہ سے زیادہ وہی، جو حضرت ظفر نے فرمایا۔ اس پر بھی چھ صفحے سیاہ کرنے کا مقصد بجز اس کے کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ آپ خواہ مخواہ مرزا غالب کو برا بھلا کہتا چاہتے ہیں۔ بعض حضرات اس اصول کے پابند ہوتے ہیں کہ اپنی قابلیت اس وقت تک مسلم نہیں سمجھتے جب تک اپنے سے قابل تر لوگوں کو ناقابل نہ ثابت کر دیں۔ مرزا یگانہ کا

بھی اسی اصول پر عمل ہوتا ہے۔

اس تنقید کے علاوہ آپ نے ایک رباعی میں فرمایا ہے کہ:

غالب کو بچکا بنا کے چھوڑا میں نے

(محلورے کی بازاریت محتاج عیاں نہیں) اس اذعان کا مقصد بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ بے چارے ناواقف دھوکے میں آجائیں کہ انوفا مرزا صاحب ایسے شاعر اور بچہ استاد ہیں کہ غالب جیسے نامی گرامی شاعر کے بیٹے اویمل کے رکھ دیے۔

آزادانہ تنقید کا دودارہ ہمیشہ کھلا رہا ہے۔ ایک طفل کتب بھی بڑے سے بڑے استاد کے کلام پر تنقید کا حق رکھتا ہے۔ یہ زمانہ تو خصوصیت سے آزادی کا زمانہ ہے۔ بقول غصے کہ انا الحق کہو اور سولی نہ پاؤ، لیکن آزادی اور بدقیسری میں کوئی حد فاصل ضرور ہونی چاہیے۔ مرزا غالب انسان ہی تھے۔ جہاں انھوں نے ہزار ہا عمدہ شعر کہے ہیں۔ ممکن ہے کہ کسی شعر میں تکمیل کی رو میں دوسرے الفاظ پر کافی غور نہ کر سکے ہوں اور کوئی جھلک رہ گئی ہو، لیکن اس سے ان کے شاعرانہ کمال میں کوئی نقص نہیں آتا اور ہر ایرے غیرے کہ جس سے وہ اپنی حیات میں شاید مخاطب بھی گوارا نہ کرتے، یہ ہنس ہرگز نہ ہونا چاہیے کہ آج، جب کہ وہ اس دنیا میں موجود نہیں ہیں، ان کو برا بھلا کہے۔ ایاز قدر خود شاس۔

ایک لڑکا اپنے باپ کے کندھے پر کھڑا ہو کر یہ دھوا کر سکتا ہے کہ میں قد میں اپنے باپ سے بھی بڑا ہوں، لیکن اس بلائق کو یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ ان کچھ بلندی میں اس کے باپ کے قد کی بلندی بھی شامل ہے۔ اسی طرح ہم چاہے جیسے بلند مرتبہ شاعر

اور غار ہو جائیں۔ یہ حقیقت کسی طرح فراموش نہ کرنا چاہیے کہ ہماری ساری قابلیت متقدمین اہل فن کی سعی و کوشش کی مرہون منت ہے، جنہوں نے اپنی ساری عمریں علم و ادب کی خدمت میں صرف کر دیں اور اس کا رزار کو ہمارے لیے باغ و بہار بنا گئے۔ پھر یہ کیسی شامت ہے کہ ہم ان حضرات کے احسانات یک قلم فراموش کر دیں اور بازاری آدمیوں کی طرح برا بھلا کہنے سے بھی دریغ نہ کریں۔ اگر کسی کی فطرت ہی ہنگامہ پسند واقع ہوئی ہے تو اسے اپنے معاصرین سے بڑنا چاہیے تاکہ اینٹ کا جراب پتھر سے ملے اور کچھ لطف بھی آئے۔ جس زمانے میں مرزا یگانہ پاس عظیم آبادی تھے اور حضرات لکھنؤ سے الگ رہے تھے تو ظریف لکھنوی نے ایک شعر پر مصرع لگائے تھے جو بہت بڑے لطف ہیں۔ شعر تھا:

نہ ملا پر نہ ملا جمہور والا نسبی

پاس مرکر بھی تو خاک و در سے خانہ بنے

شعر میں ”جمہور والا نسبی“ اذعانے محض تھا، کوئی ثبوت نہیں تھا۔ اس کی کو حضرت ظریف نے پورا کیا۔ ملاحظہ ہو (بند خلاف تہذیب تھا، لہذا کاٹ دیا گیا۔ طور) اور جمہور چھاڑ کا یہی لطف ہے۔ اگر آپ کسی کو کچھ کہتے ہیں تو سننے کے لیے بھی تیار رہے۔ ان حضرات کی نسبت کچھ کہنے کا کیا مزاج جن کی ہڈیاں بھی قبر میں باقی نہ رہی ہوں گی۔

نقص شعر کی بابت بھی مجھے کچھ عرض کرنا ہے اور جناب نظم طہا طہائی کے تحریر طلی اور پایہ استادی کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے اکتاس ہے کہ مجھے اس سے اختلاف ہے کہ مرزا غالب ”مستی

بے اعتبار" کہنا چاہتے تھے لیکن قبو کا فیہ سے مجبور ہو کر "شوئی تحریر" نظم کر گئے۔ انتخاب الفاظ میں حافظ علیہ الرحمۃ کی طرح مرزا غالب کا پایہ بھی بہت بلند ہے اور مرزا غالب کے ساتھ یہ سخت ناانصافی ہوگی، اگر کہہ دیا جائے کہ وہ کہتا کچھ چاہتے تھے، مگر قافیے سے مجبور ہو کر کچھ کہ گئے، بلکہ ایک بے معنی لفظ بھرتی کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ اگر "مستی بے اعتبار" نظم بھی ہو سکتا تو غالب جیسا شعریت پسند شاعر اس موقع پر نظم کرنا کبھی نہ گوارا کرتا۔ اس لیے کہ "مستی بے اعتبار" شامل ہو کر ایک سیدھا سادہ شعر موزوں ضرور ہو جاتا، لیکن اس ایک لفظ "شوئی تحریر" سے پورے شعر میں جو شعریت اور تنویر پیدا ہو گیا ہے وہ ہرگز پیدا نہ ہو سکتا۔ افسوس ہے کہ جو لفظ پورے شعر کی جان ہے اسی کو بھرتی کا اور برائے بیت بتایا جاتا ہے۔ مرزا یگانہ ایسی شکایت کو جذبہ مہودیت کے معانی سمجھتے ہیں۔ یہ بھی انتہائی ذہدیتی ہے۔ مرزا غالب نے "شوئی تحریر" نظم کر کے ایسے اعتراضات کا سبب کر دیا ہے۔ اگر صاف صاف "مستی بے اعتبار" کی شکایت ہوتی تو شاید ایسا اعتراض ہو سکتا، لیکن مرزا نے "شوئی تحریر" سے نقاش کی معشوقیت کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ اب اگر کچھ شکوہ و شکایت ہے تو اس کی نوعیت وہ نہیں ہے جو مبد و معبود کے درمیان ہوتی ہے، بلکہ یہ عاشق و معشوق کے درمیان کے وہ راز و نیاز ہیں جن میں کسی غیر کو مداخلت کا حق نہیں۔ اپنے دعوے کو مزید تقویت دینے کے لیے مرزا یگانہ نے مرزا غالب کے ایک اور شعر کا حوالہ دیا ہے۔ یعنی:

زندگی اپنی جب اس فعل سے گزری غالب

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے  
لیکن شعر و شاعری سے ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ یہ  
شاعرانہ شوقیاں ہیں جن پر سچیدگی سے بحث کرنا بالکل غیر ضروری  
ہے۔ اس سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ جن شعرا نے بادشاہوں کی  
شان میں قصیدے نہیں لکھے ان کی قناعت اور توکل قابلِ تعریف  
ہے، لیکن تمہا مرزا غالب کیوں موردِ الزام ہیں اور ان کے قصائد  
کو کیوں بھٹی کہا جاتا ہے۔ جب کہ ان کے پیش رو بڑے بڑے  
پائے کے شعرا بھی اس سے نہ بچ سکے:

لالہ ساغر گیر و زنگس مست و برہ نام فسق  
اور پھر خصوصیت کے ساتھ ننگہ و کنودیا اور اس سے بھی گزر کر  
داعسراے کی شان میں قصیدہ گوئی کیوں موجبِ طاعت ہو، جب  
کہ دوسروں نے بھی بادشاہوں، وزیروں اور دیگر امراے دربار کی  
شان میں قصائد کہے ہیں۔ تنقید میں ایک موقع پر مرزا پکارتے  
یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ:

جس کے (مرزا غالب کے) کلام کو بعض غیر ذلتے دار  
اظہامِ صیغہ آسانی کہہ دینے میں تامل نہ کریں۔

غالب مرزا پکارتے "ذلتے دار اظہام" میں صرف اپنا شمار کرتے ہیں،  
ورنہ جہاں تک دیکھا گیا ہے ہر شخص کو، جسے شعر و شاعری سے  
کچھ بھی دلچسپی ہے، مرزا غالب کے کلام کے ساتھ ایک عام شناسائی  
ہے، اس میں خواہ پرانے تعلیم یافتہ ہوں یا نئے۔ دیوانِ غالب  
کے ایڈیشن پر ایڈیشن اور شرحوں پر شرحیں چھٹی جا رہی ہیں اور  
سب سے بڑھ کر اسے وہ عزت حاصل ہوئی جو ہندوستان میں  
کسی اردو کتاب کو نصیب نہیں ہوئی، یعنی 'مرتبہ چھائی' کے نام

سے دیوان غالب کا تصویر شائع ہوا۔ جس کی قیمت کو ایک سو دس روپے رکھی گئی۔ تاہم تین سو جلدیں جو بیچارہ ہوئیں، ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئیں، اب انہی قسم کی جلدیں سترہ روپے میں فروخت ہو رہی ہیں۔

جانچنے کو اس عام مقبولیت کی علت معلوم کرنا چاہیے۔ کیا وجہ یہ نہیں ہے کہ کلام غالب میں جان ہے۔ اس لیے جب تک دنیا میں شعر و شاعری کا چرچا باقی رہے گا، کلام غالب زندہ رہے گا اور اس کے ساتھی شعلگی رہے گی، بلکہ جیسے جیسے مذاق سدھرتا جائے گا، اس کی مانگ اور بڑھتی جائے گی۔

برخلاف انہیں ایک بے جان دیوان کا نام چاہیے 'آیات و ہدائی' رکھ دیجیے، چاہے اس سے بھی کوئی شان دار نام؛ خواہ آرٹ بھر پر بچھوادیے، خواہ سنہری جلد بندھوادیے؛ خواہ کوئی شیرازی صاحب دیباچہ لکھیں، خواہ پردیگنڈا کرنے میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیجیے؛ نہ کوئی آج پوچھتا ہے نہ کل کے لیے کوئی امید! غالب جب زندہ تھا جب بھی غالب تھا، آج بھی غالب ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ غالب رہے گا۔

قبول خاطر و لطف سخن خدا داد است

اگر کسی کو اس میں محبوب ہی دکھائی دیتے ہیں تو چشمہ آفتاب را چہ گناہ۔ (حاجہ حسین رسولوی)



## حواشی

۱۵۵ پتہ کے اس مضمون کا مسند جواب مہد احمد حسن نے دیا جو ”غزلان“ بابت جنوری ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا تھا۔

۱۵۶ مجاہد حسن شریعہ احمد حسن شوکت میرٹھی اردو کے ایک قادر الکلام شاعر، صاحب طرز تنقید اور اعلیٰ پائے کے صحافی تھے۔ بچتے مار اخبار ”مطہ بنو“ اور ”طلی بنو“ میرٹھ کے ایڈیٹر تھے۔ ان دونوں اخباروں کا ذکر انگریزوں کی کتاب ”انگریز شاعری“ مطبوعہ جون ۱۸۸۸ء میں ملتا ہے۔ شوکت میرٹھی نے ستمبر ۱۸۹۵ء میں ایک ماہ نامہ ”پہاڑ“ کے نام سے جاری کیا تھا۔ اس کی تعلیمات راقم حروف کے مضمون ”پہاڑ اور اقبال“ مطبوعہ ”اماری نہاڑ“ دہلی، ۸ مارچ ۱۹۹۲ء میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ شوکت نے میرٹھ میں ایک معاشرہ قائم کیا تھا۔ اس کا نام ”معاشرہ نوچندنی“ تھا اور یہ ہر مہینے ہوا کرتا تھا۔ شوکت نے مرزا بیگلہ، فقیر قادر جانی اور غالب کے درجہ ان اردو کی شرحیں بھی لکھی تھیں۔ شوکت ایک تعلیم یافتہ، روشن خیال مبلغ اور کلمے ذہن کے مالک تھے۔ سرینہ کے حامیوں میں جتنی جتن تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۲۴ء میں ہوا۔

۱۵۷ محمود حسن خاں: اردو کے مشہور ناقد اور صحافی تھے۔ ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے اور ۶۸ سال کی عمر میں ۱۹۵۰ء میں انتقال کر گئے۔ ابتدا میں جرنالی ۱۹۲۳ء میں مشہور رسالے ”تہریک خیال“ لاہور کے اسٹینٹ ایڈیٹر ہوئے تھے۔ اس کے ابتدائی شماروں میں فلسفہ کلام اقبال پر کئی مضمون لکھے تھے۔ ۱۹۲۳ء میں امرتھ کاٹیج سری نگر کے پہلے پرنٹل مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں خوبہ قدام الہیہ جی عالم تعلیمات اور جعفر علی خان آف گیسووی دلیہ تعلیم تھے۔





## غالب کی اردو نثر

اور

### دوسرے مضامین

مولانا حامد حسن قادری

مولانا حامد حسن قادری ہمارے ادب کا ایک بہت بڑا نام ہے۔ انھوں نے نصف صدی سے زیادہ عرصے تک اردو زبان و ادب کی جو خدمت کی ہے، وہ ہماری ادبی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ وہ بیک وقت بلند پایہ محقق، نقاد، ادبی مورخ، شاعر، تاریخ گو، مترجم اور مکتوب نگار تھے۔ ان کی ادبی یادگاروں میں ”داستان تاریخ اردو“ اپنی نوعیت کی بے مثال کتاب ہے۔ اردو نثر کی یہ تاریخ بلا اردو کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔

غالب بھی مولانا کی دلچسپی کا ایک خاص موضوع ہے۔ لیکن اس موضوع سے متعلق ان کی تحریریں مختلف کتابوں اور رسالوں میں بکھری ہوئی ہیں اور کبھی کتابی صورت میں یک جہتیں کی گئیں۔ ادارہ یادگار غالب کی درخواست پر مولانا کے فرزند ڈاکٹر خالد حسن قادری نے ان تحریروں کو مرتب فرمادیا ہے اور یہ پہلی بار کتابی صورت میں شائع ہو رہی ہیں۔

پتہ: صفحات: ۲۰۰ جلد قیمت: ایک سو پچاس روپے

ادارہ یادگار غالب

کراچی

## مقالاتِ ممتاز

ممتاز دانشور ڈاکٹر ممتاز حسن کے مقالات کا مجموعہ

مرتبہ

### شان الحق حقہ

اردو ادب، عالمی ادب، تعلیم و ثقافت اور اقبالیات کے موضوع پر

چھپالیس مقالات کا مجموعہ۔ اس میں قائد اعظم، علامہ اقبال، مولانا ظفر علی

خان، ملک الشعراء بہار اور بعض دیگر کا برکے شخصی خاکے بھی شامل ہیں۔

☆ صفحات ۴۷۲ ☆ قیمت ایک سو پچاس روپے

ادارۃ یادگار غالب

کراچی۔ ۷۴۶۰۰

## غالبیات کے چند فراموش شدہ گوشے

اردو کے پہلے حقیقی میں ڈاکٹر اکبر حیدری کا کام معیار اور مقدار دونوں کے اعتبار سے مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ گزشتہ چار دہائیوں سے جس طرح اردو زبان و ادب کے مختلف گوشوں پر دام حقیقہ دے رہے ہیں، اس کی مثالیں کم کم ملتی ہیں۔

غالب کے حوالے سے ڈاکٹر حیدری نے درجنوں مقالات لکھے ہیں جو مختلف علمی جریدوں میں بکھرے ہوئے ہیں یا تاحال غیر منظرہ ہیں۔ ان کی افادیت کے فوری نظر اور نیا دیکھنا غالب کی طرف سے ان سے درخواست کی گئی کہ وہ ان مقالات کو کتابی صورت میں یکجا کر دیں تو ان سے استناد سے کا دائرہ وسیع ہو گا۔ اس گزارش کے جواب میں انھوں نے جو مضامین ارسال فرمائے، انھیں مندرجہ ذیل دو مجموعوں کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے:

(۱) نواور غالب

(۲) غالبیات کے چند فراموش شدہ گوشے

ان دونوں مجموعوں میں حیات و آثار غالب اور معاصرین و حلقہ حقیقہ غالب کے بارے میں جو معلومات ملتی ہیں، وہ شاید ہی کسی دوسری جگہ دستیاب ہوں۔ امید ہے ان دونوں کتابوں کی اشاعت سے غالب پر مزید کام کرنے کی راہ ہموار ہوگی۔

